مسئلہ رؤیتِ ہلال

اور

12 اسلامی مہینے

فضائل، مسنون اعمال اور مروّجہ بدعات

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ
مشیر وفاقی شرعی عدالت، پاکستان

مسئلہ رؤیتِ ہلال

اور

12 اسلامی مہینے

فضائل، مسنون اعمال اور مروّجہ بدعات

٤
ربيع الثانی
٣
ربیع الاول
٥
جمادی الاولی
www.KitaboSunnat.com
٢
صفر
٦
جمادی الثانیۃ
١
محرم
٧
رجب
٨
شعبان
٩
رمضان
١٠
شوال
١١
ذوالقعدۃ
١٢
ذوالحجۃ

مسئلہ رؤیتِ ہلال

اور

12 اسلامی مہینے

فضائل، مسنون اعمال اور مروّجہ بدعات

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

مشیر وفاقی شرعی عدالت، پاکستان

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 4043432-4033962 1 00966 فیکس: 4021659

E-mail: darussalam@awalnet.net.sa - riyadh@dar-us-salam.com

Website: www.darussalamksa.com

- الریاض۔ العلیا۔ فون: 4614483 01 فیکس: 4644945
- الملز فون: 4735220 01
- سویلم فون: 2860422 01
- مندوب الریاض: موبائل: 0503459695
- قصیم (بریدہ): فون / فیکس: 3696124 06 موبائل: 0503417156
- مکہ مکرمہ: موبائل: 0502839948
- مدینہ منورہ فون: 8234446 04 فیکس: 8151121 موبائل: 0504296740
- جدہ فون: 6879254 02 فیکس: 6336270
- الخبر فون: 8692900 03 فیکس: 8691551
- خمیس مشیط فون / فیکس: 2207055 07
- ینبع البحر فون / فیکس: 3908027 04

شارجہ فون: 5632623 6 00971

امریکہ ہوسٹن: 7220419 713 001 ● نیویارک: 6255925 718 001

لندن فون: 4885 539 208 0044

آسٹریلیا فون: 4040 9758 2 0061

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

36۔ لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون: 37232400-37240024-37324034 42 0092 فیکس: 37354072

Website: www.darussalampk.com E-mail: info@darussalampk.com

- غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون: 37120054 فیکس: 37320703
- Y-260 بلاک کمرشل ایریا، فیز III ڈیفنس، لاہور فون: 35692610

اسلام آباد F-8 مرکز، اسلام آباد

فون / فیکس: 2281513

کراچی مین طارق روڈ، (D.C.HS / 110,111-Z) ڈالمن مال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی، کراچی فون: 34393936 فیکس: 34393937

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو بہت رحم کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔

فہرست

مسئلۂ رؤیتِ ہلال

1.....مُحَرَّم

2.....صفر

3......ربیع الاوّل

4......ربیع الثانی

5...... جُمَادَى الأُوْلَى

6...... جُمَادَى الثَّانِيه

7......ماہِ رجب

8.....شعبان

9.....رمضان المبارک

10.....شوال

11 ...... ذوالقعدہ

12 ...... ذوالحجہ

عرض ناشر

ہمارا محبوب ومکرم پروردگار تو قادر مطلق ہے۔ فعال لما یرید ہے۔اس نے تو زمان و مکان خود پیدا فرمائے ہیں، اس لیے زمانے کی تقسیم اس ذات پاک کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جس عظمت مآب ہستی کو نہ نیند آتی ہے نہ اُونگھ، اس کے سامنے ماضی کے اوراق بھی کھلے پڑے ہیں۔ اس پر حال کا لمحۂ موجود بھی عیاں ہے اوراس کی نگران نگاہ سے مستقبل کی کوئی خفیف ترین لرزش بھی اوجھل نہیں۔ اس کے لیے ازل سے ابد تک کا سارا زمانہ غیر منقطع طور پر ایک مسلسل حال ہے۔ یہ تو محض اُس ذاتِ عالی کا لطف وکرم ہے کہ اس نے انسان کی سہولت کے لیے زمانے کو ماضی، حال اور مستقبل کے خانوں میں بانٹ دیا۔ سال بھر کے بارہ مہینے بنادیے، ان میں سے چار مہینے ایام حرمت ٹھہرائے۔ پھر مختلف ایام اور جداگانہ اوقات کے لیے بہت آسان اور بابرکت اعمال کا پروگرام مرتب فرمادیا۔

اب مختلف مہینوں اور دنوں کے اوقات کا ایک عملی اور اطلاقی پروگرام تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنایا اور جس کی تشریح ہمارے رہبر اعظم حضرت محمد ﷺ نے کردی اور دوسرا پروگرام، اُن بدعات اور رسوم ورواج کا ہے جو لوگوں نے ازخود گھڑ لیے۔ اس کتاب کی امتیازی خوبی یہی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکام، مسنون آداب اور ان کے فضائل و برکات اچھی طرح واضح کیے گئے ہیں اور بدعات وخرافات اور جاہلانہ

رسوم و رواج کی نشاندہی کر کے ان کا نہایت مدلل بطلان کر دیا گیا ہے۔ فی الجملہ یہ کتاب قرآن وسنت کی تعلیمات کا خزینہ اور محترم حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کا قلمی آبگینہ ہے۔ فاضل مؤلف نے اپنے مقدمے ہی میں سنت کی عظمت و اہمیت اجاگر کر دی ہے اور بدعت کے ناقابل تلافی نقصانات سے آگاہ فرمادیا ہے۔ یہ کتاب مختلف مہینوں اور ایام کے مسنون اعمال وآداب سکھاتی ہے۔علم ونظر کی روشنی مہیا کرتی ہے۔ اور واضح کرتی ہے کہ اسلام کے صحیفۂ فضائل کی رو سے محرم اسلامی کیلنڈر کا پہلا مہینہ ہے اور یہ اس قدر مکرم ومحترم ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ نے اسے اللہ کا مہینہ بتایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ رمضان المبارک کے روزوں کے بعدسب سے افضل محرم کے روزے ہیں...... اب ایک طرف رسول اللہ ﷺ کی اس پاکیزہ تعلیم کو دیکھیے اور دوسری طرف آج کل کی مروجہ بدعات کی گرم بازاری ملاحظہ فرمایئے۔ اللہ کے رسول ﷺ تو محرم کو اللہ کا محترم مہینہ بتلاتے ہیں مگر ہم نے اسے صرف سانحۂ کربلا ہی سے موسوم و مخصوص کردیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ محرم میں روزے رکھو۔ مگر اس ارشادگرامی کے برعکس ہمارے ہاں محرم میں گھر گھر نیاز کی دیگیں چڑھتی ہیں۔حلیم اور حلوہ پکایا جاتا ہے۔ پوریاں، کلچے اور شیر مال بنائے جاتے ہیں اور بطور نذر نیاز بانٹے جاتے ہیں۔ جابجا، شربت اور دودھ کی سبیلیں لگتی ہیں۔تعزیے اٹھتے ہیں۔علم لہراتے ہیں۔ قمقمے روشن ہوتے ہیں۔ رات بھر مجلسیں جمتی ہیں اور دینی تعلیمات سے ناآشنا خواتین مرثیہ خوانی میں خوش الحانی کا سارا اندوختہ صرف کر دیتی ہیں۔افسوس! یہ ملت روایات میں کھو گئی اور حقیقت خرافات میں گم ہوگئی۔...... یہ اور اسی قسم کی دیگر بدعات اور رسوم ورواج، مثلاً: گیارہویں، رجب کے کونڈے اور مختلف بزرگوں کے نام کی نذر و نیاز کے سلسلے صرف قرآن وسنت کی تعلیمات سے آگہی اور ان پر عمل کی بدولت ہی بدل سکتے ہیں۔

یہ کتاب ہماری دینی اور تہذیبی زندگی کی معلم ہے۔ اس کی تعلیمات کو اپنے فکر، عزم اور عمل میں پوری طرح چمکا لیجیے۔ اس طرح آپ دنیا میں بھی کامیاب اور آخرت میں بھی سرفراز رہیں گے۔

اس کتاب کے مؤلف معروف مفسر اور قلم کار حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ ہیں۔ اس کتاب کی تحقیق و تخریج حافظ آصف اقبال، مولانا عثمان منیب اور قاری خبیب نے نہایت باریک بینی اور دیانتداری سے کی ہے۔ اسلوب تحقیق و تخریج مختصراً یہ ہے کہ جو روایات ضعیف تھیں ان پر ضعف کا حکم لگا دیا ہے اور جو روایات کتب احادیث وغیرہ میں نہیں مل سکیں ان پر ''لم أجده'' سے صراحت کر دی ہے اور جو روایات صحیح یا حسن درجے کی ہیں ان کا صرف حوالہ دے دیا ہے، نیز حافظ آصف اقبال اور مولانا عثمان منیب نے اس کتاب کا حتمی جائزہ لیا، جا بجا جہاں ضرورت محسوس کی تصحیح و ترمیم فرمائی اور حسب ضرورت حک و اضافہ کر کے اس کتاب کی افادیت اور قدر و قیمت میں بدرجہا اضافہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کی محنت کو قبول فرمائے۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت اس کتاب کو بدعات و خرافات اور رسوم و رواج کی جگہ دینی اقدار کے فروغ کا باعث بنائے۔ آمین یا رب العالمین!

خادم کتاب و سنت

عبدالمالک مجاہد

منیجنگ ڈائریکٹر: دارالسلام۔ الریاض، لاہور

دسمبر 2010

عرضِ مؤلف

قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ﴾

''بے شک اللہ کے ہاں مہینوں کی گنتی بارہ ہے اللہ کی کتاب (لوح محفوظ) میں، اس دن سے جب سے اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔ یہی دین قیم (سیدھا اور درست) ہے۔ چنانچہ تم ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم مت کرو۔''[1]

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ سال کے بارہ مہینوں کا تقرر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہ تقرر و تعین روزِ آفرینش سے ہے۔ ان میں سے چار مہینوں کو حرمت والا قرار دینا، یہ بھی من جانب اللہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان چار مہینوں میں بالخصوص قتال و جدال اور دیگر معصیتوں سے اجتناب کرنا ہے۔ حتی کہ کافروں سے لڑنے کی ضرورت ہو، تب بھی اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ اس کا آغاز کسی حرمت والے مہینے سے نہ ہو۔ ہاں اگر کافر حملہ آور ہو جائیں تو پھر دفاع میں ہتھیار اٹھانا نہ

[1] التوبة 36:9.

صرف جائز بلکہ ضروری ہے کیونکہ اگر حرمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حملہ آور کافروں سے اپنا دفاع نہیں کیا جائے گا تو کافر اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ حرمت والے چار مہینے کون سے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے نام نہیں بتلائے۔ اس کی وضاحت رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ سے فرمائی ہے:

«اَلسَّنَةُ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا، مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، ثَلَاثَةٌ مُّتَوَالِيَاتٌ: ذُوالْقَعْدَةِ، وَذُوالْحِجَّةِ، وَالْمُحَرَّمُ وَرَجَبُ مُضَرَ، اَلَّذِي بَيْنَ جُمَادٰى وَشَعْبَانَ»

''سال میں بارہ مہینے ہیں، ان میں سے چار حرمت والے ہیں، تین مسلسل (لگاتار) ہیں، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم (چوتھا) رجب مضر ہے جو شعبان اور جمادی (الاُخریٰ) کے درمیان ہے۔''[1]

اس سے واضح ہوا کہ حدیث رسول، قرآن کریم کی صحیح ترین شرح ہے بلکہ ایسی شرح وتفسیر ہے کہ اس کے بغیر قرآن کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ دیکھیے، قرآن نے یہ تو بتلا دیا کہ بارہ مہینوں میں چار مہینے حرمت والے ہیں، یہ بھی بتلا دیا کہ ان میں ظلم وتعدی ممنوع ہے۔ لیکن اب اس پر عمل کس طرح ہوگا؟ اس کی کوئی وضاحت نہیں، اس لیے کہ ان چار مہینوں کا نام ہی نہیں بتلایا گیا۔ ان چار مہینوں کے ناموں کی وضاحت حدیث رسول میں ملتی ہے۔ گویا حدیث نے قرآن کریم کے اس حکم پر عمل کرنے کی صورت واضح کی کہ فلاں فلاں مہینے حرمت والے ہیں۔

[1] صحيح البخاري، بدء الخلق، باب ماجاء في سبع أرضين، حديث: 3197، وصحيح مسلم، القسامة والمحاربين، باب تغليظ تحريم الدماء ......، حديث: 1679.

بہر حال بات ہو رہی تھی بارہ قمری مہینوں کی جو اللہ نے مقرر فرمائے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:

محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ، جمادی الاُخریٰ، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذوالقعدہ، ذوالحجہ۔

ان بارہ مہینوں میں سے بعض مہینوں کی بابت احادیث میں کچھ اعمال بتلائے گئے ہیں اور ان کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ اسی طرح بعض مہینوں میں بعض بدعات و رسومات رائج ہیں جن کی دین سے ناآشنا عوام وخواص میں بڑی اہمیت ہے اور ان پر نہایت سختی سے عمل کیا جاتا ہے، حالانکہ دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

زیرِ نظر کتاب کا موضوع یہی بارہ قمری (اسلامی) مہینے ہیں، ان کی بابت جو فضائل صحیح احادیث سے ثابت ہیں، وہ اس میں بیان کیے گئے ہیں اور جو من گھڑت فضائل موضوع اور منکر روایات کی بنیاد پر بیان کیے جاتے ہیں، ان کی وضاحت ہے۔ علاوہ ازیں جو بدعات رائج ہیں، ان کی تردید کی گئی ہے اور ان بدعات کے جواز میں اہلِ بدعت کی طرف سے جو تاویلات پیش کی جاتی اور جو دلائل تراشے جاتے ہیں، ان کے نہایت معقول، مدلل اور مُسْکِت جواب دیے گئے ہیں۔

شروع میں بدعت کی حقیقت اور اس کی خطرناکیوں کا بیان ہے، نیز بدعات کو مستحسن اور جائز قرار دینے والوں کے مغالطات وشبہات کا ازالہ ہے۔

جو شخص بھی تلاشِ حق کے جذبۂ صادقہ کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی ضرور مدد اور اس کی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائے گا۔ شرط یہی ہے کہ اس کے اندر تلاشِ حق کی جستجو، طلبِ ہدایت کی آرزو اور راہِ حق کو اختیار کرنے کی تڑپ ہو۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ .

ہمارے پیش نظر بھی اس کتاب کی تالیف و اشاعت سے اس کے سوا کوئی اور مقصد نہیں کہ اسلامی تعلیمات سے بے خبر مسلمان عوام کو اس کتاب کے ذریعے سے ایسی روشنی اور رہنمائی نصیب ہو کہ وہ شرک و بدعت کی تاریکیوں سے نکل کر قرآن و سنت کے اجالے میں آجائیں اور آبائی رسم و رواج چھوڑ کر دین حقہ کو اختیار کر لیں۔ وَاللّٰهُ هُوَ الْهَادِي إِلٰى سَوَاءِ السَّبِيلِ.

(حافظ) صلاح الدین یوسف
124/40 شاداب کالونی، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور
ذوالحجہ:1431ھ/ نومبر 2010ء
فون:042-36316931 موبائل:0321-4133675

مقدمہ
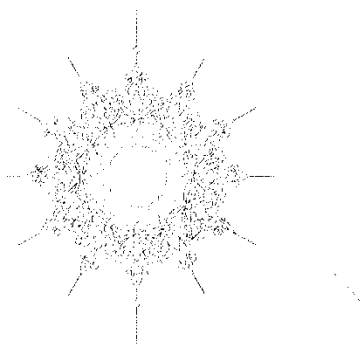
بدعت اور اس کی حقیقت

قرآن و سنت کی حقیقی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے عبادات کی طرح اسلامی مہینوں سے متعلق بھی بدعات و رسومات روز افزوں ہیں بلکہ اصل دین سے بھی زیادہ انھیں اہمیت حاصل ہوتی جارہی ہے۔ بدعات کا ارتکاب نہایت ذوق شوق اور بڑی پابندی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور دین کے جو اصل احکام و فرائض ہیں ان سے یکسر تغافل و اعراض برتا جاتا ہے۔ گویا یوں باور کروایا جاتا ہے کہ دین کی تکمیل نہیں ہوئی جبکہ اللہ رب العزت نے دین اسلام کی تکمیل رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں فرما دی تھی۔

دینِ اسلام کی کاملیت اور اس کا مطلب

دینِ اسلام جو تمام انبیاء علیہم السلام کا دین رہا ہے، اس کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾

”آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور میں نے تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا۔“[1]

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے تین باتیں بیان فرمائی ہیں:

[1] المآئدة 5:3.

- دین اسلام کی تکمیل کا اعلان۔
- اس کو اپنی نعمت قرار دے کر اس کے اتمام کی وضاحت۔
- اور اس کو اپنا پسندیدہ دین قرار دینا۔

تکمیل کے اعلان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اب اس دین میں، جس کو قرآن و حدیث میں محفوظ کر دیا گیا ہے، کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ یہ بھی واضح ہوگیا کہ اب ہدایت ونجات بھی صرف قرآن و حدیث ہی پر عمل کرنے پر منحصر ہے۔ کوئی کمی بیشی کرے گا، وہ بھی نامنظور اور جو ان سے انحراف کرے گا، وہ بھی نامقبول، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهِ»

"میں تمھارے اندر دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے، ہرگز گمراہ نہیں ہوگے، (وہ دو چیزیں ہیں) اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔"[1]

یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر چلنے والا ہی جنت میں جائے گا:

﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ﴾

"اور بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے، پس تم اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی طرف مت جانا، وہ تمھیں اس سیدھے راستے سے بھٹکا دیں گے۔"[2]

[1] الموطأ للإمام مالك: 4/281,280، حديث: 1773 مرسلًا، والمستدرك للحاكم: 93/1 موصولًا. [2] الأنعام 6:153.

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی زبان مبارک سے یہ کہلوا کر کہ میرا ہی راستہ سیدھا راستہ ہے، یہ واضح فرما دیا کہ میرے پیغمبر کا بتلایا ہوا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے اور پیغمبر اسلام کا راستہ کون سا ہے؟ قرآن کریم اور اس کی وہ قولی اور عملی تشریح ہے جو آپ ﷺ نے ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ ''اور ہم نے یہ قرآن آپ پر نازل کیا تاکہ آپ اس میں بیان کردہ ان احکام کی تبیین وتشریح کریں جو لوگوں کے لیے نازل کیے گئے ہیں۔''[1] کے حکم کے تحت بیان فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صراط مستقیم صرف قرآن وحدیث کا اتباع ہے۔ اس کی وضاحت نبی ﷺ نے ایک حدیث میں اس طرح فرمائی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«خَطَّ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ خَطًّا، ثُمَّ قَالَ: هٰذَا سَبِيلُ اللّٰهِ، ثُمَّ خَطَّ خُطُوطًا عَنْ يَّمِينِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَالَ: هٰذِهٖ سُبُلٌ، قَالَ يَزِيدُ: مُتَفَرِّقَةٌ۔ عَلٰى كُلِّ سَبِيلٍ مِّنْهَا شَيْطَانٌ يَّدْعُو إِلَيْهِ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا ......﴾»

''رسول اللہ ﷺ نے ایک خط کھینچا اور فرمایا: یہ اللہ کا راستہ ہے۔ اور کچھ خطوط اس کے دائیں جانب اور کچھ خطوط اس کی بائیں جانب کھینچے اور فرمایا: یہ مختلف راستے ہیں اور ان میں سے ہر راستے پر شیطان بیٹھا ہوا ہے، وہ ان کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے۔ اور پھر آپ نے (سورۂ انعام 153:6 کی) آیت: ''اور بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے......'' پڑھی۔''[2]

قرآن کریم میں بھی صراط مستقیم کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور

[1] النحل 44:16. [2] مسند أحمد: 435/1، والمستدرك للحاكم: 318/2.

رسول اللہ ﷺ نے بھی ایک خط کھینچ کر اسے اللہ کا راستہ بتلایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا، قرآن کریم کا یا رسول اللہ ﷺ کا راستہ ایک ہی ہے، ایک سے زیادہ نہیں، اس لیے پیروی صرف اسی ایک راستے کی کرنی ہے، کسی اور کی نہیں۔ یہی امت مسلمہ کی وحدت واجتماع کی بنیاد ہے جس سے ہٹ کر یہ امت مختلف فرقوں اور گروہوں میں تو بٹ سکتی ہے، جیسے کہ بٹی ہوئی ہے، مگر مجتمع نہیں ہوسکتی۔

علاوہ ازیں یہ راستہ جس طرح ایک ہے، اسی طرح واضح بھی ہے، اس میں ابہام ہے نہ اس کا سمجھنا مشکل ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«قَدْ تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْبَيْضَاءِ، لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا، لَا يَزِيغُ عَنْهَا بَعْدِي إِلَّا هَالِكٌ»

''میں تمھیں ایک روشن دین پر چھوڑ کر جارہا ہوں جس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔ میرے بعد اس سے انحراف وہی شخص کرے گا جس کے مقدر میں ہلاکت ہوگی۔''[1]

اس لیے جس طرح یہ ایک راستہ ہی ہدایت اور نجات کا ہے، اسی طرح اختلاف و انشقاق سے بچنے کا واحد طریقہ بھی اسی راستے کا اتباع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باہمی اختلاف کے خاتمے کے لیے ہمیں یہ اصول دیا گیا ہے:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾

''اگر کسی چیز کی بابت تمھارا آپس میں جھگڑا ہو جائے تو تم اس کو اللہ اور رسول

[1] سنن ابن ماجه، المقدمة، حديث: 43، والمستدرك للحاكم: 1/96-98، والسلسلة الصحيحة للألباني، حديث: 937.

کی طرف لوٹا دو، اگر تم (واقعی) اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔‘‘[1]

اللہ اور رسول کی طرف لوٹانے کا مطلب، قرآن اور احادیث صحیحہ کی طرف رجوع کرنا اور ان کی روشنی میں اختلاف و نزاع کا فیصلہ کرنا ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں فیصلے کرنے سے انقباض ہو تو قرآن کہتا ہے کہ ایسے دعوے دارانِ ایمان کا ایمان ہی مشکوک ہے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ، چنانچہ فرمایا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝﴾

’’آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے آپس کے اختلاف میں آپ کو حکم (ثالث) نہیں مانتے، نیز آپ کے فیصلوں پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور پوری خوش دلی سے ان کو تسلیم کر لیں۔‘‘[2]

نیز فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِينًا ۝﴾

’’کسی مومن مرد اور مومن عورت کے یہ لائق نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ آجانے کے بعد وہ اپنے معاملے میں اپنا حق اختیار استعمال کریں اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی اختیار کی، وہ یقیناً کھلی گمراہی میں جا پڑا۔‘‘[3]

اس آیت میں واضح طور پر دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں:

[1] النسآء 4:59. [2] النسآء 4:65. [3] الأحزاب 33:36.

❁ اللہ اور اس کا رسول جب کسی بات کا فیصلہ فرما دیں تو اس کے مقابلے میں اپنی رائے پر اصرار اور اپنا حق اختیار استعمال کرنے کی روش، یہ کسی مومن مرد یا عورت کا کام نہیں۔

❁ اور جو ایسا کرے گا، وہ اللہ اور اس کے رسول کا نافرمان اور کھلا گمراہ ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی اور گمراہی کا راستہ اختیار کرنے کی جو سزا ہے، ہر مسلمان اس سے آگاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ اس کی سزا دنیا میں بھی مل سکتی ہے اور آخرت میں عذاب الیم کی صورت میں تو یقینی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝﴾

”پس جو لوگ اس (اللہ کے رسول) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، انھیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں ان پر کوئی آزمائش آجائے یا دردناک عذاب انھیں آلے۔“[1]

اسلام کی کاملیت پر ایک صحابی کا فخریہ اظہار

بہر حال بات یہ ہو رہی تھی کہ اسلام ایک کامل و مکمل دین ہے۔ اتنا مکمل ہے کہ بعض مشرکینِ مکہ نے اعتراض اور طعن کے طور پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے کہا:

«عَلَّمَكُمْ نَبِيُّكُمْ كُلَّ شَيْءٍ حَتَّى الْخِرَاءَةَ»

”تمھارا نبی تمھیں ہر چیز سکھاتا ہے حتی کہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ تم قضائے حاجت کس طرح کرو۔“

[1] النور 24:63.

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

«أَجَلْ، لَقَدْ نَهَانَا أَنْ نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ لِغَائِطٍ أَوْبَوْلٍ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِالْيَمِينِ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِأَقَلَّ مِنْ ثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيعٍ أَوْ بِعَظْمٍ»

''ہاں، بلاشبہ آپ نے ہمیں منع فرمایا ہے کہ ہم پاخانہ پیشاب کرتے وقت اپنا رخ قبلے کی طرف کریں یا دائیں ہاتھ سے استنجا کریں یا تین ڈھیلوں سے کم کے ساتھ استنجا کریں یا لید یا ہڈی سے استنجا کریں۔''[1]

یعنی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اس مشرک کی بات پر شرمندگی محسوس نہیں کی بلکہ بڑے فخر سے اسلام کی کاملیت کا اظہار و اعتراف فرمایا کیونکہ یہ کاملیت بلاشبہ اسلام کا امتیاز ہے، ایسا کامل دین، مکمل دستور حیات اور جامع نظامِ زندگی اسلام کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اسی لیے امام مالک رحمہ اللہ نے بجا طور پر فرمایا تھا:

«مَنِ ابْتَدَعَ فِي الْإِسْلَامِ بِدْعَةً يَرَاهَا حَسَنَةً، فَقَدْ زَعَمَ أَنَّ مُحَمَّدًا ﷺ خَانَ الرِّسَالَةَ، لِأَنَّ اللّٰهَ يَقُولُ: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ فَمَالَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ دِينًا فَلَايَكُونُ الْيَوْمَ دِينًا»

''جس نے اسلام میں (دین سمجھ کر) کوئی بدعت ایجاد کی اور اس کو اچھا سمجھا (اس کو بدعت حسنہ باور کیا اور کرایا) تو اس نے یقیناً یہ خیال کیا کہ محمد ﷺ نے رسالت کی ادائیگی میں خیانت کی، اس لیے کہ اللہ تو فرماتا ہے: ''آج میں نے تم پر تمھارا دین مکمل کر دیا۔'' چنانچہ جو کام اس (تکمیل دین کے) وقت

[1] صحیح مسلم، الطهارة، باب الاستطابة، حدیث: 262.

دین نہیں تھا، وہ آج بھی دین (اجر وثواب والا کام) نہیں ہو سکتا۔''[1]

علاوہ ازیں بدعتی اللہ کے اس فرمان کو بھی جھٹلاتا ہے، اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے: ''میں نے دین مکمل کر دیا۔'' لیکن بدعتی اپنے طرز عمل سے کہتا ہے کہ نہیں، دین مکمل نہیں ہوا، اس میں تو فلاں فلاں رسم، فلاں فلاں عمل اور فلاں فلاں جشن بھی ہونا چاہیے تھا۔ یا پھر وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) بھول گیا کہ اس نے فلاں رسم اور فلاں عمل کی بابت کچھ بتلایا ہی نہیں، حالانکہ وہ تو بہت ضروری تھا۔ کیا یہ اللہ کی توہین نہیں، اس پر طعن نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تو اپنی بابت فرمایا ہے:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝﴾

''آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے۔''[2]

لیکن بدعتی خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھول گیا۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذَا الزَّيْغِ وَالضَّلَالِ.

- گویا بدعتی بدعت ایجاد کر کے اللہ کے رسول پر خیانت کا الزام لگاتا ہے۔
- اللہ کے فرمان کو جھٹلاتا ہے۔ یا پھر
- اللہ کو سہو ونسیان کا مرتکب گردانتا ہے۔
- اور اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی کرتا ہے، حالانکہ اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی کرنا منع ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾

''اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو۔''[3]

[1] الاعتصام، للإمام الشاطبي: 1/ 65,64، بہ تحقیق سلیم الهلالي، طبع: 1992ء۔ [2] مریم 19:64.
[3] الحجرات 49:1.

اہل ایمان کا شیوہ تو طاعت و بندگی اور سمع و اطاعت ہوتا ہے اور ایسے مومن ہی کامیاب و بامراد ہوتے ہیں۔فرمان ربانی ہے:

﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝﴾

''مومنوں کا تو شیوہ ہی یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کریں تو وہ کہتے ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس کا تقویٰ اختیار کرے تو وہی لوگ کامیاب ہیں۔''[1]

ابتدائے اسلام کی طرح آج بھی اسلام غریب (اجنبی) ہے

یہ حقیقت بڑی افسوس ناک ہے کہ آج مدعیانِ اسلام کی اکثریت اتباعِ رسول کی بجائے ابتداع (بدعت سازی) کے راستے پر گامزن ہے، آئے دن کوئی نہ کوئی بدعت ایجاد کر لی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں بدعات کا اہتمام نہایت ذوق وشوق کے ساتھ اور بڑی پابندی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور دین کے جو اصل احکام وفرائض ہیں، ان سے یکسر تغافل و اعراض برتا جاتا ہے۔حتی کہ نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ مروجہ بدعات ہی کو اصل دین سمجھ لیا گیا ہے اور جو لوگ اتباعِ رسول کے جذبے سے سرشاری کی وجہ سے ان بدعات سے اجتناب کرتے ہیں، وہ معاشرے میں نکوبن کر رہ گئے ہیں، ان کو ہدفِ ملامت بھی بنایا جاتا ہے اور ان کو (نعوذ باللہ) گستاخ اور بے دین بھی باور کرایا

[1] النور 24:51،52.

جاتا ہے۔ گویا وہی صورت حال رونما ہو گئی ہے جو اولین اسلام قبول کرنے والے مسلمانوں کی ابتدائے اسلام میں تھی، انھیں معاشرے میں اجنبی اور بیگانہ سمجھا جاتا تھا اور تحقیر آمیز نظروں سے انھیں دیکھا جاتا تھا۔ گویا غربتِ اسلام و اہل اسلام کی بابت نبی ﷺ نے جو پیش گوئی فرمائی تھی، وہ ہمارے اس دور پر بھی صادق آتی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا:

«بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ غَرِيبًا فَطُوبٰى لِلْغُرَبَاءِ»

''اسلام اپنے آغاز میں غریب (نووارد اجنبی کی طرح) تھا اور ایک وقت آئے گا کہ وہ پھر غریب (اجنبی) ہو جائے گا جس طرح آغاز میں تھا، پس ایسے غریبوں کے لیے خوش خبری ہے۔''[1]

غریب، عربی زبان میں اس نووارد مسافر کو کہا جاتا ہے جس کو کوئی نہیں جانتا، اسلام اور اہل اسلام کی بھی ابتدائے اسلام میں یہی حالت تھی، اسلامی تعلیمات بالخصوص دعوتِ توحید لوگوں کے لیے نہایت تعجب انگیز تھی۔ اُس دَور کے مشرکوں نے کہا:

﴿ أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلٰهًا وَاحِدًا ۖ إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ○﴾

''کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک ہی معبود کر دیا ہے، یہ تو یقیناً ایک بڑی عجیب چیز ہے۔''[2]

انسانوں ہی میں سے ایک شخص کا رسول بن جانا بھی ان کے لیے تعجب خیز امر تھا۔

﴿ بَلْ عَجِبُوٓا أَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ○﴾

''بلکہ انھوں نے تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا

[1] صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان أن الإسلام بدأ غريباً ......، حديث: 145. [2] صٓ 5:38.

(پیغمبر) آیا، پس کافروں نے کہا: یہ تو عجیب بات ہے۔"[1]

﴿فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا﴾

"انھوں نے کہا: کیا ایک بشر ہماری رہنمائی کرے گا؟ چنانچہ انھوں نے (ایک بشر کو رسول ماننے سے) انکار کر دیا اور منہ موڑ لیا۔"[2]

اسی طرح اخوت اسلام، قانونی مساوات، معاشی عدم استحصال، معاشرتی اصلاحات اور دیگر اسلام کی امتیازی تعلیمات ان کے لیے انوکھی اور عجیب تھیں، ان پر عمل پیرا مسلمان اس معاشرے میں انوکھے، اجنبی اجنبی سے اور حقیر سمجھے جاتے تھے۔ لیکن زبان رسالت سے ان کے لیے تحسین و آفرین اور حوصلہ افزائی کے کلمات بلند ہوئے:

فَطُوبٰى لِلْغُرَبَاءِ. "غرباء کے لیے خوشخبری ہے۔"

"غرباء" کون ہوں گے؟

ایسے دین ناآشنا اور بدعت پسند ماحول میں خالص، ٹھیٹھ اور بے آمیز اسلام پر عمل کرنے والوں کے لیے یہ کلماتِ نبوی اور فرامینِ رسول آج بھی حوصلہ افزائی کا باعث ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان "غرباء" کی بابت مزید فرمایا:

«اَلَّذِينَ يُصْلِحُونَ إِذَا فَسَدَ النَّاسُ»

"یہ غرباء جن کے لیے خوش خبری ہے وہ ہیں جو اس وقت اصلاح کریں گے جب لوگوں میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔"[3]

[1] قٓ 2:50. [2] التغابن 6:64. [3] السنن الواردة في الفتن لأبي عمرو الداني، حديث: 288، اس کی سند صحیح ہے۔ دیکھیے: السلسلة الصحيحة، حديث: 1273.

دین حق کی پیروی کی تاکید اور اہل حق کے لیے خوش خبری

یقیناً وہ لوگ خوش نصیب اور سعادت مند ہیں جو نہ معاشرے کے رسم و رواج اور روشِ عام کو دیکھتے ہیں اور نہ لوگوں کے طعن و تشنیع کی پروا کرتے ہیں بلکہ صرف اور صرف اتباعِ رسول کا اہتمام کرتے اور صحابہ و سلف صالحین کے منہاج کو اختیار کرتے ہیں، اس لیے کہ مسلمانوں کو اسی بات کی ہدایت اور تلقین کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أُوصِيكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ عَبْدًا حَبَشِيًّا، فَإِنَّهُ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِي فَسَيَرٰى اِخْتِلَافًا كَثِيرًا، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ تَمَسَّكُوا بِهَا، وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَ مُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»

''میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور (اپنے حکمران کی) بات سنو اور مانو، چاہے وہ حبشی غلام ہی ہو (بشرطیکہ اس میں اللہ کی نافرمانی نہ ہو) بلاشبہ جو میرے بعد زندہ رہے گا، وہ بہت اختلاف دیکھے گا، اس لیے تم میرے اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑنا، اس کو مضبوطی سے تھامنا اور دانتوں سے اس کو پکڑنا اور (دین میں) نئے نئے کاموں سے بچنا، اس لیے کہ (دین میں) ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''[1]

[1] سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، حديث: 4607.

اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴾

''اور جس شخص کے سامنے ہدایت واضح ہو جائے اور اس کے بعد وہ رسول کی مخالفت کرے اور مسلمانوں (صحابۂ کرام) کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے کی پیروی کرے تو ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ جانا چاہے اور ہم اسے جہنم میں ڈالیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔''[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ﴾

''پھر اگر وہ اس چیز پر ایمان لے آئیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو بے شک وہ ہدایت پا جائیں گے اور اگر وہ منہ موڑیں تو پھر وہی مخالفت (عناد) میں ہیں۔''[2]

ایک دوسرے مقام پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلنے والوں کے لیے اللہ نے یہ عظیم فضیلت بیان فرمائی کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے، فرمایا:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾

''اور (قبول اسلام میں) سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار اور وہ لوگ جنھوں نے اچھے طریقے سے ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن

[1] النسآء 115:4. [2] البقرة 137:2.

کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔'' [1]

اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی صحابۂ کرام کی بابت فرمایا:

«مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ، فَإِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ أُولٰئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ ﷺ، كَانُوا أَفْضَلَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، أَبَرَّهَا قُلُوبًا، وَأَعْمَقَهَا عِلْمًا، وَأَقَلَّهَا تَكَلُّفًا، اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَلِإِقَامَةِ دِينِهٖ، فاعْرِفُوا لَهُمْ فَضْلَهُمْ، وَاتَّبِعُوهُمْ عَلٰى أَثَرِهِمْ، وَتَمَسَّكُوا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ أَخْلَاقِهِمْ وَسِيَرِهِمْ فَإِنَّهُمْ كَانُوا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيمِ»

''جس نے کسی کا طریقہ اپنانا ہو تو وہ ان کا طریقہ اپنائے جو دنیا سے جا چکے، اس لیے کہ زندہ (کا طریقہ اپنانے) سے فتنے میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہے۔ یہ فوت شدگان کون ہیں؟ یہ اصحاب محمد ﷺ ہیں، یہ اس امت کے افضل ترین لوگ تھے، دلوں کے پاکیزہ ترین، علم میں سب سے گہرے، تکلف سے دور، ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی صحبت (ہم نشینی) کے لیے اور اپنے دین کی اقامت کے لیے چن لیا تھا۔ پس تم ان کی فضیلت کو پہچانو! اور ان کے نقشِ قدم کی پیروی کرو اور جہاں تک ہو سکے ان کے اخلاق اور ان کی سیرتوں کو اپناؤ، یقیناً وہ راہ راست پر تھے۔'' [2]

[1] التوبة 9:100. [2] جامع الأصول لابن أثير: 1/214، نیز دیکھیے: جامع بیان العلم و فضله لابن عبدالبر: 2/947، اثر: 1810.

افتراق و انتشارِ امت کے دور میں اہل حق کون ہوں گے؟

مذکورہ تفصیل سے واضح ہے کہ افتراق و انتشارِ امت کے دور میں صحابۂ کرام کا منہج وطرزِ عمل ہی نجات اور ہدایت کا واحد راستہ ہے، اس لیے کہ یہی وہ پاک باز گروہ ہے جو براہِ راست پیغمبرِ اسلام کی صحبت سے فیض یاب اور ضوءِ رسالت سے مستنیر ہوا اور پھر منہج نبوی سے یک سرِ مو اِدھر اُدھر نہیں ہوا۔ اسی لیے نبی ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا:

«لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِي مَا أَتٰى عَلٰى بَنِي إِسْرَائِيلَ حَذْوَالنَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَّنْ أَتٰى أُمَّهُ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِي أُمَّتِي مَنْ يَّصْنَعُ ذٰلِكَ، وَإِنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلٰى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِينَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً، قَالَ: وَمَنْ هِيَ يَارَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي»

''میری امت بنی اسرائیل کے اس طرح قدم بہ قدم چلے گی جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے حتی کہ اگر بنو اسرائیل میں کوئی شخص ایسا بھی ہوا کہ اس نے علانیہ طور پر اپنی ماں کے ساتھ منہ کالا کیا ہو گا تو میری امت میں بھی ایسا (بدبخت) شخص ضرور ہو گا جو یہ کام کرے گا، نیز بنو اسرائیل 72 فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت 73 فرقوں میں منقسم ہو جائے گی، سب کے سب جہنمی ہوں گے سوائے ایک گروہ کے۔'' صحابی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول وہ ایک جنتی گروہ کون ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو میرے اور میرے صحابہ کے راستے پر چلنے والا ہو گا۔''[1]

[1] جامع الترمذي، الإيمان، باب ماجاء في افتراق هذه الأمة، حديث:2641.

یہ روایت ایک دوسری سند سے بھی مروی ہے، اس میں حسب ذیل الفاظ ہیں:

«اِثْنَتَانِ وَسَبْعُونَ فِي النَّارِ وَوَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَهِيَ الْجَمَاعَةُ»

''میری امت کے 73 فرقوں میں سے 72 فرقے جہنم میں اور ایک جنت میں جائے گا۔ اور وہ جماعت ہے۔'' [1]

اور دوسری تصریحات کی روشنی میں ''الجماعۃ'' سے مراد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے طریقے پر چلنے والے لوگ ہیں۔

اسی لیے صحابۂ کرام کے منہاج پر چلنے والے گروہ کو اہل سنت والجماعت کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنے والے اور صحابۂ کرام کے پیروکار، یعنی خالص بے آمیز اسلام پر چلنے والے لوگ۔

اس اعتبار سے جنتی لوگ صرف وہ ہوں گے جو اہل سنت والجماعت کے صحیح مصداق ہوں گے۔ محض اہلِ سنت نام رکھ لینے سے کوئی اس حدیث کا مصداق نہیں بن سکتا، جیسے ایک باطل ٹولہ اپنے کو ''مومن'' کہلواتا ہے اور دوسرے مسلمانوں کو وہ مومن نہ کہتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ تو جس طرح یہ نام کے ''مومن'' حقیقی معنوں میں مومن نہیں ہیں، اسی طرح اہل سنت کا لیبل لگا لینے سے بھی کوئی اہل سنت نہیں بن جائے گا بلکہ عند اللہ اہل سنت بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح سنتوں پر چلنے والا ہو، نہ بدعت ایجاد کرنے والا ہو اور نہ بدعتوں پر چلنے والا ہو اور نہ بدعتوں کے اثبات کے لیے قرآن و حدیث میں معنوی تحریف کرنے یا ان میں من مانی تاویل کرنے والا ہو۔ کیونکہ قرآن و حدیث پر عمل کرنے کے لیے من مانی تاویلات کی ضرورت ہے نہ ان کو ان کے ظاہری اور واضح مفہوم سے ہٹا کر ان میں معنوی تحریف و

[1] سنن أبي داود، السنة، باب شرح السنة، حديث: 4597.

تلبیس ہی کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ باطل حرکتیں وہی لوگ کرتے ہیں جو صحابۂ کرام کے منہج اور ان کے طرز فکر وعمل سے منحرف اور گریزاں ہیں۔

افتراقِ امت کی پیش گوئی والی حدیث معنیٰ ومفہوم کے اعتبار سے بھی صحیح ہے

یہ حدیث، جس میں افتراقِ امت کی اور امت کی اکثریت کے راہ راست اور صراطِ مستقیم سے ہٹ جانے کی اور صرف ایک گروہ کے جنتی ہونے کی پیش گوئی ہے، سند کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے جس کی تفصیل السلسلة الصحيحة للألباني: 356/1 و367 میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، تاہم بعض لوگوں نے معنیٰ ومفہوم کے اعتبار سے اس کو رد کرنے کی مذموم سعی کی ہے کہ اس طرح تو امت محمدیہ کی اکثریت جہنم میں جانے کی مستحق قرار پا جائے گی اور یہ بات ان کے نزدیک نہایت مستبعد (ناممکن) ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ واقعات کے اعتبار سے اس مفہوم میں کوئی استبعاد و اشکال نہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل چھ نکات قابل غور ہیں:

1 بدعت گمراہی اور جہنم میں جانے کا سبب ہے

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ صحابہ وتابعین کے ادوار، جن کو رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک نے خیر القرون (سب سے بہتر ادوار) قرار دیا ہے، کے بعد دین میں مختلف بدعات کا آغاز ہوگیا تھا اور جب سے اب تک بدعات کی گرم بازاری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر دور اور ہر علاقے میں بدعات الگ الگ رہی ہیں اور ہیں، البتہ بعض بدعات پورے عالم اسلام میں مشترک ہیں۔ اور مسلمانوں کی اکثریت نے ان خانہ ساز بدعات کو اپنایا ہوا ہے بلکہ ان بدعتی مسلمانوں کی اکثریت اسلام کے احکام و فرائض اور سنن ومستحبات سے تو یکسر غافل ہے لیکن بدعات کا اہتمام یہ لوگ بڑے

اہتمام، نہایت شوق اور پابندی سے کرتے ہیں، حالانکہ نبی ﷺ کا فرمان گرامی ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ فِيهِ فَهُوَرَدٌّ»

"جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز نکالی جو اس میں نہیں ہے، وہ مردود ہے۔" [1]

اپنے خطبے میں آپ ارشاد فرمایا کرتے تھے:

«فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ، وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»

"بے شک بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین راستہ محمد (ﷺ) کا راستہ ہے اور بدترین کام (دین میں) نو ایجاد ہیں اور ہر نو ایجاد کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔" [2]

اور سنن نسائی میں صحیح سند سے یہ اضافہ ہے:

«وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ»

"اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔" [3]

2 سنت سے انحراف جنت سے محرومی کا سبب ہے

بدعت کی ایجاد اور اس پر عمل سنت رسول سے انحراف ہے۔ اطاعتِ رسول کا اہتمام کرنے والا بدعت ایجاد نہیں کرتا کیونکہ اس کے نزدیک دین وہی ہے جو اللہ کے

[1] صحيح البخاري،الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جورٍ......، حديث:2697، وصحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ......، حديث: 1718. [2] صحيح مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، حديث: 867، وسنن النسائي، صلاة العيدين، باب كيف الخطبة، حديث: 1579. [3] سنن النسائي، صلاة العيدين، باب كيف الخطبة، حديث : 1579.

رسول نے بتلایا یا عمل کر کے دکھلایا۔ اور ایسا شخص رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور آپ کے اسوۂ حسنہ ہی کو نجات کے لیے بجا طور پر کافی سمجھتا ہے۔ اور سنت، یعنی آپ کے اسوۂ حسنہ سے انکار ہی بدعت سازی کی بنیاد ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبٰى»، قَالُوا: يَارَسُولَ اللّٰهِ! وَمَنْ يَّأْبٰى؟ قَالَ: «مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبٰى»

''میری امت ساری کی ساری جنت میں جائے گی سوائے اس شخص کے جس نے انکار کیا۔'' صحابہ نے پوچھا: اللہ کے رسول! انکار کون کرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی، وہ جنت میں جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے یقیناً (جنت میں جانے سے) انکار کر دیا۔''[1]

اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں جانے کے لیے اطاعتِ رسول ضروری ہے اور اطاعتِ رسول سے گریز جنت سے محرومی کا سبب ہے۔ اس حوالے سے بھی امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی اکثریت کا حال دیکھ لیا جائے تو حدیثِ افتراق امت میں کی گئی پیش گوئی کی صداقت واضح ہو جاتی ہے۔

اطاعتِ رسول سے گریز کی دو صورتیں ہیں اور دونوں ہی عام ہیں:

❁ پہلی صورت ہے کہ اخلاق و کردار، سیاست و معاشرت، معاملاتِ بیع و شراء، شکل و صورت اور معاشرتی تقریبات میں اطاعت رسول اور اسلامی تعلیمات کا اہتمام نہ کیا جائے، ان کی پابندی سے گریز کیا جائے اور اپنی من مانی کی جائے۔ یہ صورت کتنی عام ہے؟ اس کا اندازہ ہر شخص آسانی سے لگا سکتا ہے، جیسے ایک شاعر نے کہا ہے:

[1] صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، حديث:7280.

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کر شرمائیں یہود

❁ دوسری صورت ہے کہ جو لوگ مذہب سے وابستہ ہیں، یعنی نماز، روزے کا وہ اہتمام کرتے ہیں، اول تو ان کی نمازیں دیکھ لیں کہ کیا وہ سنت کے مطابق ہیں یا نماز کے ساتھ وہ مذاق کرتے ہیں؟ دوسرے، اخلاق و کردار اور امانت و دیانت کے اعتبار سے ان کی اکثریت بھی، سوائے معدودے چند افراد کے، پہلی صورت کے افراد سے مختلف نہیں ہے۔ تیسرے، ان کے ہاں مذہب سے وابستگی کا مطلب احکام و فرائضِ اسلام کی بجا آوری نہیں ہے، بلکہ بدعات اور رسوم و رواج کی پابندی ہے اور ان کے ہاں اسی کا اہتمام زیادہ ہے۔ چوتھے، موضوع یا ضعیف روایات کی بنیاد پر یہ مذہبی طبقہ کئی جشن مذہب کے نام پر مناتا ہے جن میں من گھڑت فضائل بیان کیے جاتے ہیں اور مختلف خانہ ساز اعمال بجا لائے جاتے ہیں، جیسے جشن میلاد، جشن شبِ معراج، فضائل شبِ براءت، فضائل رجب وغیرہ ہیں، جن کی کوئی فضیلت صحیح احادیث سے ثابت نہیں ہے لیکن ان کے فضائل میں بڑے دھڑلے سے اور نہایت بے خوفی سے من گھڑت احادیث بیان کی جاتی ہیں، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»

''جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔''[1]

❁ مسنون اعمال میں بھی اپنی طرف سے اضافہ نامقبول ہے: علاوہ ازیں اپنے خود ساختہ طریقے سے اپنے زعم کے مطابق زیادہ عبادات کے اہتمام کو بھی نبی ﷺ

[1] صحیح البخاري، أحادیث الأنبیاء، باب ما ذکر عن بني إسرائیل، حدیث:3461.

نے اپنی سنت سے انحراف قرار دیا ہے، جیسے حدیث میں تین افراد کا واقعہ صحیح سند کے ساتھ موجود ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے طور پر یہ خیال کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ نے بہت بلند مرتبہ عطا فرمایا ہے اور آپ کے اگلے پچھلے گناہوں کو بھی معاف فرما دیا ہے، اس لیے ہمیں تو آپ سے زیادہ اللہ کی عبادت کرنے کی ضرورت ہے، چنانچہ ان میں سے ایک نے عہد کیا کہ میں تو ساری عمر ساری رات نماز پڑھتے ہوئے گزارا کروں گا۔ دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ دن کو روزہ رکھا کروں گا اور کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے بالکل کنارہ کش رہوں گا اور کبھی بھی نکاح نہیں کروں گا۔ جب نبی ﷺ کے علم میں ان کی باتیں آئیں تو آپ نے انھیں بلا کر پوچھا: تم نے اس اس طرح باتیں کی ہیں؟ پھر فرمایا:

«أَمَا وَاللّٰهِ! إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لٰكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي»

”خبردار! اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ متقی ہوں، اس کے باوجود (میں مسلسل روزے نہیں رکھتا بلکہ کبھی) روزہ رکھ لیتا ہوں اور (کبھی) چھوڑ دیتا ہوں اور (اسی طرح میں ساری رات نماز پڑھتے ہوئے نہیں گزارتا بلکہ) میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہوئی ہیں (پس یہ سارے ہی کام میری سنت ہیں) جس نے میری (کسی ایک) سنت سے اعراض کیا، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔“[1]

[1] صحيح البخاري، النكاح، باب الترغيب في النكاح، حديث:5063.

❁ **اخلاص نیت کے ساتھ اتباع سنت کا لزوم:** یہ حدیث سنت اور غیر سنت کی پہچان کے لیے بڑی اہم ہے۔ نماز پڑھنا، روزے رکھنا، عورتوں وغیرہ علائق دنیا سے تعلق نہ رکھنا، یہ سارے امور پسندیدہ ہیں، ناپسندیدہ نہیں۔ لیکن اگر ان امور خیر میں بھی سنت کو سامنے نہیں رکھا جائے گا بلکہ اپنی پسند اور مرضی کو دخل دیا جائے گا تو اخلاصِ نیت کے باوجود طریقۂ نبوی سے انحراف کی وجہ سے یہ پسندیدہ امور بھی ناپسندیدہ اور سنتِ رسول سے انحراف قرار پائیں گے۔ مذکورہ تینوں اصحابِ رسول نے محض اللہ کی رضا کے لیے اللہ کی زیادہ سے زیادہ عبادت کرنے کی غرض سے مذکورہ فیصلے کیے تھے لیکن چونکہ ان میں وہ اعتدال اور توازن نہیں تھا جو سنتِ رسول اور اسلامی تعلیمات کا امتیاز ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنی سنت سے اعراض قرار دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اخلاص نیت کے ساتھ ساتھ ہر دینی معاملے میں اتباع رسول بھی ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی عمل عند اللہ مقبول نہیں ہوگا۔ جب مسنون اور مامور عمل میں اپنی طرف سے کمی بیشی نامقبول ہے تو جو اعمال سرے ہی سے خود ساختہ ہیں، شریعت میں ان کا وجود ہی نہیں ہے، محض نیک نیتی سے وہ اعمال کس طرح مقبول و محمود ہو سکتے ہیں؟

3 دین سے ناآشنا عوام میں مشرکانہ عقائد و اعمال عام ہیں

یہ حقیقت بھی بڑی تلخ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد مشرکانہ عقائد و اعمال میں مبتلا ہے، غیر اللہ کے نام کی نذر و نیاز اور ان سے استمداد و استغاثہ عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسجدیں ویران ہیں لیکن غیر اللہ کی قبریں اور ان کے دربار خوب آباد ہیں۔ اللہ سے لوگ اتنا نہیں ڈرتے جتنا فوت شدہ بزرگوں سے ڈرتے ہیں،

قبروں میں مدفون ان بزرگوں کو عالم الغیب، متصرف فی الامور، مشکل کشا، حاجت روا، دور اور نزدیک سے فریادیں سننے والا اور نافع و ضار سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ ساری صفتیں صرف اللہ کی ہیں، اللہ کے سوا کوئی مذکورہ صفات کا حامل نہیں۔ اور الوہی صفات میں مخلوق کو بھی شریک کرنا، اسی کا نام شرک ہے اور اسی کو دیکھتے ہوئے قرآن کریم کی صداقت واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان موجود ہے:

﴿ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ۝ ﴾

''اور اِن میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔''[1]

اور شیطان کا یہ قول بھی سامنے آجاتا ہے جو اس نے اللہ سے مخاطب ہو کر کہا اور جسے قرآن نے نقل کیا ہے:

﴿ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۝ ﴾

''پس اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا، میں ان (لوگوں کو گمراہ کرنے) کے لیے تیرے سیدھے راستے پر ضرور بیٹھوں گا، پھر میں ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے ان کے پاس ضرور آؤں گا اور ان کے دائیں سے بھی اور بائیں سے بھی۔ اور تو (اے اللہ!) ان کی اکثریت کو شکر گزار نہیں پائے گا۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ ۝ ﴾

[1] يوسف 106:12. [2] الأعراف 17,16:7.

''ان میں سے جو تیری پیروی کرے گا تو میں تم سب سے جہنم کو ضرور بھر دوں گا۔''[1]

شیطان اپنے داؤ پیچ میں کس طرح کامیاب رہا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی وضاحت فرما دی ہے:

﴿ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ ﴾

''اور ابلیس نے ان کے متعلق اپنا خیال یقیناً سچا کر دکھایا، چنانچہ مومنوں کی ایک تھوڑی سی جماعت کے سوا سب نے اسی کا اتباع کیا۔''[2]

شرک کو شرک کوئی نہیں سمجھتا، یہی شیطانی چال اور اس کا مکروفریب ہے، وہ شرک کرواتا ہے لیکن اس پر خوب صورت اور حسین غلاف چڑھا کر یا دل فریب اور خوش نما ناموں کے ذریعے سے۔ کبھی اس کو اولیاء اللہ کی محبت باور کراتا ہے، کبھی اس کو وسیلے کا عنوان دے دیا جاتا ہے، کبھی کہا جاتا ہے جن کو تم مدد کے لیے پکارتے ہو، ان کو تو موت آتی ہی نہیں ہے۔ وہ صرف دنیا سے پردہ کر جاتے ہیں، اس لیے ان فوت شدہ لوگوں کو الوہی صفات کا حامل سمجھ لیا جاتا ہے اور بلا خوف وخطر کہا جاتا ہے:

❁...... شہباز، کرے پرواز، جانے راز دلاں دے

❁...... امام بری! امام بری! میری کھوٹی قسمت کرو ہری

❁...... یا علی مولا! میری کشتی پار لگا دینا

اور یہ نعرے بھی عام ہیں۔ یا علی مدد، یا رسول اللہ مدد، یا حسین مدد، یا صاحب الزمان أَدْرِكْنِي۔ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! لَبَّيْكَ يَا حُسَيْنُ!

[1] الأعراف 18:7. [2] سبأ 20:34.

يَارَسُولَ اللّٰهِ! اِسْمَعْ قَالَنَا وَانْظُرْ حَالَنَا

إِنِّي فِي بَحْرِ غَمٍّ مُّغْرَقٌ، خُذْ بِيَدِي سَهِّلْ لَنَا أَشْكَالَنَا

حالانکہ یہ سب شرکِ صریح کے مظہر ہیں لیکن مختلف عنوانات سے اس شرک کا ارتکاب عام ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے شراب کی بوتل پر روح افزا کا لیبل لگا دیا جائے تو کیا وہ شراب، شربتِ روح افزا میں تبدیل ہو جائے گی؟ حرام کے بجائے حلال ہوجائے گی؟ اس کا استعمال جائز ہو جائے گا؟ نہیں، یقیناً نہیں، کسی حرام چیز کا نام بدل لینے سے وہ حلال نہیں ہو سکتی، اس کی حقیقت نہیں بدل سکتی اور اس کا استعمال جائز نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح جب شرک کی حقیقت یہ ہے کہ وہ غیر اللہ میں، چاہے وہ پتھر ہو، شجر ہو، نبی ہو، ولی ہو، زندہ ہو یا مردہ ہو، اللہ والی صفات تسلیم کرنا ہے۔ تو یہ شرک ہر جگہ عام ہے، بت پرست ہی یہ نہیں کرتے، نام نہاد مسلمان بھی بڑی تعداد میں قبر پرستی کی صورت میں اور بزرگوں کی محبت کے عنوان پر اس کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اور شرک کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾

''بے شک اللہ شرک کو معاف نہیں کرے گا، اس کے علاوہ دوسرے گناہ جس کے چاہے گا معاف کر دے گا۔''[1]

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝﴾

''بے شک جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، یقیناً اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے، اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں (مشرکوں) کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔''[2]

[1] النسآء 4:48. [2] المآئدة 5:72.

4 تقلیدی رویے

گمراہی کا ایک بڑا سبب تقلید بھی ہے جس کو اپنے طور پر فرض و واجب کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ مزید برآں اس تقلیدی رویے کی وجہ سے بہت سی صحیح احادیث کو ماننے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ صحتِ حدیث کے اعتراف کے باوجود محض تقلیدِ امام کے خود ساختہ نظریے کی وجہ سے حدیث رسول کو ٹھکرا دینا، کیا کسی مسلمان کا شیوہ ہو سکتا ہے؟ لیکن حدیثِ رسول کے ساتھ یہ استہزا و مذاق بھی صدیوں سے کیا جا رہا ہے اور یہ کام دین نا آشنا عوام کالانعام کی طرف سے نہیں، اصحابِ جُبّہ و دستار، مدعیانِ زہد و تقویٰ اور وارثانِ منبر و محراب کی طرف سے کیا جا رہا ہے اور کیا جاتا ہے۔ کیا اس شوخ چشمانہ جسارت کا قرآن کریم کی درج ذیل آیات کی روشنی میں کوئی جواز ہے؟

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝﴾

”آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے آپس کے اختلاف میں آپ کو حَکَم (ثالث) نہ مان لیں، پھر آپ کے فیصلے پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور اسے دل و جان سے تسلیم کر لیں۔“[1]

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾

”اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کے یہ لائق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو اس کے بعد ان کو اپنے معاملے میں کوئی

[1] النسآء 4:65.

اختیار ہو۔''[1]

مومنوں کا طرۂ امتیاز اور شیوۂ گفتار تو اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے:

﴿ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوٓا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُونَ ۝ ﴾

''بس مومنوں کی تو بات ہی یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کرے تو وہ کہتے ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس کا تقویٰ اختیار کرے تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔''[2]

اور جو لوگ دعوائے ایمان کے باوجود اس کے برعکس رویہ اختیار کرتے ہیں، ان کی بابت اللہ نے فرمایا:

﴿ وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَآ أُولَٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ۝ وَإِذَا دُعُوٓا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ۝ ﴾

''اور وہ کہتے ہیں: ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی، پھر اس کے بعد ان میں سے ایک فریق (اطاعت سے) پھر جاتا ہے اور وہ لوگ مومن ہی نہیں۔ اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کرے تو اچانک ان میں سے ایک فریق منہ موڑ لیتا ہے۔''[3]

[1] الأحزاب 36:33. [2] النور 52,51:24. [3] النور 48,47:24.

یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم میں تو یہ آیات منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور ان میں انھی کا رویہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات بلاشبہ صحیح ہے۔ لیکن یہ بات بھی سب کے نزدیک مسلمہ ہے کہ شان نزول کے خاص سبب کا اعتبار نہیں، اصل چیز وہ حکم ہے جو اس سے ثابت ہوتا ہے اور قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے اس کا اثبات ہوگا بشرطیکہ ان کے اندر بھی وہی چیزیں ہوں جو شانِ نزول کا سبب بننے والے لوگوں کے اندر تھیں۔ اس اعتبار سے اہلِ تقلید کا رویہ بھی قرآن و حدیث کے معاملے میں ان سے مختلف نہیں ہے جو عہد رسالت کے منافقین کا مذکورہ آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ بنابریں اس بات کا شدید خدشہ ہے کہ وہ بھی اپنے تقلیدی رویے کی وجہ سے ان آیات کا مصداق قرار پا جائیں جو اگرچہ نازل منافقین کے بارے میں ہوئی تھیں، اس لیے کہ اَلْعِبْرَةُ بِعُمُومِ اللَّفْظِ لَا بِخُصُوصِ السَّبَبِ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب ''عظمتِ حدیث'' مطبوعہ دارالسلام۔

اس پہلو سے بھی امت مسلمہ کی اکثریت کو برسرحق تسلیم کرنا نہایت مشکل ہے۔

5 اہل حق ہمیشہ تھوڑے ہی رہے ہیں

مذکورہ چار نکتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس حقیقت کو ماننے میں تأمل نہیں ہونا چاہیے کہ اہل حق ہمیشہ ہر دور میں کم ہی رہے ہیں اور اکثریت اہل باطل ہی کی رہی ہے، اس لیے حق کا معیار اکثریت یا اقلیت نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف قرآن کریم اور احادیث صحیحہ ہیں جو سچے دل سے ان کو مانے گا اور ان پر عمل کرے گا، وہی برسرحق ہوگا، وہ کوئی فرد ہو یا جماعت، وہ تھوڑے ہوں یا زیادہ۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ اہل حق ہمیشہ قلیل ہی رہے ہیں۔

﴿ وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ۝ ﴾

''اور میرے شکر گزار بندے تھوڑے ہی ہیں۔''[1]

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ سے فرمایا:

﴿ وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝ ﴾

''اور اگر آپ اہل زمین کی اکثریت کی بات مانیں گے تو وہ لوگ آپ کو اللہ کے راستے سے ہٹا دیں گے۔ یہ اکثریت صرف ظن (گمان) کی پیروکار اور محض اٹکل پچو باتیں کرنے والی ہے۔''[2]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ ۝ ﴾

''اور آپ کی خواہش کے باوجود اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔''[3]

طُوبٰى لِلْغُرَبَاء والی حدیث کا ایک طریق اس طرح بھی ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«طُوبٰى لِلْغُرَبَاءِ، قِيلَ: وَمَنِ الْغُرَبَاءُ؟ يَارَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: نَاسٌ صَالِحُونَ قَلِيلٌ فِي نَاسٍ سُوءٍ كَثِيرٍ، مَنْ يَّعْصِيهِمْ أَكْثَرُ مِمَّنْ يُّطِيعُهُمْ»

''غرباء کے لیے خوش خبری ہے'' پوچھا گیا: اللہ کے رسول! غرباء کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''نیک لوگ، جو بہت زیادہ برے لوگوں میں تھوڑے ہوں گے، ان کے پیچھے لگنے والوں کے مقابلے میں ان کی نافرمانی کرنے والے

[1] سبا 13:34. [2] الأنعام 116:6. [3] یوسف 103:12.

لوگ زیادہ ہوں گے۔'' [1]

افتراق امت والی حدیث جو پہلے گزر چکی ہے جس میں 73 فرقوں کی پیشین گوئی کی گئی ہے، اس سے بھی واضح ہے کہ 73 فرقوں میں صرف ایک فرقہ، فرقۂ ناجیہ ہوگا، یہی طائفۂ منصورہ ہوگا، یعنی اللہ کی خاص مدد سے قائم رہنے والا اور اللہ کی نصرتِ خاص کا مورد، اگرچہ وہ تعداد کے اعتبار سے دوسروں کے مقابلے میں کم ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ اس طائفۂ حقہ کو قیامت تک قائم رکھے گا اور اس کے ذریعے سے احقاقِ حق کر کے لوگوں پر حجت تمام کرتا رہے گا۔ نبی ﷺ کے فرمان سے بھی یہ بات ثابت ہے۔ آپ نے فرمایا:

«لَا تَزَالُ مِنْ أُمَّتِي أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللّٰهِ، لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَهُمْ أَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ عَلٰى ذٰلِكَ»

''میری امت میں سے ایک گروہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گا، اس کو نہ وہ لوگ نقصان پہنچا سکیں گے جو اس کی مدد سے گریزاں ہوں گے اور نہ اس کی مخالفت کرنے والے، یہاں تک کہ ان کے پاس اللہ کا حکم آجائے (قیامت برپا ہو جائے) اور وہ اسی اللہ کے حکم پر قائم رہیں گے۔'' [2]

صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

«لَا يَزَالُ نَاسٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ، حَتّٰى يَأْتِيَهُمْ أَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ ظَاهِرُونَ»

[1] الزهد للإمام ابن المبارك، حديث: 775، والسلسلة الصحيحة للألباني: 154,153/4، حديث: 1619. [2] صحيح البخاري، المناقب، باب سؤال المشركين أن يريهم النبيﷺ آية......، حديث: 3641، وصحيح مسلم، الإمارة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: «لاتزال طائفة من أمتي......»، حديث: 1037 بعد حديث: 1923.

”میری امت کے کچھ لوگ (دلائل حقہ کے اعتبار سے) غالب رہیں گے، یہاں تک کہ ان کے پاس اللہ کا حکم آجائے اور وہ غالب ہی ہوں گے۔“ [1]

صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ، ظَاهِرِينَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ»

”میری امت کا ایک گروہ حق کے لیے لڑنے والا ہمیشہ رہے گا، قیامت تک (دلائل کے اعتبار سے) وہ غالب رہے گا۔“ [2]

ایک دوسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

«مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ، وَلَا تَزَالُ عِصَابَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ عَلٰى مَنْ نَاوَأَهُمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ»

”جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ حق کے لیے لڑنے والا ہمیشہ رہے گا، اپنے مخالفین پر (دلائل کے اعتبار سے) قیامت تک غالب رہے گا۔“ [3]

اس حدیث کے مختلف طرق اور الفاظ سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

- مسلمانوں کی اکثریت حق سے منحرف ہو جائے گی، کہلانے کی حد تک وہ مسلمان ہی کہلائے گی لیکن وہ صراط مستقیم پر چلنے والی نہ ہو گی۔

[1] صحيح البخاري، المناقب، باب سؤال المشركين......، حديث: 3640. [2] صحيح مسلم، الإيمان، باب نزول عيسى بن مريم حاكماً......، حديث: 156. [3] صحيح مسلم، الإمارة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: «لا تزال طائفة من أمتي......» ، حديث: 1037 بعد حديث: 1923.

❁ اس اکثریت کے مقابلے میں ایک گروہ بھی ہمیشہ قائم رہے گا جو حق کے لیے لڑتا رہے گا، یعنی باطل اور گمراہ فرقوں کی تحریفات وتلبیسات کا پردہ چاک کرتا اور حق کی دعوت ان کو دیتا رہے گا۔

❁ اس طائفہ حقہ کے دلائل چونکہ قرآن و احادیثِ صحیحہ پر مبنی ہوں گے، اس لیے دلائل کی رو سے کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا، اس اعتبار سے یہی گروہ قیامت تک غالب رہے گا۔

❁ اللہ کا پسندیدہ گروہ یہی ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ دین کی صحیح سمجھ سے بہرہ ور فرمائے گا اور یہ اس گروہ پر اللہ کا بڑا احسان ہوگا۔

❁ اس گروہ کی فہم صحیح اور دعوتِ حق کے ذریعے ہی سے یہ دین قیامت تک اپنی صحیح شکل میں موجود رہے گا کیونکہ ہر دور میں اس گروہ کو باقی رکھنے سے اصل مقصود یہی ہے۔ اس کی مزید تائید حسب ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

«لَنْ يَّبْرَحَ هٰذَا الدِّينُ قَائِمًا، يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ، حَتّٰى تَقُومَ السَّاعَةُ»

”یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، اس کے لیے مسلمانوں میں سے ایک گروہ لڑتا رہے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔“[1]

”یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا“ کا مطلب یہی ہے کہ دین میں ملاوٹ کرنے والے، نئی نئی بدعات گھڑنے والے، قرآن کریم میں معنوی تحریفات کے ذریعے سے اپنی گمراہیوں کو ثابت کرنے والے بہت ہوں گے، ہر دور میں ہوں گے اور بہت زیادہ ہوں گے

[1] صحيح مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ: لا تزال طائفة......، حديث: 1922.

لیکن ایک گروہ، جو تعداد میں تھوڑا ہو گا، ان سے نبرد آزما اور ان کی تاویلاتِ رکیکہ و بعیدہ وتلبیسات کا پردہ چاک کرتا رہے گا اور یوں اصل دین بھی اپنی صحیح صورت میں موجود رہے گا۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نوازنا ہو گا، وہ تقلیدی راہوں اور بدعات سے نکل کر اصل دین کو اپناتے رہیں گے اور یوں نام نہاد مسلمان معاشروں میں اصل دین پر عمل کرنے والے اور اس کی حفاظت و صیانت کا فریضہ ادا کرنے والے بھی تا قیامت موجود رہیں گے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلْفٍ عَدُولُهُ، يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِينَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ»

''اس علم (قرآن و حدیث) کو ہر پچھلے لوگوں سے (بعد میں آنے والے) ثقہ لوگ (علمائے راسخین) حاصل کریں گے، وہ اس (علم) سے وہ تحریفات دور کریں گے جو بدعتی لوگ حد سے تجاوز کر کے (غلو کر کے اپنی بدعات کے اثبات کے لیے اس میں) کریں گے۔ اور (قرآن و حدیث کی طرف اس) غلط انتساب کی نفی کریں گے جو اہل باطل (اپنے مذہب کی حمایت کے لیے) کریں گے اور (شریعت حقہ کے اصول و مناہج سے نا آشنا) جاہل لوگوں کی تاویلات کا پردہ چاک کریں گے۔''[1]

اس حدیث میں اہل حق کی صفاتِ حمیدہ کا بھی بیان ہے اور ان کے ذریعے سے تجدید و اصلاح کا جو کام سرانجام پائے گا، اس کی بھی وضاحت ہے۔ ان کی سب سے

[1] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کے بارے میں توقف کیا اور تحقیق کرنے کے ارادے کا اظہار کیا۔ (هداية الرواة: 163/1) اور شیخ کے تلمیذ رشید علامہ سلیم الہلالی نے اس کی تحقیق کر کے اس کو حسن لغیرہ قرار دیا ہے۔ دیکھیے: (البدعة وأثرها السيّئ في الأمة، ص: 110، طبع أردن: 2006)

بڑی خوبی یہ ہوگی کہ وہ قرآن و حدیث کے علم سے بہرہ ور ہوں گے، اس میں ان کو رسوخ حاصل ہوگا اور وہ اس علم کے ماہر ہوں گے اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہے گا، ہر قرن اور ہر دور میں ایسے علمائے حق ہوتے رہیں گے۔ اور ان کا سب سے اہم کام یہ ہوگا کہ اہل بدعت اور اہل زیغ اپنی گمراہیوں اور بدعات کے اثبات کے لیے قرآن و حدیث کے معنی و مفہوم میں جو تحریف کریں گے، قرآن و حدیث کی طرف جو غلط باتیں منسوب کریں گے اور جو دور از کار تاویلات کریں گے، اہل حق ان سب کی نفی کرکے، ان کے مغالطات وتلبیسات کا پردہ چاک کر کے اور صحیح بات کو واضح کر کے قرآن وحدیث اور دین حق کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ جَعَلَنَا اللّٰهُ مِنْهُمْ.

اور درج ذیل حدیث میں بھی یہی خبر دی گئی ہے۔

«إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا»

”اللہ تبارک وتعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی کے شروع (یا آخر) میں ایسے لوگ پیدا فرماتا رہے گا جو اس امت کے لیے اس کے دین کی اصلاح وتجدید کا کام کیا کریں گے۔“[1]

یہی طائفۂ منصورہ، فرقۂ ناجیہ اور جماعتِ حقہ ہے جو اتباعِ رسول کے تقاضوں کو پورا کرنے والی اور صحابۂ کرام کے منہج ومسلک پر چلنے والی ہے۔ یہ بلاشبہ تھوڑی ہی ہے، تھوڑی ہی رہی ہے اور شاید تھوڑی ہی رہے لیکن اس کے تھوڑے ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ حق کی حامل نہیں ہے یا حق کے لیے اکثریت ضروری ہے۔

[1] سنن أبي داود، الملاحم، باب مايذكر في قرن المائة، حديث:4291، والسلسلة الصحيحة حديث:599.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

«اَلْجَمَاعَةُ مَا وَافَقَ الْحَقَّ، وَإِنْ كُنْتَ وَحْدَكَ»

''حق کے مطابق چلنے والوں کا نام ''الجماعة'' ہے چاہے تو اکیلا ہی ہو۔''[1]

علامہ شاطبی رحمہ اللہ (المتوفی 790 ہجری) فرماتے ہیں:

«اَلْجَمَاعَةُ مَاكَانَ عَلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ، وَأَصْحَابُهُ، وَالتَّابِعُونَ لَهُمْ بِإِحْسَانٍ»

''نبی ﷺ، صحابۂ کرام اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کے طریقے کا نام الجماعة ہے۔''[2]

حضرت فُضَیل بن عیاض فرماتے ہیں:

«اِلْزَمْ طُرُقَ الْهُدٰى، وَلَا يَضُرُّكَ قِلَّةُ السَّالِكِينَ، وَإِيَّاكَ وَطُرُقَ الضَّلَالَةِ، وَلَا تَغْتَرِ بِكَثْرَةِ الْهَالِكِينَ»

''ہدایت کے راستوں پر چلو، ان راستوں پر چلنے والوں کی کمی کو مت دیکھو، اس سے تمھیں کچھ نقصان نہیں ہو گا۔ اور گمراہی کے راستوں سے بچو، ان راستوں کو اختیار کرنے والوں کا مقدر تباہی ہے، ان کی کثرت سے تم دھوکا مت کھاؤ۔''[3]

حضرت سفیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«اُسْلُكُوا سَبِيلَ الْحَقِّ، وَلَا تَسْتَوْحِشُوا مِنْ قِلَّةِ أَهْلِهِ»

''حق کے راستے پر چلو، اہل حق کی کمی سے مت گھبراؤ۔''[4]

[1] شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة للالكائي: 109/2. [2] الاعتصام: 37/1، بہ تحقیق سليم بن عيد الهلالي، طبع دارابن عفان: 1992ء . [3] الأذكار للنووي: 374/1. [4] الاعتصام، للشاطبي: 46/1.

6 اکثریت کے جہنمی ہونے کا مطلب

مذکورہ حقائق وتفصیلات کے باوجود بعض لوگوں کے لیے شاید یہ امر تسلیم کرنا نہایت مشکل ہے کہ امتِ مسلمہ کی اکثریت گمراہی کا شکار اور جہنم میں جانے کی مستحق ہوسکتی ہے کیونکہ ان کے ذہنوں میں شفاعت کا غلط تصور ہے۔ دوسرا وہ سمجھتے ہیں کہ جنت میں امت محمدیہ کی اکثریت کی بابت احادیث میں بتلایا گیا ہے، اس کے پیش نظر اکثریت کی گمراہی کا تصور غلط ہے۔ لیکن مذکورہ توجیہات کے پیش نظر یہ ناممکن بات نہیں ہے۔ اول اس لیے کہ شفاعت کا مفہوم غلط سمجھا اور سمجھایا گیا ہے۔ شفاعت کا مطلب عام طور پر یہ لیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ شفاعت کے ذریعے سے اپنی ساری امت کو بخشوا لیں گے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تصور جہاں قرآن و حدیث کی نصوص کے خلاف ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے بھی منافی ہے۔ قیامت کا دن اللہ تعالیٰ نے بے لاگ عدل و انصاف کے لیے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق اچھی یا بری سزا دینے کے لیے رکھا ہے، نہ کہ اس لیے کہ ہر اچھے اور برے، متقی اور غیر متقی، صالح اور فاجر کے ساتھ یکساں معاملہ کر کے سب کو اول و ہلے ہی میں جنت میں داخل فرما دے۔ اگر ایسا ہو تو یہ سراسر ظلم ہوگا، انصاف تو نہیں ہوگا۔ اور اللہ کے لیے اس ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی غلط تصور کی نفی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ ﴾

''کیا جن لوگوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انھیں

ان لوگوں کے مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کا جینا اور مرنا برابر ہے؟ برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔''[1]

قرآن کریم کی رو سے ساری امتِ محمدیہ کی پہلے ہی مرحلے میں بخشش کا یہ تصور ''برا فیصلہ'' ہے، جو اللہ کے بارے میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

شفاعت کا صحیح مفہوم

شفاعت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کی شفاعت کی وجہ سے امتِ محمدیہ کے ایسے بہت سے لوگوں کو معاف کر کے ان کو پہلے مرحلے ہی میں جنت میں بھیج دے گا جن پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم کرنا چاہے گا اور وہ زیادہ گناہ گار بھی نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾

''اللہ کی اجازت کے بغیر کون ہے جو اس کی بارگاہ میں شفاعت کر سکے؟''[2]

یعنی وہاں کسی کو کسی کے لیے شفاعت کرنے کی اجازت ہوگی نہ کسی کو یہ جرأت ہی ہوگی۔ ہاں جس کو اللہ تعالیٰ اجازت دے گا، وہ یقیناً شفاعت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو بھی شفاعت کرنے کا یہ اعزاز عطا فرمائے گا اور آپ اللہ کی اجازت سے اپنی امت کی مغفرت کے لیے شفاعت فرمائیں گے۔ لیکن یہ شفاعت کن لوگوں کے لیے ہوگی؟ اس کی بھی وضاحت قرآن کریم میں فرما دی گئی ہے:

﴿ وَلَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَ هُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ○﴾

''وہ شفاعت انھی لوگوں کے لیے کریں گے جن کے لیے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے

[1] الجاثیة 21:45. [2] البقرة 255:2.

گا اور وہ اللہ کے ڈر سے لرزاں و ترساں ہوں گے۔'' [1]

﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۝﴾

''اس دن سفارش کوئی نفع نہ دے گی مگر صرف اس کی جسے رحمٰن اجازت دے گا اور اس کی بات پسند کرے گا۔'' [2]

ان آیات سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

- شفاعت صرف وہ کرے گا جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملے گی۔
- شفاعت صرف ان لوگوں کے حق میں ہوگی جن کی بابت اللہ تعالیٰ پسند فرمائے گا۔

اور ظاہر بات ہے کہ جو اللہ کے سخت نافرمان رہے ہوں گے، اسلام کے احکام و فرائض سے یکسر غافل رہ کر جنھوں نے زندگی گزاری ہوگی اور اللہ تعالیٰ پہلے ان کو سزا دے کر عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہے گا، ان کے لیے اللہ تعالیٰ کب شفاعت کرنے کی اجازت دے گا؟ ان کو پہلے جہنم کی سزا بھگتنی ہوگی اور جب اللہ چاہے گا ان کو معاف فرما کر اور جہنم سے نکال کر جنت میں داخل فرمائے گا، چنانچہ رسول کریم ﷺ کی دوسری مرتبہ شفاعت سے ان کو جنت میں جانے کا موقع ملے گا۔ ان سارے پہلوؤں کی وضاحت احادیث میں موجود ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امت محمدیہ کی بے عمل یا بدعمل اکثریت پہلے جہنم میں جانے کی مستحق قرار پا سکتی ہے، اس میں قطعاً کوئی اشکال یا استحالہ نہیں۔ اس طرح ایک بہت بڑی تعداد سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائے گی۔ اور جہنم میں صرف وہی لوگ ہمیشہ رہنے کے لیے رہ جائیں گے جن کے عقیدوں کی گمراہی نے ان کو شرک اکبر اور شرکِ صریح تک پہنچا دیا ہوگا اور دنیا میں وہ شرک

[1] الأنبياء 28:21. [2] طٰہٰ 109:20.

کا ارتکاب کرتے ہوئے فوت ہوئے ہوں گے۔ ان کے لیے یقیناً مغفرت نہیں ہے، وہ ہمیشہ جہنم ہی کا ایندھن رہیں گے، جنت ان پر حرام ہے۔ وہ کوئی بھی ہوں، کسی بھی قوم اور مذہب سے ان کا تعلق ہو۔ وہاں مذہب اور قومیت کا خانہ نہیں دیکھا جائے گا، صرف عقیدہ اور عمل دیکھا جائے گا، جن کے عقیدہ و عمل میں شرک کی گمراہی نہیں ہوگی، ان کو اللہ چاہے گا تو پہلے مرحلے ہی میں معاف فرما دے گا، بصورت دیگر سزا کے بعد معافی مل جائے گی۔ لیکن مشرکانہ عقائد واعمال کے حامل لوگوں کے لیے معافی نہیں ہے، وہ جہنم میں جائیں گے اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔

ثانیاً: امت محمدیہ کی ایک بہت بڑی تعداد کے جہنم میں جانے کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ جنت میں دوسری امتوں کے مقابلے میں یہ امت کم ہوگی۔ ایسا نہیں ہے، نبی ﷺ کا زمانۂ نبوت بہت زیادہ، یعنی قیامت تک ہے جس کی مدت کا تعین نہیں کیا جاسکتا، اس لیے ہر دور کے اہل حق، چاہے وہ تعداد میں تھوڑے ہی رہے ہوں، قیامت تک کے اہل حق کو ملا کر بہت بڑی تعداد میں ہو جائیں گے۔ اس طرح حدیث کے مطابق اہل جنت کی اکثریت امت محمدیہ ہی کے افراد پر مشتمل ہوگی۔ علاوہ ازیں بعد میں بھی ایک بہت بڑی تعداد اپنی اپنی سزا بھگت کر جہنم سے نکل کر جنت میں چلی جائے گی۔ ان کے لیے بھی جب اللہ کی مشیت ہوگی، نبی ﷺ دوبارہ شفاعت فرمائیں گے، کچھ فرشتے اور صلحاء واتقیاء بھی سفارش کریں گے اور آخر میں کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل و کرم سے معاف فرمائے گا اور یوں اہل ایمان سب کے سب جنت میں پہنچ جائیں گے، جہنم میں صرف وہی رہ جائیں گے جو مرتے دم تک مشرکانہ عقیدوں کے حامل اور عامل رہے، ان کا دائمی ٹھکانا جہنم ہی ہوگا، اس لیے کہ مشرک اور کافر کے لیے جنت حرام ہے۔

ہر خیر امت کو بتلا دیا اور ہر شر سے روک دیا گیا ہے

بہر حال بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ دین اسلام نبی ﷺ کی زندگی میں مکمل ہو گیا تھا، سارے امور خیر بتلا دیے گئے تھے اور جو امور شر تھے، ان سے روک دیا گیا تھا، جیسے ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا بَقِيَ شَيْءٌ يُقَرِّبُ مِنَ الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُ مِنَ النَّارِ، إِلَّا وَقَدْ بُيِّنَ لَكُمْ»

''جو عمل بھی جنت کے قریب اور جہنم سے دور کرنے والا ہے، وہ تمھارے لیے بیان کر دیا گیا ہے۔''[1]

ایک اور حدیث میں فرمایا جو اگرچہ مرسل حسن ہے لیکن شیخ البانی رحمہ اللہ نے مذکورہ حدیث کے تحت اس کو بطور شاہد بیان کیا ہے:

«مَا تَرَكْتُ شَيْئًا مِمَّا أَمَرَكُمُ اللّٰهُ بِهِ إِلَّا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ، وَلَا تَرَكْتُ شَيْئًا مِمَّا نَهَاكُمْ عَنْهُ إِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ»

''اللہ نے جن باتوں کے کرنے کا تم کو حکم دیا ہے، ان میں سے میں نے کوئی چیز نہیں چھوڑی ہے۔ وہ سب تمھارے سامنے بیان کر دی ہیں۔ (اسی طرح) جن چیزوں سے اس نے تمھیں منع کیا ہے، ان میں سے بھی کوئی چیز میں نے نہیں چھوڑی ہے، ان سب سے میں نے تمھیں منع کر دیا ہے۔''[2]

ایک اور حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّهُ لَمْ يَكُنْ نَبِيٌّ قَبْلِي إِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَيْهِ أَنْ يَدُلَّ أُمَّتَهُ عَلٰى خَيْرِ

[1] المعجم الكبير للطبراني، حديث: 1647، والسلسلة الصحيحة للألباني، حديث: 1803.
[2] مسند الشافعي: 189/2، حديث: 673.

مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ، وَيُنْذِرَهُمْ شَرَّمَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ»

''مجھ سے پہلے جو بھی نبی ہوا ہے، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی امت کو ہر بھلائی کی وہ بات بتلائے جس کا امت کے لیے بہتر ہونا اس کو معلوم ہو اور ان چیزوں سے ان کو ڈرائے جن کا ان کے لیے برا ہونا اس کو معلوم ہو۔''[1]

اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ خیر و شر کا یہ علم پیغمبر کو اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے، نیز پیغمبر اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ اس کو اللہ کی طرف سے لوگوں کو بتلانے کے لیے جو کچھ بتلایا جائے، وہ اپنی امت کو بتلا دے، کوئی بات اپنے پاس نہ رکھے۔ قرآن کریم کی اس آیت کا جو نبی ﷺ کی بابت ہے، یہی مطلب ہے:

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ۝﴾

''وہ غیب (کی باتوں) پر بخیل نہیں ہے۔''[2]

کیونکہ پیغمبر کو یہی حکم ہوتا ہے:

﴿بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۖ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾

''جو چیز آپ کے رب کی طرف سے آپ پر اتاری گئی ہے، وہ (لوگوں تک) پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے حق رسالت ادا نہیں کیا۔''[3]

ان آیات و احادیث سے معلوم ہوا کہ جن امور کا تعلق دین سے ہے، امر کا ہو یا نہی (ممانعت) کا، وہ سب بتلا دیے گئے ہیں۔ اب وحی و رسالت کا سلسلہ منقطع ہوجانے کے بعد کسی کو ان میں نہ کمی کرنے کا اختیار ہے اور نہ زیادتی کا، امتی صرف

[1] صحيح مسلم، الإمارة، باب وجوب الوفاء ببيعة الخليفة، الأول فالأول، حديث: 1844.
[2] التكوير 81:24. [3] المآئدة 5:67.

اللہ اور اس کے رسول کے حکموں کا پابند ہے اور اس کی نجات کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہی کافی ہے، وہ اَوَامر (احکامات) کو بجا لائے اور نَوَاہی (ممنوعات) سے باز رہے۔

سُنَّتِ ترکیہ، جو کام منقول نہیں ان کا نہ کرنا سنت اور کرنا خلافِ سنت ہے

ایک تیسری قسم ان کاموں کی ہے جنھیں نبی ﷺ نے نہیں کیا لیکن لوگ ان کو دین یا اجروثواب کا باعث گردان کر کرتے ہیں۔ ان کا کیا حکم ہے؟

ظاہر بات ہے کہ ان کا نہ کرنا ہی سنت اور کرنا خلافِ سنت ہے کیونکہ یہ سُنَّتِ ترکیہ ہے۔ جو کام نبی ﷺ نے نہیں کیا، اس کا نہ کرنا ہی سنت ہوگا۔ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک وہ جن کے نہ کرنے کی صراحت احادیث میں موجود ہے، جیسے جمع بین الصلاتین کے موقع پر آپ کا سنتیں ادا نہ کرنا اور صرف دونوں نمازوں کے فرض ادا کرنا۔ عیدین کی نماز کے لیے اذان اور اقامت (تکبیر) کا اہتمام نہ کرنا، وغیرہ۔ ان کے نہ کرنے کی صراحت احادیث میں موجود ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ نہ کرنے کی صراحت تو نہیں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے وہ کام نہیں کیا، اس لیے کہ اگر وہ کام آپ نے کیا ہوتا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یا ان میں سے کوئی ایک تو ضرور اس کو بیان کرتا، یا اس کام کا اہتمام صحابہ بھی ضرور کرتے۔ جب کسی سے اس کا کرنا بھی منقول نہیں اور صحابہ کا کرنا بھی ثابت نہیں تو بالیقین اس کام کا نہ کرنا ہی سنت ہے، جیسے مردے کو دفنانے کے بعد قبر پر اذان دینا، فرض نماز پڑھتے وقت اردو یا پنجابی وغیرہ زبان میں نیت کے الفاظ زبان سے ادا کرنا، اذان سے قبل صلاۃ وسلام پڑھنا، جماعت کا سلام پھرنے کے فوراً بعد اجتماعی طور پر

بہ آواز بلند لا الہ الا اللہ کا ورد یا صلاۃ وسلام کا پڑھنا اور اس طرح کے دیگر بہت سے کام، جو نبی ﷺ سے منقول نہیں، کرنا۔ یہ سب خلافِ سنت ہوں گے کیونکہ ان کو مستحب یا ضروری قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے آپ سے منقول مسنون کاموں کے چھوڑنے کو مستحب یا ضروری قرار دینا۔ ان دونوں باتوں میں فرق نہیں۔

اس لیے مسنون اور مستحب کام صرف وہ ہوں گے جو نبی ﷺ کے قول یا فعل یا تقریر سے ثابت ہوں گے۔ کمال اتباعِ سنت یہی ہے کہ جو آپ سے منقول ہے، اس کو کیا جائے، جو منقول نہیں ہے اس کو نہ کیا جائے، چاہے اہل بدعت نے اس پر کیسا ہی خوش نما لیبل یا حسین غلاف چڑھا دیا ہو۔

اس سنت ترکیہ کے اصول کو مانے بغیر بدعت کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا۔
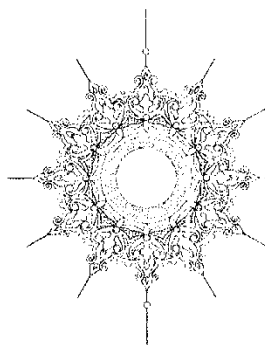
بدعت، تعریف اور حدودِ اطلاق

گزشتہ سارے مباحث اور آئندہ صفحات میں مختلف مہینوں میں رائج رسومات پر بحث کا مرکز ومحور چونکہ بدعت ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بدعت کی تعریف بھی بیان کی جائے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اسی طرح یہ بھی واضح کیا جائے کہ اس کی حدود کہاں تک ہیں، یعنی بدعت کا اطلاق کن کن چیزوں پر ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے یا بہ الفاظ دیگر کون کون سے رائج اعمال اس کے دائرے میں آتے ہیں؟

بدعت کی تعریف

بدعت عربی زبان کا لفظ ہے، اس لیے اس کے ایک معنی تو لغوی ہیں، یعنی لغت کے اعتبار سے عربی میں بدعت کسے کہتے ہیں؟ اور یہ شرعی اصطلاح بھی ہے، نبی ﷺ نے بھی یہ لفظ استعمال فرمایا ہے تو شرعی اعتبار سے اس کے معنی ومفہوم کیا ہوں گے؟ جیسے اور بھی کئی الفاظ ہیں کہ لغوی اعتبار سے ان کے معنی ومفہوم اور ہیں یا کئی معانی ہیں لیکن شرعی اصطلاح میں ان کا اطلاق صرف ان چیزوں پر ہوتا ہے جس معنی کے لیے شارع یا شارح علیہ السلام نے اس کو متعین کردیا ہے، جیسے دعا کا لفظ ہے، اس کے لغوی معنی تو پکارنے کے ہیں لیکن اصطلاح شرعی میں یہ لفظ استمداد و استغاثے، بارگاہِ الٰہی میں التجا والتماس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اَذان کے لغوی معنی اطلاع دینے کے ہیں اور اس لغوی معنی میں بھی اس کا استعمال ہے۔

﴿وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ ...... الآية﴾

”اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان و اطلاع ہے......۔“ [1]

وَعَلٰی هٰذَا الْقِيَاس اس طرح اور بہت سے الفاظ ہیں۔

بدعت کے لغوی معنی

اسی طرح بدعت کے لغوی معنی انوکھی چیز کے ہیں، یعنی ایسی چیز جس کی کوئی نظیر یا مثال پہلے نہ ہو، جیسے قرآن مجید میں اللہ کے رسول ﷺ کو حکم ہے:

﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ﴾

”کہہ دیجیے! میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں۔“ [2]

یعنی بغیر کسی سابق مثال کے میں نیا رسول نہیں آیا ہوں بلکہ مجھ سے پہلے بھی متعدد رسول ہو گزرے ہیں۔ اللہ کی صفت بدیع (جس کا مادہ بدعت ہی ہے) اسی مفہوم کی حامل ہے:

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

”وہ آسمانوں اور زمین کو انوکھے انداز سے بنانے والا ہے۔“ [3]

یعنی ایسے انداز سے جس کی کوئی مثال پہلے نہیں ملتی۔ اس لغوی معنی میں اس لفظ بدعت کا اطلاق اچھی اور بری دونوں چیزوں پر ہوتا ہے۔ اس میں ذم کا پہلو بھی ہو سکتا ہے اور مدح کا بھی کیونکہ اس کا مطلب صرف اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ انوکھی اور بے مثال چیز ہے قطع نظر اس کے کہ یہ اچھی ہے یا بری، جیسے کوئی بہت ہی عمدہ چیز ہو اور جس میں ندرت بھی ہو تو عربی میں کہتے ہیں: مَا هُوَ اِلَّا بِدْعَةٌ یہ تو بہت ہی انوکھی چیز ہے۔

[1] التوبة 9:3. [2] الأحقاف 46:9. [3] البقرة 2:117.

یہاں اس کا استعمال مدح اور تعریف کے مفہوم میں ہے۔ لیکن بدعت کا لفظ جب شرعی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوگا تو وہ ذم ہی کے معنی میں ہوگا، اس میں مدح کا پہلو قطعاً نہیں ہوگا، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمادیا ہے:

«كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ» ''ہر بدعت گمراہی ہے۔''

تو گمراہی میں حسن اور خیر کا پہلو ہرگز نہیں ہوسکتا، چاہے اس کے ایجاد کرنے والوں کے نزدیک اس میں کتنا بھی حسن ہو۔ شریعت کی رو سے اس میں قطعاً حسن نہیں، ذمّ ہی ذمّ ہے۔

شرعی اصطلاح میں بدعت کا مفہوم

بنابریں ضروری ہے کہ بدعت کا شرعی مفہوم بھی واضح کیا جائے۔ علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

«اَلْبِدْعَةُ: طَرِيقَةٌ فِي الدِّينِ مُخْتَرَعَةٌ، تُضَاهِي الشَّرْعِيَّةَ، يُقْصَدُ بِالسُّلُوكِ عَلَيْهَا مَا يُقْصَدُ بِالطَّرِيقَةِ الشَّرْعِيَّةِ»

''دین میں وہ خود ساختہ طریقہ جو (ظاہر میں) شریعت کے مشابہ ہو، اس من گھڑت راستے کے اختیار کرنے سے وہی (اجر وثواب) مقصود ہو جو شرعی طریقے پر چلنے سے مقصود ہوتا ہے۔''[1]

''دین میں خود ساختہ طریقے'' کی قید سے وہ ایجادات نکل گئیں جو تمدنی اور معاشرتی سہولتوں کے لیے ایجاد ہوئی ہیں، ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی، جیسے ریل گاڑیاں، کاریں، بسیں، ہوائی جہاز، اے سی وغیرہ بے شمار اشیاء کیونکہ ان کے

[1] الاعتصام للشاطبي: 51/1، طبع: 1992ء۔

بنانے اور استعمال کرنے کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کوئی شخص ان چیزوں کو اجرو ثواب کی نیت سے استعمال نہیں کرتا۔

''شریعت کے مشابہہ'' کی قید سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دیکھنے میں بظاہر اس کا تعلق دین وشریعت سے معلوم ہوتا ہے یا باور کرایا جاتا ہے لیکن حقیقت میں دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں، جیسے کوئی شخص روزہ رکھے اور کسی سے کلام نہ کرے۔ یا وہ نذر مان لے کہ سارا دن دھوپ میں کھڑا رہے گا، نہ بیٹھے گا اور نہ سائے والی جگہ میں آئے گا، رجب کی پہلی جمعرات کو مخصوص طریقے سے متعین تعداد میں نماز پڑھنا جس کو صلاۃ الرغائب کہا جاتا ہے، اجتماعی ذکر بالجہر، اسی طرح کی دیگر بعض عبادات جو خود ساختہ طریقے سے مخصوص ہیئات وکیفیات کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں وغیرہ۔

روزہ رکھنا، نذر ماننا، ذکر اللہ کرنا، نوافل پڑھنا وغیرہ، یہ سارے امور بظاہر شرعی امور ہیں گویا شریعت کے مشابہہ ہیں لیکن مذکورہ کیفیات کے ساتھ حقیقت میں شریعت نہیں ہیں کیونکہ شریعت میں ان کی کوئی اصل نہیں ملتی۔ علاوہ ازیں ظاہر شکل وصورت کے اعتبار سے یہ عبادات لگتی ہیں لیکن ہیئت وکیفیت میں شریعت کے خلاف ہیں، اس لیے کہ نبی ﷺ کے قول یا عمل یا تقریر سے ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، جبکہ عبادات کے لیے ضروری ہے کہ ان کی پوری کیفیت شرعی دلائل سے ثابت ہو، نیز عبادات سے مقصود اجرو ثواب اور تقربِ الٰہی کا حصول ہوتا ہے اور وہ تب ہی حاصل ہوسکتا ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق ادا کی جائیں۔ اپنے خودساختہ طریقے سے کیے جانے والے کام نہ وہ عبادت ہیں اور نہ عمل صالح بلکہ وہ بدعت ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں تقربِ الٰہی کے حصول کے لیے مذکورہ خود ساختہ طریقوں کا نام ونشان نہیں ملتا کیونکہ وہ شریعت کی روح اور حقیقت کو سمجھتے تھے، اس لیے ان کا یقین تھا کہ اجر وثواب صرف اتباعِ رسول میں ہے، رضائے الٰہی صرف اسوۂ حسنہ کی پیروی میں ہے اور نجات و سعادت ابدی صرف اور صرف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے میں ہے اور اس سے انحراف میں ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«اِتَّبِعُوا وَلَا تَبْتَدِعُوا فَقَدْ كُفِيتُمْ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»

''پیروی کرو اور بدعتیں نہ گھڑو (ان کی تمھیں ضرورت نہیں)، اس لیے کہ تمھیں جو بتلایا گیا ہے، وہ تمھارے لیے کافی ہے۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل

صحابۂ کرام کا عمل بھی اس کے مطابق تھا، اس کی ایک بہترین مثال وہ واقعہ ہے جو سنن دارمی میں موجود ہے کہ کچھ لوگ مسجد میں حلقہ بنا کر بیٹھے ہوئے اجتماعی ذکرِ جہر کر رہے تھے، ان کے ہاتھوں میں کنکریاں تھیں، ان میں سے ایک شخص کہتا: سو مرتبہ اللّٰہ أکبر کہو، وہ سو مرتبہ اللّٰہ أکبر کہتے، پھر وہ کہتا: سو مرتبہ لا إله إلا اللّٰہ کہو، وہ سو مرتبہ یہ کلمہ کہتے، پھر وہ کہتا: سو مرتبہ سبحان اللّٰہ کہو، وہ سو مرتبہ سبحان اللّٰہ کہتے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو جا کر بتلایا اور کہا: میں نے ابھی مسجد میں ایک (نیا) کام دیکھا ہے جو مجھے عجیب تو لگا ہے لیکن

[1] سنن الدارمي: 49/1.

میرے خیال میں وہ اچھا ہی ہے۔ انھوں نے تفصیل پوچھی، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے یہ بتلائی تو انھوں نے پوچھا: تم نے ان سے کیا کہا؟ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے تو آپ کی رائے کا انتظار ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ آئے اور وہ حلقۂ ذکر دیکھا تو ان سے پوچھا: مَا هٰذَا الَّذِي أَرَاكُمْ تَصْنَعُونَ؟ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ انھوں نے کہا: اے ابو عبدالرحمٰن! (حضرت ابن مسعود کی کنیت) ہم کنکریوں پر شمار کر کے تکبیر و تہلیل اور تسبیح کر رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«وَيْحَكُمْ يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ! مَا أَسْرَعَ هَلَكَتَكُمْ! هٰؤُلَاءِ صَحَابَةُ نَبِيِّكُمْ مُتَوَافِرُونَ، وَهٰذِهِ ثِيَابُهُ لَمْ تُبْلَ، وَآنِيَتُهُ لَمْ تُكْسَرْ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! إِنَّكُمْ لَعَلٰى مِلَّةٍ أَهْدٰى مِنْ مِلَّةِ مُحَمَّدٍ أَوْ مُفْتَحُوا بَابَ ضَلَالَةٍ»

''افسوس تم پر اے امت محمد! (ﷺ) کس تیزی سے تم ہلاکت کے راستے پر چل پڑے ہو! ابھی تو تمھارے پیغمبر کے صحابہ بھی کثرت سے موجود ہیں، یہ آپ (ﷺ) کے کپڑے بھی بوسیدہ نہیں ہوئے، آپ کے برتن بھی ابھی نہیں ٹوٹے (اور تم نے دین میں نئے نئے طریقے ایجاد کرنے شروع کر دیے ہیں) قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم کسی ایسے مذہب پر ہو جو محمد (ﷺ) کے مذہب سے زیادہ ہدایت والا ہے یا گمراہی کا دروازہ تم کھول رہے ہو۔''

انھوں نے کہا:

«وَاللّٰهِ! يَا أَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ! مَا أَرَدْنَا إِلَّا الْخَيْرَ»

”اے ابوعبدالرحمٰن! اللہ کی قسم! ہمارا ارادہ سوائے بھلائی (اجروثواب) کے اور کوئی نہیں۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«وَكَمْ مِّنْ مُّرِيدٍ لِلْخَيْرِ لَنْ يُّصِيبَهُ، إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ حَدَّثَنَا: إِنَّ قَوْمًا يَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ وَأَيْمُ اللّٰهِ! مَا أَدْرِي لَعَلَّ أَكْثَرَهُمْ مِنْكُمْ»

”کتنے ہی لوگ ہیں جو بھلائی کی نیت سے کام کرنے والے ہیں لیکن وہ اس کے حاصل کرنے میں یکسر ناکام رہتے ہیں۔ (جیسے) رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیان فرمایا تھا: ”کچھ لوگ ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے گلوں سے تجاوز نہیں کرے گا۔“ اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا، ان کی اکثریت شاید تم ہی میں سے ہو۔“ [1]

شیخ البانی رحمہ اللہ اس واقعے کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

«وَمِنَ الْفَوَائِدِ الَّتِي تُؤْخَذُ مِنَ الْحَدِيثِ وَالْقِصَّةِ: أَنَّ الْعِبْرَةَ لَيْسَتْ بِكَثْرَةِ الْعِبَادَةِ، وَإِنَّمَا بِكَوْنِهَا عَلَى السُّنَّةِ، بَعِيدَةٌ عَنِ الْبِدْعَةِ وَقَدْ أَشَارَ إِلٰى هٰذَا ابْنُ مَسْعُودٍ رضی اللہ عنہ بِقَوْلِهِ أَيْضاً: «اِقْتِصَادٌ فِي سُنَّةٍ خَيْرٌ مِنَ اجْتِهَادٍ فِي بِدْعَةٍ» [2]

”اس حدیث اور قصے کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اعتبار کثرت عبادت کا نہیں بلکہ اس کے سنت کے مطابق اور بدعت سے دور

[1] سنن الدارمي: 49/1. [2] السلسلة الصحيحة للألباني: 14،13/5.

ہونے کا ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول سے بھی ملتا ہے: ''سنت کے مطابق عمل میں (کثرت کے بجائے) میانہ روی، بدعتی عمل میں زیادہ کوشش کرنے سے بہت بہتر ہے۔''

مذکورہ واقعے میں دیکھ لیجیے کہ لوگ بیٹھے ہوئے اللہ کا ذکر ہی کر رہے تھے جو نہایت فضیلت والا عمل ہے، نیز ان کی نیت بھی یقیناً صحیح ہی تھی، یعنی ذکر الٰہی کرنا اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ کر اول وہلے میں امر خیر ہی سمجھا لیکن اپنی قطعی رائے دینے سے گریز کیا، پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا اور اسے خلاف سنت قرار دیا تو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا اور حضرت ابن مسعود سے اتفاق کیا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے منکر اور خلافِ سنت کیوں قرار دیا؟ صرف اس مخصوص کیفیت و ہیئت کی وجہ سے جو ذکر کرنے کے لیے انھوں نے اپنی طرف سے اختیار کی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کیفیت ثابت نہیں تھی، ورنہ ذکرِ الٰہی کی مشروعیت بلکہ فضیلت سے تو ان کو انکار نہیں تھا۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور کے اس ایک واقعے ہی سے سنت و بدعت اور مشروعیت وغیر مشروعیت کی حقیقت کو نہایت آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے بشرطیکہ کوئی فہم صحیح اور قلب سلیم سے بہرہ ور ہو۔ بقول علامہ اقبال:

''سمجھ'' میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور کی چند اور مثالیں

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے ایک شخص کو چھینک آئی تو اس نے کہا:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُولِ اللّٰهِ»

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کو ٹوکا اور فرمایا:

«وَأَنَا أَقُولُ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُولِ اللّٰهِ، وَلَیْسَ هٰکَذَا عَلَّمَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَلَّمَنَا أَنْ نَقُولَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ»

''میں بھی کہتا ہوں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُولِ اللّٰهِ لیکن (چھینک کے موقع پر) ہمیں رسول اللہ ﷺ نے اس طرح نہیں سکھایا بلکہ ہمیں سکھایا ہے کہ ہم کہیں: اَلْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ.''

اس روایت کی سند میں بعض لوگوں نے کلام کیا ہے۔ لیکن شیخ البانی رحمہ اللہ کے تلمیذ رشید علامہ سلیم بن عید الہلالی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: البدعة وأثرها السيئ في الأمة، ص: 49، طبع: 2006، خود شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے ''صحیح الترمذی'' میں درج کیا ہے۔

❁ ایک شامی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب دیا کہ وہ جائز ہے۔ اس شامی نے کہا: آپ کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو اس سے روکا ہے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

«أَرَأَیْتَ إِنْ کَانَ أَبِي نَهٰی عَنْهَا وَصَنَعَهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَ أَمْرُ أَبِي یُتَّبَعُ أَمْ أَمْرُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ؟»

''ذرا بتلا! اگر میرے والد نے اس سے منع کیا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے کیا ہے تو میرے والد کی بات مانی جائے گی یا رسول اللہ ﷺ کی؟''

اس نے کہا: بَلْ أَمْرُ رَسُولِ اللّٰهِ بات تو رسول اللہ ﷺ ہی کی مانی جائے گی۔

تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

«لَقَدْ صَنَعَهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ»

''رسول اللہ ﷺ نے تو حج تمتع کیا ہے (اس کے بعد کسی اور کی بات دیکھنے سننے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔)''[1]

❁ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جو رکوع سجود اطمینان سے نہیں کر رہا تھا تو حضرت حذیفہ نے اس سے فرمایا:

«مَا صَلَّيْتَ، وَلَوْ مُتَّ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ الْفِطْرَةِ الَّتِي فَطَرَ اللّٰهُ مُحَمَّدًا ﷺ»

''تو نے نماز ہی نہیں پڑھی اور اگر تجھے اس طرح نماز پڑھتے ہوئے موت آ گئی تو تو اس فطرت پر نہیں مرے گا جس پر اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو پیدا فرمایا ہے۔''[2]

ان واقعات سے بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اس جذبۂ اتباعِ رسول اور منہجِ صحیح کا پتا چلتا ہے جس میں ابتداع (بدعت سازی) کا دور دور تک شائبہ نہیں اور جس کی وجہ ہی سے اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو دوسرے لوگوں کے لیے معیار اور کسوٹی قرار دیا:

﴿ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ﴾[3] ﴿ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ﴾[4]

نیز ان کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے والوں کو بھی انھی کی طرح اپنی رضا مندی کا سرٹیفکیٹ اور جنت کی خوشخبری سے نوازا۔ جَعَلَنَا اللّٰهُ مِنْهُمْ.

[1] جامع الترمذي، الحج، باب ماجاء في الجمع بين الحج والعمرة، حديث: 824. [2] صحيح البخاري، الأذان، باب إذا لم يتم الركوع، حديث: 791. [3] البقرة 2:13. [4] البقرة 2:137.

اسلاف اور ائمہ کا طرزِ عمل

ان صحابۂ کرام کے پیروکاروں کو بھی یہ عظیم مقام کیوں حاصل ہوا؟ اسی جذبۂ اتباع اور نفورِ ابتداع کی وجہ سے جو صحابۂ کرام کا طرۂ امتیاز اور وجہ افتخار تھا۔ اس کی بھی ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن میسّب رحمہ اللہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ طلوعِ فجر کے بعد (سنت نبوی کے مطابق دو سنتوں پر کفایت کرنے کے بجائے) دو رکعتوں سے زیادہ پڑھتا ہے اور ان میں رکوع سجود بھی بہت کرتا ہے۔ سعید بن میسّب نے اس کو اس سے منع کیا تو اس شخص نے کہا: اے ابو محمد! کیا اللہ مجھے نماز پڑھنے پر عذاب دے گا؟ آپ نے جواب دیا:

«لَا، وَلٰكِنْ يُعَذِّبُكَ عَلٰى خِلَافِ السُّنَّةِ»

''اللہ تجھے نماز پڑھنے پر عذاب نہیں دے گا، سنت کے خلاف پڑھنے پر عذاب دے گا۔''[1]

امام مالک رحمہ اللہ جن کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے کہ جس نے بدعت ایجاد کی اور اسے بدعت حسنہ سمجھا، اس نے یہ گمان کیا کہ محمد ﷺ نے (نعوذ باللہ) حق رسالت کی ادائیگی میں خیانت کا ارتکاب کیا۔[2]

ان کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھا: اے ابو عبداللہ! میں احرام کہاں سے باندھوں؟ آپ نے جواب دیا: ذوالحلیفہ سے (جو اہل مدینہ کی میقات ہے) جہاں سے رسول اللہ ﷺ نے احرام باندھا تھا۔ اس نے کہا: میں تو چاہتا ہوں کہ میں مسجد

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي:466/2. [2] الاعتصام للشاطبي:65/1.

نبوی اور قبر رسول سے احرام باندھوں۔ آپ نے فرمایا: ایسا نہ کر، مجھے اندیشہ ہے کہ تو فتنے میں پڑ جائے گا۔ اس نے کہا: اس میں فتنے والی بات کون سی ہے، یہ چند میل ہی کا تو فاصلہ ہے جو میں زیادہ کروں گا؟ آپ نے فرمایا:

«وَأَيُّ فِتْنَةٍ أَعْظَمُ مِنْ أَنْ تَرٰى أَنْ سَبَقْتَ إِلٰى فَضِيلَةٍ قَصَّرَعَنْهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ؟ إِنِّي سَمِعْتُ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُولُ: ﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○﴾

''اس سے بڑا فتنہ اور کیا ہو گا کہ تو (رسول اللہ ﷺ سے) پیش قدمی کرتے ہوئے مسجد نبوی سے احرام باندھنے کو فضیلت والا عمل سمجھ رہا ہے (جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، گویا) رسول اللہ ﷺ نے اس فضیلت کے حاصل کرنے میں (نعوذ باللہ) کوتاہی کی؟ میں نے تو اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ان لوگوں کو جو اس (رسول اللہ ﷺ) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں ان کو کوئی فتنہ (بڑی آزمائش) نہ آلے یا کسی درد ناک عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں۔''[1]

اسی لیے امام شافعی رحمہ اللہ نے بجا طور پر فرمایا:

«مَنِ اسْتَحْسَنَ فَقَدْ شَرَعَ»

''جس نے بدعت ایجاد کر کے اس کو اچھا سمجھا (اسے بدعت حسنہ قرار دیا) تو اس نے شریعت سازی کا ارتکاب کیا۔'' جو اللہ کا حق ہے۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

[1] النور 63:24. الاعتصام للشاطبي:534/2. [2] الإحكام في أصول الأحكام للآمدي:209/4.

«أُصُولُ السُّنَّةِ عِنْدَنَا التَّمَسُّكُ بِمَا كَانَ عَلَيْهِ أَصْحَابُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَالْاِقْتِدَاءُ بِهِمْ، وَتَرْكُ الْبِدَعِ، وَكُلُّ بِدْعَةٍ فَهِيَ ضَلَالَةٌ»

''ہمارے نزدیک اصول سنت یہ ہے کہ اصحابِ رسول کے طریقے کو مضبوطی سے پکڑا جائے اورانھی کی اقتدا کی جائے اور بدعتوں کو چھوڑ دیا جائے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''[1]

بدعت کی ہلاکت خیزیاں

گزشتہ مباحث سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بدعت بہت ہی خطرناک چیز ہے۔ یہ صرف ایک جرم، ایک گناہ اور ایک معصیت ہی نہیں بلکہ یہ متعدد گناہوں اور جرموں کا مجموعہ ہے۔ ذرا ایک نظر ان جرموں کو دیکھیں اور پھر غور کریں، شاید یہ غوروفکر آپ کی زندگی میں انقلاب پیدا کردے اور صراط مستقیم کی سمجھ اللہ تعالیٰ آپ کو عطا فرما دے۔ اللہ تعالیٰ ہر قلب مسلم میں یہ تڑپ پیدا فرما دے کہ وہ جہنم والے راستے سے بچے اور جنت کا راستہ اختیار کرے۔ غوروفکر کے یہ پہلو حسبِ ذیل ہیں:

1 اللہ تعالیٰ نے جب قرآن مجید میں تکمیل دین اور اتمامِ نعمت کا اعلان فرما دیا ہے تو اس کے بعد اللہ پر ایمان رکھنے والوں کا کام کیا ہے؟ اس کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کا یا اللہ کے اس فرمانِ تکمیل کو جھٹلا کر اپنی طرف سے دین میں اضافہ کرنے کا؟

2 اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں۔ ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾[2] جس کا مطلب یہ ہے کہ دین میں جو جو باتیں ضروری تھیں، اللہ نے وہ سب خود یا اپنے پیغمبر کے ذریعے

[1] شرح أصول اعتقاد أهل السنة للالكائي: 156/2. [2] مريم 64:19.

سے بتلا دیں۔ اب جو شخص بدعات ایجاد کرتا ہے تو گویا وہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو فلاں فلاں باتیں یاد نہیں رہیں جبکہ وہ بھی ضروری تھیں اور ان کے بغیر دین کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ کیا اللہ کی بابت ایسا عقیدہ رکھنا یا اس قسم کے عقیدے کا تأثر ملنا درست ہے؟ اس میں اللہ کی عظمت کا اظہار ہے یا اس کی تنقیص؟

3 نبی ﷺ اللہ کے رسول تھے، رسالت کے منصب کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام بلاکم و کاست امت تک پہنچا دیے جائیں، ورنہ حق رسالت میں خیانت ہو گی۔ کیا بدعتی اپنے طرز عمل سے اس بات کا اظہار نہیں کرتا کہ اللہ کے رسول نے (نعوذ باللہ) ساری باتیں اپنی امت کو نہیں بتلائیں، اس لیے ہمیں اب بہت سی چیزیں ایجاد کرنی پڑ رہی ہیں۔ کیا یہ تصور یا ایسے تصور کا تصور (خیال) صحیح ہے یا یہ گستاخانہ تصور ہے؟

4 نبی ﷺ پر وحی و رسالت کا خاتمہ فرما دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی نئی شریعت، نئے احکام نازل نہیں ہوں گے، جیسے آپ سے پہلے یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن بدعتی اللہ کے اس فیصلے پر راضی نہیں، وہ نئی بدعات گھڑ کر ختم نبوت کا اور اللہ کے اس فیصلے کا مذاق اڑاتا اور یہ باور کراتا ہے کہ دین میں نئے احکام کی ابھی ضرورت ہے، صرف شریعت محمدیہ، جس پر صحابۂ کرام و تابعینِ عظام کے سنہری دور میں عمل کیا گیا، کافی نہیں ہے۔

5 تشریع (شریعت سازی) صرف اللہ کا حق ہے، کسی بھی انسان کو اللہ نے یہ حق نہیں دیا حتی کہ پیغمبر بھی اللہ کے حکم اور اس کی وحی کے بغیر یہ کام نہیں کرتا، وہ بھی احکام الٰہی ہی کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن بدعت گھڑنے والا اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے منصبِ تشریع پر فائز کر لیتا ہے۔ کیا اس کو یہ حق حاصل ہے؟ اور کیا یہ اللہ کی توہین نہیں ہے؟

6 دین تو کامل ہے جس کا اعلان کر دیا گیا ہے اور جس کا اعتراف غیروں کو بھی ہے، جیسے یہودیوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ تمھارا پیغمبر تو تمھیں پیشاب پاخانے تک کے آداب سکھاتا ہے، حضرت سلمان نے بڑے فخر سے اعتراف فرمایا کہ ہاں واقعی ایسا ہے اور ہمیں قضائے حاجت کے آداب بھی بتلائے گئے ہیں۔ ایسے کامل دین میں اپنے خیالِ فاسد، عقلِ ناقص اور ہوائے نفس سے دخل دینا اور نئے نئے اضافے تجویز کرنا اور ان پر عمل کرنا کیا ایک مسلمان کے شایانِ شان ہے؟

7 کیا کسی کی عقلِ فاسد اور فہمِ ناقص کو یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ وحیٔ الٰہی، یعنی قرآن و حدیث کو نظر انداز کر کے حسن و قبح یا استحباب و افضلیت کا فیصلہ کر سکے؟ یقیناً نہیں۔ لیکن ایک بدعتی ایسا کر رہا ہے اور نہایت دھڑلے سے کر رہا ہے۔ کیا اس شوخ چشمانہ جسارت کا کوئی جواز ہے؟

روزِ محشر اہل بدعت کی محرومی

یہ چند پہلو ایسے ہیں کہ ان پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا جائے تو بدعت کی خطرناکیاں اور تباہیاں سامنے آجاتی ہیں۔ اسی لیے روزِ قیامت میدان حشر میں بدعتیوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت تو کجا، آپ کے قریب تک نہیں جانے دیا جائے گا، جیسے حدیث میں آتا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنِّي فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ، مَنْ مَرَّ عَلَيَّ شَرِبَ، وَمَنْ شَرِبَ لَمْ يَظْمَأْ أَبَدًا، لَيَرِدَنَّ عَلَيَّ أَقْوَامٌ أَعْرِفُهُمْ وَيَعْرِفُونِي، ثُمَّ يُحَالُ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ»

''میں (قیامت کے دن) حوض پر تمھارا پیش رو (پہلے جانے والا) ہوں گا، جو

میرے پاس سے گزرے گا، اس کا پانی پیے گا اور جو پی لے گا، کبھی اس کو پیاس تنگ نہیں کرے گی، وہاں کچھ لوگ میرے پاس آرہے ہوں گے جنھیں میں پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے، پھر (ان کو روک دیا جائے گا اور) میرے اور ان کے درمیان رکاوٹ کھڑی کردی جائے گی۔''

یہ کون لوگ ہوں گے؟ اس کی صراحت بھی دوسری حدیث میں ہے۔ جب ان کو روک دیا جائے گا تو نبی ﷺ فرماتے ہیں: میں فرشتوں سے کہوں گا:

«إِنَّهُمْ مِنِّي، فَيُقَالُ: إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا أَحْدَثُوا بَعْدَكَ، فَأَقُولُ: سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِي»

''یہ تو میرے ہی (امتی معلوم ہوتے) ہیں تو کہا جائے گا: (بلاشبہ یہ آپ ہی کے نام لیوا ہیں لیکن) آپ کو معلوم نہیں کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا نئی چیزیں دین میں ایجاد کر لی تھیں؟ (یہ سن کر) میں کہوں گا: دوری ہو، دُوری ہو، ان لوگوں کے لیے جنھوں نے میرے بعد دین میں تبدیلیاں کر دیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو بدعت سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ وہ قیامت کی رسوائی اور ذلت سے محفوظ رہے اور حوضِ کوثر کے آبِ زلال سے بھی محروم نہ رہے۔

کوئی بدعت، بدعتِ حسنہ نہیں ہوسکتی

اہل بدعت، بدعت کا جواز یہ کہہ کر نکالتے ہیں کہ ہماری ایجاد کردہ بدعت کے یہ یہ فائدے ہیں، اس لیے یہ بدعت، بدعت ضلالہ نہیں بلکہ بدعت حسنہ ہے، حالانکہ اولاً

[1] صحیح البخاري، الرقاق، باب في الحوض، حدیث:6584,6583، وصحیح مسلم، الفضائل، باب إثبات حوض نبینا ﷺ، حدیث:2291,2290.

نبی ﷺ کا فرمان ہے: «كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ» ''ہر بدعت گمراہی ہے۔''

اس میں آپ نے کوئی استثنا نہیں فرمایا۔ آپ نے بہ تکرار اور بہ کثرت یہ اصول اور کلیہ بیان فرمایا لیکن ایک موقع پر بھی ایسا ارشاد نہیں فرمایا جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ کسی امتی کا نو ایجاد عمل اچھا بھی ہوسکتا ہے۔ آپ بلا استثنا یہی فرماتے رہے: ''ہر بدعت گمراہی ہے۔'' آپ کے اس فرمان کے بعد بدعت ایجاد کرنے والے بہ زعم خویش اپنی بدعت کو کتنا بھی اچھا سمجھیں، اس کے کتنے بھی فوائد وفضائل بیان کریں اور اس پر کیسا ہی خوش نما اور دل فریب لیبل لگائیں لیکن اس پر عمل گمراہی ہی ہے، نبی ﷺ کے فرمان کے برعکس اس میں اجر و ثواب نہیں ہوگا، اس لیے کہ اجر و ثواب تب ہوگا جب وہ عمل عند اللہ مقبول ہوگا اور وہ عمل جو اللہ نے اور اللہ کے رسول نے نہیں بتلایا، وہ مقبول کس طرح ہوسکتا ہے؟ فرمان گرامی ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»

''جس نے ایسا عمل کیا جس کی بابت ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔''[1]

دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ»

''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسا نیا کام ایجاد کیا جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔''[2]

ثانیاً: جتنے بھی اہل بدعت ہوگزرے ہیں یا اب ہیں، سب اپنی اپنی ایجاد کردہ

[1] صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة وردّ محدثات الأمور، حديث: 1718.

[2] صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جورٍ......، حديث: 2697، وصحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة......، حديث: 1718.

بدعت کو بدعت حسنہ ہی قرار دیتے ہیں، کوئی بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ان کی بدعت گمراہی والی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو صدیوں سے بدعت سازی کا جو کام ہوتا چلا آرہا ہے اور سیکڑوں بدعتیں اب تک ایجاد ہو چکی ہیں اور اب بھی عالم اسلام میں جو بے شمار مختلف قسم کی بدعات رائج ہیں، وہ سب کی سب حسنہ ہی قرار پائیں گی اور یوں نبی ﷺ کا فرمان: «كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ» عبث اور یکسر لا حاصل قرار پائے گا کیونکہ بدعت ضلالہ کا تو پھر کہیں وجود ہی نہیں ہے، سب (ماشاء اللہ) بدعات حسنہ ہی ہیں۔ فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ.

ثالثاً: بدعت سازی، اللہ اور رسول کے مقابلے میں شریعت سازی ہے گویا یہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ حریفانہ کشمکش ہے۔ کیا اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ مقابلہ کرنے اور ان کی مخالفت کرنے میں کوئی حسن، کوئی خوبی اور کوئی کمال ہو سکتا ہے؟ یقیناً نہیں، ہرگز نہیں، پھر کوئی بدعت، حسنہ کس طرح ہو سکتی ہے؟

رابعاً: بدعت کو حسنہ قرار دینے کا ضابطہ یا اصول کیا ہے؟ اگر کہا جائے کہ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ جو بدعت شریعت کے موافق ہو، وہ بدعت حسنہ ہے۔ تو قابل غور بات یہ ہے کہ جو عمل موافق شرع ہو، وہ تو سرے سے بدعت کے ذیل ہی میں نہیں آتا۔ اس کو بدعت حسنہ کہنے میں کیا تک ہے؟ گویا بدعت کے ساتھ حسنہ کا اضافہ ہی اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، ورنہ اس کا الگ نام (بدعت) رکھ کر اس کے ساتھ حسنہ کا لفظ لگانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، جیسے ظہر کی فرض نماز چار رکعت ہیں۔ اب اگر کوئی چار کی جگہ چھ رکعات فرض بتلاتا ہے اور اس کو بدعت حسنہ قرار دیتا ہے تو اس کا اس عمل کو بدعت حسنہ کہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عمل شریعت کے موافق نہیں بلکہ مخالف ہے کیونکہ موافقِ شرع عمل کو بدعت حسنہ

کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، جیسے بعض امور ایسے ہیں جن کی بابت صراحتاً کوئی نص نہیں ہے لیکن ان کے جواز و استحباب پر اشارتاً یا اقتضاءً کوئی نہ کوئی اصل دلالت کرتی ہے (اس کی تفصیل آگے آئے گی) وہ چونکہ شریعت کے موافق ہی ہے، اس لیے ان امور کو کوئی بھی بدعت حسنہ قرار نہیں دیتا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ مُحدَث فی الدِّین عمل کو بدعت حسنہ قرار دینے کی بنیاد عقل ہے تو عقلیں تو مختلف ہوتی ہیں، کس کی عقل کو معیار اور کسوٹی قرار دیا جائے گا؟ بعض حضرات کی عقل نے عزاو ماتم کی جو صورتیں ایجاد کی ہیں، جن کی وہ فرائض اسلام سے بھی زیادہ پابندی کرتے ہیں، اہل سنت کی عقل ان کو صحیح تسلیم نہیں کرتی، اسی طرح بعض حضرات نے ''جشن میلاد'' کی جو صورتیں اختیار کی ہیں، دوسرے اہل اسلام کی عقل ان کو صحیح تسلیم نہیں کرتی۔ وعلیٰ هذا القياس. بہت سے خود ساختہ طریقے اور اعمال ہیں جن پر تمام عقلیں متفق نہیں ہوسکتیں، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر دین کی بنیاد عقل، رائے اور قیاس پر ہوتی تو جرابوں پر اوپر مسح کرنے کے بجائے جرابوں کے نچلے حصے پر مسح کیا جاتا۔[1] لیکن مشروع اوپر والے حصے پر مسح کرنا ہے (حالانکہ گندگی نچلے حصے میں لگتی ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ دین میں عقل بھی بنیاد نہیں بن سکتی، اس لیے کہ ہر موجد اور مبتدع کو اپنی گھڑی ہوئی چیز عقلی طور پر اچھی لگتی ہے، اسی لیے وہ اپنی خانہ ساز چیزوں کو بعض دفعہ وجوب و استحباب کا، ورنہ پھر بدعت حسنہ کا درجہ تو ضرور ہی دیتا ہے جبکہ دوسرے اہل اسلام ان کی بدعات سے بجا طور پر اختلاف کرتے ہیں۔

خامساً: بدعت حسنہ کے نام پر دین میں اضافہ کرنا جائز ہے تو کیا کسی اور اچھے سے

[1] سنن أبي داود، الطهارة، باب كيف المسح؟ حديث: 162.

نام اور عنوان پر دین میں کمی بھی کی جاسکتی ہے؟ مثلاً: گرمیوں کے روزوں میں سارا دن دھوپ میں کام کرنے والے مزدوروں، کاریگروں، مستریوں اور کسانوں وغیرہ کو روزوں کی چھوٹ دی جاسکتی ہے؟ کیونکہ ایسے لوگوں کے لیے محنت مزدوری کے ساتھ سخت گرمی میں روزے رکھنے نہایت مشکل ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے نمازوں میں بھی تخفیف کی جاسکتی ہے، پانچ کے بجائے نمازیں دو کر دی جائیں یا وقت کی پابندی ختم کر دی جائے تاکہ تجارت و کاروبار سے فراغت کے بعد اکٹھی پڑھ لی جائیں تاکہ معاشی طور پر ملک ترقی کر سکے؟ کیا ایسا کرنا جائز ہوگا؟

اگر بدعت حسنہ کے نام پر اضافہ جائز ہے تو پھر دین میں کمی کرنا بھی جائز ہونا چاہیے۔ اگر اضافے کے اسباب اہمیت رکھتے ہیں تو کمی کے اسباب بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ دین میں اس طرح من مانی کرنے سے دین کا کس طرح حلیہ بگڑے گا جیسا کہ بگڑ رہا ہے، اس کا آپ آسانی سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس وقت بھی دین کو، اضافہ کرنے والوں نے لہو ولعب اور کھیل تماشا بنادیا ہے، اگر کمی بھی شروع کر دی گئی جو کہ اضافے کے جواز کا منطقی نتیجہ ہے تو دین سراسر بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔

سادساً: بدعت حسنہ کا مطلب، دین میں بگاڑ اور تحریف ہے، اس لیے کہ آئے دن نئی عبادت کا اضافہ کر کے اس کو بدعت حسنہ قرار دے دیا جائے جیسا کہ ہو رہا ہے اور یوں بدعات، یعنی نئی عبادات روز افزوں ہیں۔ تو اس طرح ظاہر بات ہے کہ عبادات کے اضافے سے اصل دین میں بگاڑ پیدا ہوگا۔ سابقہ دینوں میں بھی تحریف اور فساد اسی طرح پیدا ہوا تھا، اب دین اسلام کا بھی اہل بدعت نے وہی حال کر رکھا ہے جو یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے دینوں کے ساتھ کیا تھا۔ وہ تو اللہ کی مشیت چونکہ دین

اسلام کو قیامت تک محفوظ رکھنا ہے، اس لیے اس نے اس کی حفاظت کا یہ انتظام فرمایا کہ ہر دور میں ایک جماعت حقہ کو قائم رکھا جو ایک طرف خالص اور بدعات کی آمیزش سے پاک اسلام کی حفاظت کرتی اور دوسری طرف اہل بدعت کی تحریفات وتلبیسات کا پردہ چاک کرتی چلی آرہی ہے۔ پہلے یہ کام ایک نیا نبی و رسول آکر کرتا تھا، وحی و رسالت کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد اللہ نے اس کا متبادل جماعت حقہ اور طائفۂ منصورہ کو بنایا ہوا ہے جو اللہ کی مشیت سے ہر دور میں اور ہر جگہ قیامت تک موجود رہے گی، عَلٰى رَغْمِ أُنُوفِ الْمُبْتَدِعِينَ وَالْمُحَرِّفِينَ.

اہل بدعت کے استدلالات و مغالطات کا جائزہ

1 مَارَآهُ الْمُسْلِمُونَ حَسَناً...... سے استدلال؟

اہل بدعت درج ذیل موقوف روایت سے استدلال کرتے ہیں:

«مَارَآهُ الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا، فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ وَمَا رَآهُ الْمُسْلِمُونَ سَيِّئًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ سَيِّءٌ»

یہ اثر مسند احمد (379/1) اور دیگر بعض کتب میں ہے جس کی تفصیل شیخ البانی رحمہ اللہ کی ''الضعیفة'' (17/2) میں اور ان کے فاضل شاگرد شیخ سلیم الہلالی کی ''البدعة'' (ص: 52-57) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اس اثر (موقوف روایت) کا مطلب ہے کہ ''جس عمل کو مسلمان حسن سمجھیں، وہ عنداللہ بھی حسن ہے اور جس عمل کو مسلمان برا سمجھیں، وہ اللہ کے ہاں بھی برا ہے۔''

اس سے استدلال کرتے ہوئے یہ حضرات کہتے ہیں کہ جس نئے عمل کو مسلمان اچھا

سمجھ کر اپنا لیں وہ بدعت حسنہ ہے۔ اور اس اثر کو وہ حدیث رسول باور کراتے ہیں۔

لیکن اول تو یہ مرفوع حدیث نہیں ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کا فرمان نہیں ہے۔ بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے، لہٰذا ان قطعی نصوص کے مقابلے میں اسے پیش کرنا درست نہیں، جن میں نبی ﷺ کا یہ ارشاد بھی منقول ہے: «كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ» ''ہر بدعت گمراہی ہے۔''

اور اگر بالفرض اسے قابل استدلال سمجھا جائے تو پھر اس سے مراد اجماع صحابہ ہے، سو ابن مسعود کے نزدیک المسلمون سے مراد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، یعنی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا جس بات پر اجماع ہو جائے، وہ یقیناً عنداللہ بھی حسن ہوگی کیونکہ صحابۂ کرام کا کسی بھی غلط کام پر اجماع نہیں ہوسکتا، جیسے صحابۂ کرام نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع کیا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن پر مامور فرمایا۔ مانعین زکاۃ سے قتال کیا وغیرہ۔ یہ سارے امور ایسے ہیں کہ اولاً صحابہ نے توقف اور اختلاف کا اظہار کیا جیسا کہ تاریخ میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں لیکن پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے موقف سے سب متفق ہو گئے اور مذکورہ امور پر سب کا اجماع ہوگیا۔

صحابۂ کرام کا اجماع کیوں حجت شرعیہ ہے؟ اس لیے کہ ایک تو وہ رسول اللہ ﷺ کے براہِ راست فیض یافتہ تھے، اس صحبت و تربیت نبوی سے وہ صراطِ مستقیم کے منہج کو صحیح طور پر سمجھ گئے تھے اور اس فہم صحیح نے انھیں اتباعِ رسول کے جذبے میں پختہ تر کر دیا تھا، چنانچہ اسی زیر بحث اثر میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

«ثُمَّ نَظَرَ فِي قُلُوبِ الْعِبَادِ بَعْدَ قَلْبِ مُحَمَّدٍ ﷺ فَوَجَدَ قُلُوبَ أَصْحَابِهِ خَيْرَ قُلُوبِ الْعِبَادِ، فَجَعَلَهُمْ وُزَرَاءَ نَبِيِّهِ، يُقَاتِلُونَ عَلَى

دِينِهِ، فَمَا رَأَى الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ، وَمَا رَأَوْا سَيِّئًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ سَيِّءٌ»

''محمد ﷺ کا قلب مبارک دیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دل دیکھے تو تمام بندوں کے دلوں سے اصحاب محمد کے دلوں کو سب سے بہتر پایا، پس ان کو اللہ نے اپنے نبی کا وزیر بنا دیا، وہ اس کے دین کی خاطر لڑائیاں کرتے ہیں۔ پس (یہ) مسلمان جس چیز کو حسن خیال کریں، وہ اللہ کے ہاں بھی حسن ہوگی اور جس کو یہ برا سمجھیں، وہ اللہ کے ہاں بھی بری ہوگی۔''

اس سیاق میں اس اثر کی صحیح حیثیت بھی سامنے آجاتی ہے اور صحابہ، حق کا معیار اور کسوٹی کیوں قرار پائے؟ اس کی وجہ بھی واضح ہوجاتی ہے۔

دوسری وجہ اجماعِ صحابہ کے حجتِ شرعیہ ہونے کی یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا دور اسلام کا بہترین دور ہے، زبانِ رسالت نے اسے خیر القرون سے تعبیر فرمایا ہے، اس لیے یہ دور بدعات سے اور دیگر شرور وفتن سے محفوظ تھا۔ اس دور کے مسلمان نہ بدعت کا تصور کر سکتے تھے اور نہ کسی بدعت پر وہ متفق ہوسکتے تھے۔ دین میں ذرا سا بھی انحراف اور اتباعِ رسول سے بال برابر بھی ہٹنا ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ اس میں کتنی دینی غیرت اور اتباعِ رسول کا کیسا عظیم جذبہ ہے؟ فرماتے ہیں:

«يُوشِكُ أَنْ تَنْزِلَ عَلَيْكُمْ حِجَارَةٌ مِّنَ السَّمَاءِ، أَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَتَقُولُونَ: قَالَ أَبُوبَكْرٍ وَعُمَرُ»

''قریب ہے کہ تم پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوجائے، میں کہتا ہوں:

رسول اللہ ﷺ نے (اس طرح) فرمایا ہے اورتم (اس کے مقابلے میں) کہتے ہو: ابوبکر وعمر نے (اس طرح) کہا۔''[1]

تیسری وجہ اجماعِ صحابہ کے حجت ہونے کی خود رسول اللہ ﷺ کے فرامین ہیں، جن میں آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اقتدا کرنے کا حکم دیا ہے جو پہلے گزر چکے ہیں۔ اور چوتھی وجہ اللہ تعالیٰ کا صحابہ کے ایمان کو معیارِ ایمان قرار دینا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:﴿ فَإِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ﴾[2] ﴿ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ﴾[3]

دورِ خیر القرون کے بعد کے مسلمان ان خوبیوں سے محروم ہوگئے جن کی وجہ سے صحابہ کو ایک خاص شرف و امتیاز اور درجۂ فضیلت حاصل ہوا، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ.

بنا بریں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہی کا دور تاریخ اسلام کا وہ سنہری دور ہے جس کے اجماع کو حجتِ شرعیہ اوراس سے انحراف کو کفر و ضلالت قرار دیا جاسکتا ہے اورایسا کہنا دلائل شرعیہ کے عین مطابق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ ﴾

''ہدایت کے واضح ہوجانے کے بعد جو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرتا اور مومنوں کا راستہ چھوڑ کر کسی اور کی پیروی کرتا ہے تو ہم اس کو اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرتا ہے اوراسے جہنم میں داخل کریں گے اور یہ بہت برا ٹھکانا ہے۔''[4]

[1] إعلام الموقعين: 539/3 بہ تحقیق أبي عبيرة، دار ابن الجوزي. [2] البقرة 137:2. [3] البقرة 13:2. [4] النسآء 115:4.

قرآن کریم کی اس آیت میں بھی مومنین سے مراد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، ان کی پیروی کو نجات کا اور اس سے انحراف کو جہنم کا ذریعہ بتلایا گیا ہے۔ اس آیت سے بھی اجماعِ صحابہ کی حجیت کا اثبات ہوتا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ قول مرفوع حدیث نہیں بلکہ ان کا اپنا قول ہے جس میں انھوں نے اجماع صحابہ کی وہ شرعی حیثیت واضح کی ہے جو دوسرے دلائل سے بھی ثابت ہے، اس لیے اس میں بیان کردہ حقیقت صحیح ہے اور وہ صحابۂ کرام تک محدود ہے، بعد کے مسلمانوں کی اکثریت ان خوبیوں سے متصف نہیں رہی، اس لیے ان کا قول و عمل بھی قابل اعتبار نہیں رہا، وہ صحیح منہج سے بھی دور ہوگئی اور اتباع کے بجائے ابتداع کا راستہ اس نے اختیار کرلیا۔ علاوہ ازیں اس کے تقلیدی سلسلوں اور اکابر پرستی نے اس کے لیے اتحاد و اتفاق کی تمام راہیں بھی مسدود کردی ہیں، وہ کسی ایک بات پر کس طرح متفق ہوسکتی ہے؟ چنانچہ دیکھ لیجیے، دین کے نام پر جتنی بدعات رائج ہیں، ان کی اکثریت کی حیثیت علاقائی ہے، یعنی ہر علاقے اور ملک میں الگ الگ بدعات اور الگ الگ صورتیں ہیں۔ کیا کسی ایک بدعت پر بھی عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے؟ اس صورت میں کوئی بدعت، حسنہ کس طرح ہوسکتی ہے؟ اور یہ نام نہاد مسلمان کس طرح عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کا مصداق ہو سکتے ہیں؟

”بدعات حسنہ“ نے دین کو فائدہ پہنچایا ہے یا شدید نقصان؟

علاوہ ازیں یہ بدعات جن کو یاران سرپل بدعات حسنہ باور کرانا چاہتے ہیں، دینی لحاظ سے ان کا جائزہ لیجیے کہ کیا وہ دین کے لیے مفید رہی ہیں یا ہیں یا دین کو انھوں

نے سخت نقصان پہنچایا ہے؟

جیسے تقلید کی بدعت ہے، جس کو فرض و وجوب کا درجہ دیا ہوا ہے، حالانکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ﴾ ''انھوں نے دین کے نام پر بہت سی چیزیں ایسی مقرر کر لیں جن کا حکم اللہ نے نہیں دیا۔''[1] کی مصداق ہے۔ اس تقلید نے امت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ ان کے درمیان اتحاد و اتفاق کی راہیں ہمیشہ کے لیے بند کر دیں، اللہ اور اس کے رسول سے ناتا تڑوا کر غیر معصوم اُمتیوں کے ساتھ ان کو جوڑ دیا اور ان کو مقام نبوت و عصمت پر فائز کروا دیا، قرآن و حدیث میں ظاہری و باطنی (معنوی) تحریفات کی شوخ چشمانہ جسارت کا حوصلہ ان کے اندر پیدا کیا اور متعدد قباحتیں اور خرابیاں ہیں جو تقلید ناسدید کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ کیا اس سب کے باوجود اس بدعت تقلید کو ''بدعت حسنہ'' یا ''فرض و واجب'' تسلیم کر لیں؟ نہیں، یقیناً نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝﴾[2]

بدعتِ میلاد کو دیکھ لیجیے، اس نے بھی کتنی قیامتیں ڈھائی ہیں۔ اس بدعت نے یہود و نصاریٰ کی طرح دین کو لہو و لعب بنا دیا۔ فرائض و سنن سے یکسر غافل کر کے عوام کو خرافات میں الجھا دیا ہے اور اسراف و تبذیر کے شیطانی کام کو مستحسن و پسندیدہ قرار دے دیا ہے۔ اور اس طرح کی دیگر متعدد خرابیاں ہیں جو ''جشن میلاد'' کے نتیجے میں معاشرے میں ظہور پذیر ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔

یہی حال دیگر بدعات کا ہے کہ ان سے اسلام کے اصل احکام و فرائض فراموش ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ خود ساختہ رسومات اور خانہ ساز عبادات اہم تر ہو رہی ہیں،

[1] الشوریٰ 21:42. [2] الکھف 5:18.

اسی لیے ایک جلیل القدر تابعی کا قول ہے:

«مَا ابْتَدَعَ قَوْمٌ بِدْعَةً فِي دِينِهِمْ إِلَّا نُزِعَ مِنْ سُنَّتِهِمْ مِثْلُهَا»

''جو قوم بھی اپنے دین میں کوئی بدعت ایجاد کرتی ہے تو اس کی مثل اس سے ان کی سنت چھین لی جاتی ہے۔''[1]

یعنی اصل اہمیت سنت کے بجائے بدعت کی ہو جاتی ہے، اس لیے سنت پر عمل تو متروک ہو جاتا ہے لیکن بدعت پر عمل نہایت سختی اور پابندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہی بات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابی سے بھی منقول ہے، فرماتے ہیں:

«مَا مِنْ عَامٍ إِلَّا تَظْهَرُ فِيهِ بِدْعَةٌ وَتَمُوتُ فِيهِ سُنَّةٌ حَتّٰى تَظْهَرَ الْبِدَعُ وَتَمُوتَ السُّنَنُ»

''کوئی سال ایسا نہیں ہے کہ جس میں بدعت ظاہر اور سنت فوت نہ ہو، یہاں تک کہ بدعات کا غلبہ ہوا جاتا ہے اور سنتیں ناپید ہوئی جاتی ہیں۔''[2]

اس کا مطلب بھی وہی ہے کہ جہاں بھی بدعات کا ظہور ہوتا ہے تو سنتیں وہاں سے مفقود ہو جاتی ہیں، اسی لیے شیطان کو بدعت، معصیت سے زیادہ پسند ہے جیسا کہ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کا قول ہے:

«اَلْبِدْعَةُ أَحَبُّ إِلٰى إِبْلِيسَ مِنَ الْمَعْصِيَةِ، اَلْمَعْصِيَةُ يُتَابُ مِنْهَا وَالْبِدْعَةُ لَا يُتَابُ مِنْهَا»

''بدعت، شیطان کو معصیت سے زیادہ محبوب ہے کیونکہ معصیت سے توبہ کا امکان رہتا ہے جبکہ بدعت سے توبہ کرنے کا احساس ہی پیدا نہیں ہوتا۔''[3]

[1] سنن الدارمي: 44/1. [2] كتاب الحوادث والبدع، ص: 4. [3] مسند ابن الجعد، فقرہ: 1809.

اسی بات کو ایک حدیث میں بھی بیان کیا گیا ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ حَجَبَ (حجز) التَّوْبَةَ عَنْ كُلِّ صَاحِبِ بِدْعَةٍ»

''ہر بدعتی کے لیے اللہ نے توبہ کا دروازہ بند کر دیا ہے۔''[1]

بہر حال حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے زیر بحث قول میں ''المسلمون'' سے مراد صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں، یعنی ان کا کسی دینی امر میں اجماع و اتفاق ایسا ہے کہ وہ دین میں حجت ہے، یا پھر اس اثر میں اس عمل کی حجیت کی طرف اشارہ ہے جس کی بابت قرآن و حدیث میں کوئی نص وارد نہیں، نیز شریعت کی کسی اصل سے بھی وہ متصادم نہیں، عبادات سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں اور عقل سلیم بھی اس کو قبول کر لے تو ایسا عمل مستحسن ہو سکتا ہے۔

2 مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً...... سے استدلال؟

اہل بدعت، بدعات سازی کے جواز میں اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهُ كُتِبَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا، وَلَا يُنْقَصُ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْءٌ، وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً، فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهُ، كُتِبَ عَلَيْهِ مِثْلُ وِزْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا يُنْقَصُ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ»

''جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کیا، پھر اس کے بعد اس پر عمل کیا گیا تو اس کو اس شخص کی مثل اجر ملے گا جس نے اس پر عمل کیا، ان کے اجر

[1] المعجم الأوسط للطبراني: 113/5، حديث: 4214، والسلسلة الصحيحة: 154/4، حديث: 1620.

میں سے کوئی کمی نہیں ہوگی اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ ایجاد کیا، پھر اس کے بعد اس پر عمل کیا گیا تو اس پر اس کی مثل گناہ کا بوجھ پڑے گا جس نے اس پر عمل کیا، ان کے بوجھوں میں سے کوئی کمی نہیں ہوگی۔‘‘[1]

اس حدیث سے ان کے استدلال کی بنیاد سَنَّ کا لفظ ہے جو اختراع (ایجاد کرنے) کے معنی میں آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں اچھے طریقے کی ایجاد کو اجر و ثواب کا باعث قرار دیا گیا ہے لیکن یہ استدلال متعدد وجوہ سے غلط ہے۔

قرآن کریم یا حدیث کے کسی ایک لفظ سے ان کے محض لغوی معنی کی بنیاد پر استدلال گمراہانہ اور اہل باطل کا طریقہ ہے۔ اس کے برعکس اہل سنت والجماعت کا طریق استدلال مجموعی تعلیمات کی روشنی میں آیت یا حدیث کا مفہوم سمجھنا ہے۔ اس کے لیے اگر کسی جگہ لغوی مفہوم سے انحراف بھی کرنا پڑے، یا اس کے کئی معنوں میں سے ایک معنی لینا پڑے تو ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی آیت یا حدیث سے ایسا استدلال جو دوسری کسی آیت یا حدیث سے متصادم ہو، یہ بھی اہل باطل کا طریقہ ہے، اہل سنت یہ بھی نہیں کرتے بلکہ ایسا مفہوم مراد لیتے ہیں جو دوسری آیت یا حدیث کے ظاہری ٹکراؤ کو ختم کر دیتا ہے۔

اس کی متعدد مثالیں ہیں لیکن یہاں ہم بات کو سمجھانے کے لیے ایک آیت اور ایک حدیث کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں طلاق کا مسئلہ بیان ہوا ہے: ﴿اَلطَّلٰقُ مَرَّتٰنِ﴾[2]

یعنی جس طلاق میں رجوع ہو سکتا ہے، وہ دو مرتبہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص مختلف اوقات میں دو مرتبہ طلاق دے کر رجوع کر چکا ہو اور پھر تیسری مرتبہ طلاق دے دے

[1] صحیح مسلم، العلم، باب من سن......، حدیث: 1017، بعد الحدیث:2673. [2] البقرۃ2:229.

تو قرآن میں ایسے شخص کے لیے کہا گیا ہے:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ط﴾

''جس عورت کو، اس کا خاوند (تیسری) طلاق بھی دے دے تو اب اس عورت کا اس مرد کے ساتھ نکاح جائز نہیں یہاں تک کہ وہ کسی اور مرد سے نکاح کرے۔''[1]

اس کا مطلب احادیث کی روشنی میں یہ ہے کہ ایسی مطلقہ ثلاثہ عورت کسی اور شخص سے آباد رہنے کی نیت سے نکاح کرے، پھر اتفاق سے وہ مر جائے یا وہ اس کو طلاق دے دے۔ تو اس عورت کا پہلے خاوند سے نکاح کرنا جائز ہوگا۔ یہ قرآن کریم کی اس آیت کا وہ صحیح مفہوم ہے جو دیگر دلائل کو سامنے رکھ کر متعین کیا گیا ہے اور اہل حق کے ہاں مسلمہ ہے۔

لیکن دو گروہوں نے دیگر دلائل شرعیہ و حدیثیہ سے گریز کر کے ﴿حَتّٰى تَنْكِحَ﴾ (نکاح) کے صرف لغوی معنی کو سامنے رکھ کر نہایت غلط موقف اختیار کیا ہے۔ ایک نے کہا: اگر ایسی عورت کسی مرد سے نکاح کر لیتی ہے، اس سے تعلق زوجیت قائم نہیں کرتی اور اس کو طلاق ہو جاتی ہے تو اس عورت کا پہلے خاوند کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا جائز ہے۔ (یہ موقف فراہی گروہ، جس کو غامدی گروہ بھی کہا جا سکتا ہے، نے اختیار کیا ہے جو حدیث کو قطعاً اہمیت نہیں دیتا۔ ملاحظہ ہو تفسیر ''تدبر قرآن'' زیر تحت آیت مذکورہ۔)

یہ مطلب نکاح کے ظاہری اور لغوی معنی کے اعتبار سے تو صحیح ہے لیکن دیگر دلائل شرعیہ کی روشنی میں یکسر غلط ہے کیونکہ حدیث کی رو سے یہاں نکاح صرف ایجاب وقبول کے معنی میں نہیں ہے بلکہ وطی (ہم بستری) کے معنی میں ہے، اس لیے

[1] البقرۃ 2:230.

جب تک دوسرا خاوند نکاح کے بعد اس عورت سے خلوت صحیحہ اختیار نہیں کرتا اور دونوں ایک دوسرے کا مزہ نہیں چکھ لیتے، اس وقت تک پہلے خاوند سے اس کا نکاح صحیح نہیں ہوسکتا جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو تیسری طلاق بھی دے دی تو ان کی مطلقہ نے دوسرے شخص سے نکاح کرلیا اور صرف نکاح کے بعد (ہم بستری کے بغیر) دوبارہ پہلے خاوند حضرت رفاعہ کے ساتھ نکاح کرنا چاہا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہیں دی اور اس عورت سے فرمایا:

«لَا، حَتّٰى تَذُوقِي عُسَيْلَتَهٗ وَيَذُوقَ عُسَيْلَتَكِ»

''یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک تو اس کا مزہ اور وہ تیرا مزہ نہ چکھ لے۔''[1]

ایک دوسرے گروہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ مطلقۂ ثلاثہ اگر کسی مرد سے شرط کرکے صرف ایک دو راتوں کے لیے نکاح کرلے اور پھر اس سے طلاق لے کر (عدت گزارنے کے بعد) پہلے خاوند سے نکاح کرلے تو بغرض تحلیل یہ مشروط نکاح جائز ہے۔ یہ وہی حلالہ ہے جس کا فتویٰ علمائے احناف دیتے ہیں، ان کا استدلال بھی لفظ نکاح کے ظاہری ولغوی معنی سے ہے، حالانکہ حدیث رسول کی رو سے اسلام میں اس مروجہ حلالے کی کوئی حیثیت نہیں، اس طرح مشروط نکاح نہیں ہوتا، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سخت وعید بیان فرمائی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

«لَعَنَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُحِلَّ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ»

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے،

[1] صحيح البخاري، الطلاق، باب إذا طلقها ثلاثاً ثُم تزوجت بعد العدة زوجاً غيره فلم يمسها، حديث: 5317، وصحيح مسلم، النكاح، باب لا تحل المطلقة ثلاثا......، حديث: 1433.

دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔''[1]

ایک دوسری حدیث میں حلالہ کرنے والے شخص کو رسول اللہ ﷺ نے «اَلتَّيْسُ الْمُسْتَعَارُ» ''کرائے کا سانڈ'' قرار دیا ہے۔[2]

ان احادیث کی رو سے حلالے والا نکاح، نکاح نہیں، متعے کی طرح بدکاری ہے، اسی لیے اس کو لعنتی فعل قرار دیا گیا ہے۔ اگر یہ واقعی نکاح ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس کے مرتکبین پر لعنت نہ فرماتے، یہی وجہ ہے کہ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے حلالے کی نیت سے کسی عورت سے نکاح کیا لیکن پھر اس کی نیت بدل گئی اور وہ چاہتا ہے کہ اس کو طلاق دینے کے بجائے اپنے گھر ہی میں آباد رکھے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے بلکہ اگر وہ اس کو رکھنا چاہتا ہے تو نیا نکاح کرے اور پھر اس کو رکھے۔[3]

اس کا صاف مطلب ہے کہ بغرض حلالہ نکاح، نکاح نہیں سَفاح (بدکاری) ہے، چنانچہ حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حلالے کا مشروط نکاح زنا کاری ہے۔

حضرت نافع بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور پوچھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو تین طلاقیں (الگ الگ) دے دیتا ہے، پھر ایک شخص اس عورت سے اس غرض سے نکاح کر لیتا ہے تاکہ وہ اس کو اپنے بھائی کے لیے حلال کر دے۔ «هَلْ تَحِلُّ لِلْأَوَّلِ؟» ''کیا اس طریقے سے وہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے گی؟'' انھوں نے فرمایا: «لَا، إِلَّا نِكَاحَ رَغْبَةٍ»

[1] جامع الترمذي، النكاح، باب ماجاء في المحل والمحلل له، حديث: 1120. [2] سنن ابن ماجه، النكاح، باب المحلل ......، حديث: 1936. [3] جامع الترمذي، النكاح، باب ماجاء في المحل والمحلل له، حديث: 1120.

''نہیں، رغبت والے (آباد ہونے کی نیت والے) نکاح کے بغیر حلال نہیں ہوگی۔''

نیز فرمایا:

«كُنَّا نَعُدُّ هٰذَا سَفَاحًا عَلٰى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ»

''ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایسے نکاح کو زنا کاری سمجھتے تھے۔'' [1]

مذکورہ دونوں موقف اسی لیے غلط ہیں کہ ان دونوں گروہوں نے صرف نکاح کے لغوی معنی کو سامنے رکھا ہے اور شریعت کی دوسری نصوص کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس سے اسی بات کا اثبات ہوتا ہے کہ کسی بھی آیت یا حدیث سے استدلال کرتے وقت دوسری نصوص شریعت کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے، اس کے بغیر کسی آیت یا حدیث سے استدلال سراسر گمراہی ہے۔

اس مسلمہ طرز استدلال کی روشنی میں مَنْ سَنَّ میں سَنَّ، جو استنان سے ہے، اِخْتَرَعَ اور اِبْتَدَعَ کے معنی میں نہیں ہے کہ جس نے اسلام میں کوئی نیا کام نکالا ، نیا طریقہ ایجاد کیا تو اس نے اچھا کیا، یعنی بدعتِ حسنہ کی ایجاد اچھا فعل ہے جیسا کہ اہل بدعت اس کا یہی مفہوم لے کر بدعت حسنہ کا جواز بیان کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے معنی ہیں کہ اس نے ایسے عمل میں پہل کی جو شریعت سے ثابت ہے یا کسی ایسی جگہ پر اس عمل کو سرانجام دیا کہ وہاں پہلے لوگوں کو اس کا علم نہیں تھا، اس کے کرنے پر لوگوں کو ترغیب ملی اور انھوں نے بھی اس کو اختیار کر لیا۔ یا کسی جگہ کوئی سنت متروک تھی، کسی ایک شخص کے عمل کرنے پر دوسرے لوگوں نے بھی اس سنت کو اپنا لیا، ان تمام صورتوں میں کسی بھی ثابت شدہ نیک عمل کا آغاز کرنے والے، سنت متروکہ

[1] المستدرك للحاكم: 2/199. اس کی سند صحیح ہے، دیکھیے : إرواء الغليل: 6/311.

کو زندہ کرنے والے اور فراموش شدہ نیکیوں کو یاد کرانے والے کو ان تمام لوگوں کے عمل کا اجر بھی ملے گا جو اس کے بعد ان پر عمل کریں گے۔ اسی طرح کسی نے اس کے برعکس برائی میں پہل کی یا اس کا کسی جگہ آغاز کیا تو بعد میں اس کو دیکھ کر برائی کے مرتکبین کے گناہوں کا بوجھ بھی اس پہل کرنے یا آغاز کرنے والے کو ملے گا۔ اس مفہوم کی تائید درج ذیل وجوہ سے ہوتی ہے:

اولاً: اس فرمان رسول «مَنْ سَنَّ ......» کے سیاق اور پس منظر سے یہ مفہوم بالکل واضح ہے، آپ ﷺ نے یہ ارشاد اس موقع پر فرمایا تھا جب کچھ اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے جن پر تنگ دستی اور ضرورت مندی کے آثار ظاہر تھے تو آپ نے ان کی یہ حالت دیکھ کر لوگوں کو صدقے کی ترغیب دی تاکہ ان کی کچھ مدد ہو سکے لیکن لوگوں نے اس معاملے میں تساہل اور سستی کا مظاہرہ کیا جس کے اثرات آپ کے چہرے پر نظر آ رہے تھے، پھر ایک انصاری چاندی کی ایک تھیلی لایا، پھر دوسرا آیا حتیٰ کہ پھر ایک قطار لگ گئی، یہ دیکھ کر آپ کا چہرۂ مبارک خوشی سے چمک اٹھا تو آپ نے فرمایا: ''جس نے اسلام میں اچھا طریقہ نکالا، پھر اس کے بعد اس پر عمل کیا گیا......''[1]

اس سیاق میں ''اچھا طریقہ نکالنے'' سے مراد بدعت کی ایجاد نہیں بلکہ اسلام میں ثابت شدہ مسئلے میں پہل کرنا ہے جس سے لوگوں کو ترغیب ملے۔

صدقہ کرنا اچھا عمل ہے، اسلام نے اس کی ترغیب دی ہے۔ اس انصاری صحابی نے صدقہ کرنے میں پہل کی تو نبی ﷺ نے اس کو اچھا طریقہ نکالنے سے تعبیر فرمایا، اس لیے کہ دوسرے لوگ اس میں متأمل تھے، اس کو دیکھ کر دوسروں کو ترغیب ملی اور وہ

[1] صحیح مسلم، العلم، باب من سَنّ ......، حدیث: 1017 قبل الحدیث:2674.

بھی صدقہ کرنے لگے۔ آپ کے اس فرمان سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ اسلام میں نئی نئی باتیں ایجاد کرنے کی اجازت دے رہے ہیں۔

ثانیاً: ایک اور حدیث میں آتا ہے جس میں آپ نے فرمایا:

«مَنْ دَعَا إِلٰى هُدًى، كَانَ لَهٗ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُورِ مَنْ تَبِعَهٗ، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئًا، وَمَنْ دَعَا إِلٰى ضَلَالَةٍ، كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ تَبِعَهٗ، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا»

''جس نے کسی کو ہدایت کی طرف بلایا تو اس کو ان لوگوں کی مثل اجر ملے گا جو اس ہدایت کے راستے کو اختیار کریں گے، ان میں سے کسی کے اجر میں یہ امر کمی نہیں کرے گا اور جس نے کسی کو گمراہی کی طرف بلایا تو اس پر ان تمام لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی ہوگا جو اس برائی کو اختیار کرنے والے ہوں گے، یہ امر ان میں سے کسی کے گناہوں میں کمی نہیں کرے گا۔'' [1]

یہ حدیث «مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً» کے ہم معنی ہے۔ ان دونوں کو سامنے رکھ کر ان کا مفہوم و مطلب متعین کیا جائے گا، اسی لیے ان کو ایک ہی باب میں ذکر کیا گیا ہے اور باب کا پورا عنوان ہے: «بَابُ مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْ سَيِّئَةً وَمَنْ دَعَا إِلٰى هُدًى أَوْ ضَلَالَةٍ» ''اس کا بیان جس نے کوئی اچھا یا برا طریقہ نکالا اور اس کا جس نے ہدایت یا گمراہی کی طرف بلایا۔''

اس باب سے اور اس میں دونوں حدیثیں ذکر کر کے امام صاحب نے یہ مفہوم سمجھا دیا کہ سنت حسنہ نکالنے سے مراد ہدایت کی طرف بلانا ہے اور سنت سیئہ نکالنے کا

[1] صحيح مسلم، العلم، باب مَن سَنَّ......، حديث:2674.

مطلب گمراہی کی دعوت دینا ہے، اس لیے کہ حسنہ کیا ہے اور سیئہ کیا ہے؟ یا بالفاظ دیگر ہدایت کیا ہے اور برائی کیا ہے؟ اس کا تعین انسانی عقل نہیں کر سکتی، یہ صرف اور صرف شارع کا کام ہے۔ جب کسی بھی شخص کو، چاہے وہ کتنا بھی عالم فاضل اور دانشور و محقق ہو، یہ حق ہی حاصل نہیں ہے کہ وہ محض اپنی عقل وفہم سے کسی عمل کی بابت یہ کہہ سکے کہ یہ نیکی اور برائی ہے یا یہ ہدایت ہے اور یہ گمراہی ہے۔ یہ فیصلہ صرف نصوص شریعت اور اصول شریعت ہی کی روشنی میں کیا جائے گا۔ تو پھر کسی کو بھی دین میں نیا طریقہ ایجاد کرنے کا حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

ثالثاً: اسی لیے اہل باطل کے استدلال کے غلط ہونے کی ایک تیسری وجہ یہ ہے کہ حسنہ اور سیئہ کی وضاحت صرف اللہ یا اس کا رسول ہی کر سکتا ہے، کسی کی عقل یہ فیصلہ نہیں کر سکتی۔ بنا بریں مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً کے معنی اپنی طرف سے دین میں نیا کام نکالنے کے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اس کا مطلب لازمی طور پر ثابت شدہ سنت حسنہ کی پیروی، یا اس کا زندہ کرنا اور اس کو فروغ دینا ہی ہوگا۔

رابعاً: نبی ﷺ نے جب یہ فرما دیا: كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (ہر بدعت گمراہی ہے) پھر کوئی بھی بدعت، حسنہ کس طرح ہو سکتی ہے؟ اگر سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً کا مطلب بدعت حسنہ ایجاد کرنا ہے اور اس میں آپ نے اس کی اجازت دی ہے تو پھر آپ کا یہ فرمانا کہ ہر بدعت گمراہی ہے، کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟ پھر تو یہ دونوں حدیثیں ایک دوسرے سے متصادم ٹھہریں گی، ایک میں بدعت سازی کی اجازت ہے اور دوسری میں ممانعت۔ کیا فرمان رسول ﷺ میں یہ تضاد اور تصادم ہو سکتا ہے؟ یقیناً نہیں ہو سکتا۔ احادیث رسول میں باہم تضاد یا تصادم نہیں، یہ محض لوگوں کا حزبی تعصب اور بدعت سازی کا شوق فراواں ہے جس کی وجہ سے وہ احادیث رسول کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے

بجائے ان میں تضاد پیدا کر رہے ہیں۔ هَدَاهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی .

بہر حال زیر بحث الفاظِ حدیث مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً سے مراد سنت متروکہ کا احیا یا کسی امر مشروع کا اِجرا یا کسی عمل صالح کا ایسی جگہوں پر نفاذ ہے جہاں لوگ اس کو فراموش کیے ہوئے ہوں اور اس کی تجدید و یاد دہانی سے لوگ اس پر عمل شروع کر دیں، یا جیسے کسی مسلمان گھرانے میں، مثلاً: پردے کا رواج ختم ہوگیا ہو، کسی اللہ کے بندے کی کوشش سے وہاں کی خواتین پھر پردے کا اہتمام شروع کر دیں، یا حکمران اور حکام اعلیٰ اپنے اپنے دائرۂ اثر و اقتدار میں دینی امور کی تنفیذ کریں اور پھر لوگ ان پر عمل کرنا شروع کر دیں، وَعَلٰی هٰذَا الْقِيَاسِ اس قسم کی دیگر صورتیں جن سے مقصود لوگوں کے اندر دین کا شوق اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا کرنا ہو۔ ان مساعیٔ حسنہ کے نتیجے میں جو لوگ ہدایت کا راستہ اپنائیں گے، بدعات چھوڑ کر سنت پر عمل کریں گے، بے دینی اور بدعملی والی زندگی کے بجائے متقیانہ زندگی اختیار کریں گے، ان کا اجر ان کو تو ملے گا ہی لیکن جو شخص ان کی ہدایت کا ذریعہ بنے گا، اس کو بھی ان سب کا اجر ملے گا۔ اسی طرح جو کسی برائی کا سبب بنے گا تو اس کی جهد و کاوش سے جتنے لوگ بھی اس برائی کا راستہ اپنائیں گے، ان سب کے گناہ میں اس برائی کی طرف رہنمائی کرنے والا بھی برابر کا شریک ہوگا۔

یہ اس حدیث مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْ سَيِّئَةً کا وہ صحیح مفہوم ہے جو دیگر دلائل شرعیہ کے موافق اور ہم معنی ہے، اس میں اتباع شریعت، تنفیذِ شریعت اور ترغیب شریعت کا بیان ہے نہ کہ (نعوذ باللہ) شریعت سازی اور متوازی دین گھڑنے کی اجازت جیسا کہ اہل بدعت اس سے یہ جواز کشید کرنے کی مذموم سعی کرتے ہیں۔ هَدَاهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی .

چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ بھی دونوں حدیثیں (مَنْ سَنَّ ...... اور مَنْ دَعَا إِلٰی هُدًی ......) بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

«مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً» اَلْحَدِيثَ وَفِي الْحَدِيثِ الْآخَرِ «مَنْ دَعَا إِلٰی هُدًی وَمَنْ دَعا إِلٰی ضَلَالَةٍ» هٰذَانِ الْحَدِيثَانِ صَرِيحَانِ فِي الْحَثِّ عَلَى اسْتِحْبَابِ سَنِّ الْأُمُورِ الْحَسَنَةِ وَتَحْرِيمِ سَنِّ الْأُمُورِ السَّيِّئَةِ، وَأَنَّ مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِ كُلِّ مَنْ يَّعْمَلُ بِهَا إِلٰی يَوْمِ الْقِيٰمَةِ، وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ مِثْلُ وِزْرِكُلِّ مَنْ يَّعْمَلُ بِهَا إِلٰی يَوْمِ الْقِيٰمَةِ، وَأَنَّ مَنْ دَعَا إِلٰی هُدًی كَانَ لَهُ مِثْلُ أُجُورِ مُتَابِعِيهِ أَوْإِلٰی ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِثْلُ آثَامِ تَابِعِيهِ، سَوَاءٌ كَانَ ذٰلِكَ الْهُدٰی وَالضَّلَالَةُ هُوَ الَّذِي ابْتَدَأَهُ أَمْ كَانَ مَسْبُوقًا إِلَيْهِ وَسَوَاءٌ كَانَ ذٰلِكَ تَعْلِيمَ عِلْمٍ أَوْ عِبَادَةٍ أَوْ أَدَبٍ أَوْ غَيْرِ ذٰلِكَ»

”حديث من سن سنة حسنة ...... اور حديث من دعا إلى هدى...... یہ دونوں حدیثیں اس امر کی ترغیب میں صریح ہیں کہ امور حسنہ کا جاری کرنا مستحب اور امور سیئہ کے طریقے ایجاد کرنا حرام ہے اور جس نے کوئی اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کو ان تمام لوگوں کی مثل اجر ملے گا جو قیامت تک اس پر عمل کریں گے اور جس نے کوئی برا طریقہ ایجاد کیا تو اس پر ان تمام لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی ہوگا جو قیامت تک اس پر عمل کریں گے اور جس نے ہدایت کی طرف بلایا تو اس کو ان تمام لوگوں کی مثل اجر ملے گا جو اس ہدایت

کی پیروی کریں گے اور جس نے گمراہی کی طرف بلایا تو اس پر ان تمام لوگوں کے گناہوں کا بھی بوجھ ہوگا جو اس گمراہی کی پیروی کریں گے، چاہے وہ ہدایت اور گمراہی ایسی ہو کہ سب سے پہلے (اس جگہ پر) اسی نے اس کا آغاز کیا ہو، یا وہ ایسی ہو کہ پہلے بھی اس کا ارتکاب کرنے والے موجود ہوں، اس طرح چاہے اس کا تعلق علم سکھانے، عبادت سکھانے یا ادب وغیرہ سکھانے سے ہو۔''[1]

3 ''نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ'' سے استدلال؟

اہل بدعت، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے بھی استدلال کرتے ہیں جو قیامِ لیل باجماعت کے بارے میں انھوں نے فرمایا تھا کہ ''یہ بدعت اچھی ہے۔''

لیکن یہ استدلال بھی باطل ہے، اس لیے کہ رمضان المبارک کا یہ قیام اللیل، جسے بعد میں تراویح کہا جانے لگا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، آپ نے صحابۂ کرام کے ساتھ باجماعت تین راتیں قیام فرمایا، چوتھی رات کو بھی صحابۂ کرام جمع ہوئے لیکن آپ نے ان کے ساتھ قیام نہیں فرمایا اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی:

«وَلٰكِنِّي خَشِيتُ أَنْ تُفْرَضَ عَلَيْكُمْ فَتَعْجِزُوا عَنْهَا»

''اور لیکن مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ (قیامِ رمضان) کہیں تم پر فرض نہ کر دیا جائے اور تم اس کو ادا نہ کر سکو۔''[2]

گویا اس خطرے کے پیشِ نظر آپ نے باجماعت قیام اللیل ترک فرما دیا۔

[1] شرح النووي، العلم، باب من سن سنة......: 227,226/2 مكتبة الغزالي، دمشق. [2] صحيح البخاري، صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان، حديث: 2012، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان......، حديث: 761.

اس سے ایک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ نبی ﷺ نے خود باجماعت تراویح ادا فرمائی۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آپ اس عمل کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔

نبی ﷺ کی رحلت کے بعد فرضیت کا خطرہ ختم ہوگیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کی خواہش اور عمل کے مطابق قیام رمضان کا باجماعت اہتمام فرمادیا۔

جب صورت حال یہ ہے کہ یہ مشروع عمل ہے اور نبی ﷺ سے ثابت ہے تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ''اچھی بدعت'' کیوں کہا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدعت کا لفظ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی بھی ہیں اور شرعی معنی بھی...... لغت کے اعتبار سے ہر اچھی چیز کو، جو نادر المثل ہو، بدعت کہہ لیا جاتا ہے۔ تراویح کا یہ عمل اگرچہ بالکل نادر المثال تو نہیں تھا لیکن حضرت عمر نے اس لمبے وقفے کی وجہ سے، جس میں یہ عمل مفقود رہا، یعنی جماعت کے ساتھ اس کی ادائیگی موقوف رہی، اس کو اپنی زبان میں نعمت البدعة سے تعبیر فرمادیا۔ ظاہر بات ہے کہ یہاں یہ لفظ شرعی معنی میں نہیں ہے نہ ہو ہی سکتا ہے کیونکہ یہ سنت حسنہ ہے (جیسا کہ وضاحت گزری) سنت حسنہ کو بدعتِ حسنہ کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟

بنا بریں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول شرعی معنی میں ہے نہ ہو ہی سکتا ہے، اس لیے کہ یہ نو ایجاد عمل نہیں ہے بلکہ شریعت میں اس کی اصل موجود ہے، چنانچہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«أَكْثَرُ مَافِي هٰذَا تَسْمِيَةُ عُمَرَ تِلْكَ بِدْعَةٌ مَعَ حُسْنِهَا، وَهٰذِهِ تَسْمِيَةٌ لُغَوِيَّةٌ لَا تَسْمِيَةٌ شَرْعِيَّةٌ، وَذٰلِكَ أَنَّ الْبِدْعَةَ فِي اللُّغَةِ تَعُمُّ كُلَّ مَا فُعِلَ ابْتِدَاءً مِنْ غَيْرِ مِثَالٍ سَابِقٍ، وَأَمَّا الْبِدْعَةُ الشَّرْعِيَّةُ: فِعْلُ مَالَمْ يَدُلَّ عَلَيْهِ دَلِيلٌ شَرْعِيٌّ»

”اس کے حسن کے باوجود حضرت عمر کا اس کا نام بدعت رکھنا، لغوی طور پر ہے نہ کہ شرعی معنی کے طور پر، اس لیے کہ لغت میں بدعت کا لفظ ہر اس چیز کو شامل ہے جس کو بغیر سابق مثال کے کیا گیا ہو۔ اور بدعت شرعیہ ہر وہ عمل ہے جس کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو۔“ [1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”بدعت کی دو قسمیں ہیں: ایک بدعت شرعیہ، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ اور دوسری بدعت لغویہ، جیسے امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا تراویح کی نماز کے مستقل طور پر باجماعت اہتمام کرنے کو نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهِ کہنا۔“ [2]

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«أَمَّا مَا وَقَعَ فِي كَلَامِ السَّلَفِ مِنَ اسْتِحْسَانِ بَعْضِ الْبِدَعِ، فَإِنَّمَا ذٰلِكَ فِي الْبِدَعِ اللُّغَوِيَّةِ لَا الشَّرْعِيَّةِ، فَمِنْ ذٰلِكَ قَوْلُ عُمَرَ رضی اللہ عنہ لَمَّا جَمَعَ النَّاسَ فِي قِيَامِ رَمَضَانَ عَلٰى إِمَامٍ وَاحِدٍ فِي الْمَسْجِدِ وَخَرَجَ وَرَآهُمْ يُصَلُّونَ كَذٰلِكَ فَقَالَ: نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهِ، وَمُرَادُهُ: أَنَّ هٰذَا الْفِعْلَ لَمْ يَكُنْ عَلٰى هٰذَا الْوَجْهِ قَبْلَ هٰذَا الْوَقْتِ، وَلٰكِنْ لَهُ أَصْلٌ مِنَ الشَّرِيعَةِ يُرْجَعُ إِلَيْهَا»

”سلف کے کلام میں بعض بدعتوں کے لیے جو استحسان کا لفظ استعمال ہوا ہے تو وہ صرف بدعت لغوی کے لیے استعمال ہوا ہے نہ کہ بدعت شرعی کے لیے۔ اسی قبیل سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے جو کہ انھوں نے اس وقت

[1] اقتضاء الصراط المستقیم مخالفة أصحاب الجحیم، ص308، بتحقیق خالد عبداللطیف، طبع: 1996ء۔ [2] تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورة البقرة، آیت: 117 کے تحت۔

ارشاد فرمایا جب انھوں نے لوگوں کو رمضان کے قیام میں ایک امام کے پیچھے مسجد میں جمع کیا اور باہر نکل کر انھیں اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا: ''نعمت البدعة هذه'' (یہ اچھا طریقہ ہے) اور مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ کام اس طریقے پر اس سے پہلے نہیں تھا لیکن شریعت میں اس کی اصل موجود ہے جو مرجع استدلال ہے۔''[1]

سنت اور بدعت کی پہچان ضروری ہے

اہل بدعت کے اور بھی بعض استدلالات ہیں لیکن ان کے بڑے استدلالات وہی ہیں جن کی اصل حقیقت ہم نے اللہ کی توفیق سے گزشتہ صفحات میں بیان کر دی ہے۔ مقصد اس تفصیل سے ان لوگوں کو، جو دین کی حقیقت سے ناآشنا ہیں، وہ صحیح منہج بتلانا ہے جو صحابۂ کرام کا منہج ہے جس میں ایک طرف صرف سنتوں کی پیروی کا اہتمام ہے اور دوسری طرف بدعت سازی سے مکمل اجتناب اور اہل بدعت سے نفرت و کراہت کا اظہار ہے۔

شریعتِ اسلامیہ نے جن باتوں کے کرنے کا بطورِ خاص حکم دیا ہے، ان سے تو ہماری زندگیاں عموماً خالی ہیں، نماز سے ہمیں دلچسپی نہیں۔ صداقت و راست بازی ہمارا شعار نہیں۔ امانت و دیانت سے ہمارا دامن خالی، حسنِ اخلاق سے ہم کوسوں دور اور اسی طرح دوسری اچھائیاں اور خوبیاں ہیں جن سے مسلمان کا متصف ہونا ضروری ہے لیکن ان کا کوئی پَرتَو ہماری سیرتوں میں نہیں ملتا۔ اس کے برعکس برائیاں ہمارے اندر ساری دنیا کی جمع ہوگئی ہیں۔ اور اس طرح ہماری ہڈیوں میں رچ بس اور رگ و پے

[1] جامع العلوم والحكم: 128/2، بہ تحقیق شعیب أرناؤوط، طبع: 1997ء۔

میں سرایت کر گئی ہیں کہ ہمارے جسم وخون کا وہ ''اٹوٹ انگ'' بن گئی ہیں۔

تاہم یہ برائیاں بجائے خود سخت مضر اور تباہ کن ہوتے ہوئے بھی اس لحاظ سے ضرور ''کمتر'' ہیں کہ ان برائیوں کو برائیاں ہی سمجھ کر کیا جاتا ہے انھیں حسن وخوبی نہیں کہا جاتا۔ لیکن ہماری بد اعمالیوں کی ایک قسم وہ ہے جو کسی بھی بڑے سے بڑے گناہ سے کم نہیں لیکن ان پر قبوری شریعت کے رمز شناسوں نے ''مذہب وشریعت'' کا لیبل لگا کر اس نص قرآنی کو یکسر بھلا دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۝﴾

''ان لوگوں کے لیے ہلاکت و بربادی ہے جو ایک چیز اپنے ہاتھ سے لکھ کر اسے حکمِ آسمانی باور کراتے ہیں تاکہ اس طرح قلیل معاوضہ حاصل کریں، چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے تباہی و بربادی ہے اس پر بھی جو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور اس پر بھی جو اس طرح انھوں نے کمایا۔''[1]

ایسے اعمال و افعال جن کا کوئی شرعی ثبوت نہیں اور وہ اجر وثواب کی نیت سے اور دین ہی کا حصہ سمجھ کر کیے جائیں، بدعات و محدثات کہلاتے ہیں، جو بدترین امور، سراسر گمراہی مردود اور مفضی الی النار ہیں۔

بنابریں یہ ضروری ہے کہ ہر مسلمان جو صراط مستقیم اور دین صحیح پر چلنے کا اور سعادت ابدی کا مستحق بننے کا خواہش مند ہے، وہ معاشرے میں رائج بدعات سے بھی آگاہی حاصل کرے تاکہ وہ ان سے بچ سکے اور ان کی خطرناکی و تباہی سے دوسروں کو بھی

[1] البقرة 2:79.

بچانے کی اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرے۔ سنتوں کی پابندی اور بدعات سے اجتناب یہ دونوں ہی باتیں ضروری ہیں، جیسے شرک کی نفی کے بغیر توحید کا اثبات ممکن نہیں، شر کو چھوڑے بغیر خیر کا حصول ممکن نہیں، اسی طرح بدعات کو چھوڑے بغیر سنتوں پر عمل ممکن نہیں۔

لا إله إلا الله، کلمۂ توحید میں نفی و اثبات دونوں چیزیں ہیں۔ غیر اللہ کی معبودیت کی نفی اور صرف اللہ کے معبود برحق ہونے کا اثبات "کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔" اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾

"جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا، اس نے مضبوط کڑا تھام لیا۔"[1]

تمام انبیاء کی دعوت کا محور بھی یہی دو نکتے رہے، ایک کا اثبات دوسرے کی نفی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾

"اور البتہ تحقیق ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا (اور یہی کہا) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔"[2]

نیز فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾

[1] البقرة 2:256. [2] النحل 16:36.

''اور وہ لوگ جو طاغوت کی عبادت سے بچتے اور اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں، ان کے لیے خوش خبری ہے، پس میرے ان بندوں کو خوش خبری دے دیجیے جو بات سنتے ہیں اور اس میں سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت سے نوازا ہے اور یہی لوگ اصحاب دانش ہیں۔''[1]

یہی حال سنت اور بدعت کا ہے کہ سنت کو اختیار اور بدعت سے اجتناب کیا جائے، نبی ﷺ نے اپنی امت کو اپنی وصیت میں انھی دو باتوں کی تاکید فرمائی ہے:

«فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»

''تم میری سنت کو اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت (طریقے) کو لازم پکڑنا، اس کو مضبوطی سے تھامنا اور دانتوں سے اس کو پکڑنا اور (دین میں) نئے نئے کاموں سے بچنا، اس لیے کہ (دین میں) ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''[2]

داعیانِ حق کی ذمہ داری

داعیانِ حق کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمان عوام کو توحید و سنت کی دعوت دیں اور شرک و بدعت سے اجتناب کی تلقین کریں، دعوت الی اللہ کی یہی دو بنیادیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے درج ذیل فرمان میں بھی یہی بات بیان کی گئی ہے:

﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ

[1] الزمر 39:17، 18. [2] سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، حديث: 4607.

عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ ﴾

''اور تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے اور معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔''[1]

امر بالمعروف (معروف کا حکم دینا) اس میں ہر خیر اور بھلائی آ جاتی ہے جن میں سرفہرست توحید وسنت کی دعوت ہے۔ نہی عن المنکر (منکر سے روکنا) اس میں ہر منکر (براعمل) آ جاتا ہے لیکن ان میں سب سے اہم شرک و بدعت سے روکنا ہے۔ جب یہ دونوں اہم فریضے امت ادا کرے گی تو وہ خیر الامم قرار پائے گی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾

''تم سب سے بہتر امت ہو جس کو لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے، تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''[2]

امام عز بن عبدالسلام کا قول ہے:

«طُوبٰى لِمَنْ تَوَلّٰى شَيْئًا مِنْ أُمُورِ الْمُسْلِمِينَ فَأَعَانَ عَلٰى إِمَاتَةِ الْبِدَعِ وَإِحْيَاءِ السُّنَنِ»

''اس شخص کے لیے خوش خبری ہے جو مسلمانوں کے کچھ معاملات کا ذمہ دار بنا تو اس نے بدعتوں کے مٹانے کی اور سنتوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔''[3]

جَعَلَنَا اللّٰهُ مِنْهُمْ.

آمدم برسرِ مطلب

گزشتہ تفصیلات سے مقصود یہ ہے کہ بدعت کی حقیقت اور اس کی خطرناکیاں واضح

[1] آل عمرٰن 3:104. [2] آل عمرٰن 3:110. [3] طبقات الشافعية الكبرى للسبكي:8/255.

ہو جائیں تاکہ آئندہ مباحث میں جن بدعات کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ آسانی سے سمجھ میں آسکیں اور ان سے بچنے کا اہتمام کیا جاسکے۔

جو شخص بھی اخلاص، تلاش حق کے جذبے اور طلب صادق کی نیت کے ساتھ اس مقدمے اور آئندہ مباحث میں بدعات کی نشاندہی پر غور کرے گا تو امید ہے کہ وہ ان بدعات اور شرکیہ عقائد و اعمال سے تائب ہو کر خالص اور بے آمیز اسلام کو اپنا کر توحید و سنت کی صراط مستقیم کو اختیار کر لے گا، جس کو بھی یہ توفیق مل گئی، وہ یقیناً سعادتِ ابدی کا مستحق قرار پا گیا۔

کاش! اس کتاب کا ہر قاری اس سعادت اور توفیق سے بہرہ ور ہو۔

اَللّٰهُمَّ! أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ، وَالْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ.
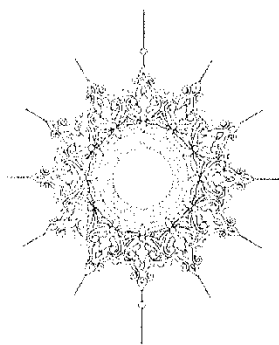
مسئلۂ رؤیتِ ہلال

شریعت اسلامی میں تہوار کے دن اور اکثر عبادات چاند کی تاریخ سے متعلق ہیں، جیسے عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، روزے، حج اور دیگر عبادات چاند کی تاریخ کے حساب سے ادا کی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے اسلامی ملکوں میں رؤیت ہلال کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کے لیے باقاعدہ کمیٹیاں بنائی گئی ہیں جو تمام ذرائع بروئے کار لاکر چاند کے ہونے اور نہ ہونے کا اعلان کرتی ہیں۔ اختلاف مطالع کی بنا پر مختلف ممالک میں چاند مختلف دنوں میں نظر آتا ہے جس کی وجہ سے بالخصوص رمضان اور عیدین کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اختلاف اگرچہ قرون اولیٰ سے چلا آرہا ہے لیکن دور حاضر میں ذرائع ابلاغ کی ترقی سے یہ اختلاف نہایت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اور اس کے حل کے لیے نئی نئی تجاویز سامنے آتی ہیں۔ اس سلسلے میں قابل غور باتیں حسب ذیل ہیں:

- اس مسئلے کی نوعیت اور اس کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟
- کیا اس خواہش کی کوئی شرعی حیثیت یا بنیاد ہے کہ عالم اسلام میں عیدین اور رمضان کا آغاز ایک ہی روز ہو؟
- کیا سعودی عرب کی رؤیت کو اس کے لیے بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟
- اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں؟

- کیا رؤیت میں علم فلکیات سے کچھ مدد لی جاسکتی ہے؟
- کیا اس کی بنیاد پر پورے سال کے لیے کیلنڈر بنایا جاسکتا ہے؟
- جہاں موسم اکثر ابر آلود رہتا ہو اور وہاں رؤیت کا اہتمام ممکن ہی نہ ہو، ایسے ممالک میں رؤیت کا اثبات کس طرح ہوگا؟
- فقہ حنفی کا مسئلہ اور پاک وہند کے علمائے احناف کا موقف
- ایک علاقے کے لوگوں کا یہ موقف کہاں تک صحیح ہے کہ انھوں نے غیر سرکاری کمیٹیاں بنائی ہوئی ہیں اور وہ مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے برعکس فیصلہ کرکے ایک یا دو روز پہلے ہی چاند کی رؤیت کا اعلان کردیتے ہیں؟
- رؤیت کے اثبات کے لیے کتنے گواہ ضروری ہیں؟
- وزارتِ مذہبی امور کی تجاویز جو چند سال قبل منظر عام پر آئی تھیں، ان کی حیثیت کیا ہے؟
- اس مسئلے کے حل کے لیے کس قسم کے اقدامات کی ضرورت ہے؟

اس کتاب کا موضوع چونکہ بارہ اسلامی مہینے ہے اور ہر مہینے کا اثبات چاند دیکھنے ہی سے ہوتا ہے، اس لیے رؤیت ہلال کی اہمیت بھی ہے اور اس کی حیثیت بھی اولین ہے۔ بنا بریں اس مسئلے پر روشنی ڈالنا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ ہم نہایت اختصار سے اس سے متعلقہ مسائل کا جائزہ بتوفیق اللّٰہ وعونہ پیش کرتے ہیں۔

نوعیت مسئلہ

مہ وسال کا دارومدار بالاتفاق سورج کی بجائے چاند پر ہے لیکن کائنات کی وسعت کی وجہ سے پوری دنیا میں ایک ہی روز مہ وسال کی ابتدا یا انتہا ناممکن ہے کیونکہ

واقعاتی طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مطالع کا بعد اور اختلاف اس قدر یقینی ہے کہ اس کا اعتبار کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں، اس لیے شرعی دلائل کی رُو سے ایک جگہ کی رؤیت دوسری جگہوں کے لیے معتبر نہیں ہے بلکہ ہر علاقے کی رؤیت صرف اسی علاقے کے لوگوں کے لیے معتبر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾

''جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو، اسے چاہیے کہ وہ اس کے (پورے) روزے رکھے۔''[1]

اور اس مہینے کے روزے اسی پر فرض ہوں گے جو رمضان المبارک کا چاند دیکھے گا، رؤیت ہلال کے بغیر رمضان کا اس کی موجودگی میں تحقُّق ہی نہیں ہوگا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کا فرمانِ گرامی ہے:

«صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ، فَإِنْ غُمِّيَ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِينَ»

''تم چاند دیکھ کر ہی روزہ رکھو (رمضان کا آغاز کرو) اور چاند دیکھ کر ہی روزہ افطار (روزہ رکھنا ترک اور عید) کرو، اگر تم پر بادل چھا جائیں (اور اس کی وجہ سے چاند نہ دیکھ سکو) تو شعبان کے 30 دنوں کی گنتی پوری کرو۔''[2]

اگر مثلاً: اہل مکہ یا اہل مصر چاند دیکھ لیں لیکن دوسرے علاقے کے لوگ اسے نہ دیکھ سکیں تو اہل مکہ یا اہل مصر کے لیے تو رؤیت ثابت ہوگئی اور وہ اس کی بنیاد پر رمضان کے آغاز یا اختتام کا فیصلہ کریں گے لیکن دوسرے علاقے کے لوگ کس طرح

[1] البقرة 2:185. [2] صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ: «إذا رأيتم الهلال فصوموا......»، حديث :1909.

یہ فیصلہ کر سکتے ہیں جبکہ انھوں نے چاند دیکھا ہی نہ ہو۔

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک نظیر

علاوہ ازیں اس کی ایک دوسری وجہ عہد صحابہ کی ایک نظیر ہے جس سے اسی موقف کی تائید ہوتی ہے جو مذکورہ سطور میں پیش کیا گیا ہے...... وہ واقعہ حسب ذیل ہے:

''حضرت کریب رحمہ اللہ (تابعی) بیان کرتے ہیں کہ مجھے ام الفضل نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام بھیجا۔ میں وہاں گیا اور اپنا کام پورا کیا اور ملک شام ہی میں میری موجودگی میں وہاں رمضان کا چاند ہوگیا اور یہ جمعہ کی رات تھی۔ پھر جب میں مہینے کے آخر میں مدینہ واپس آیا، تو مجھ سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا کہ تم نے وہاں چاند کب دیکھا تھا، میں نے بتلایا کہ جمعے کی رات کو، انھوں نے پوچھا: تم نے خود دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہاں، میں نے بھی اور دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا اور اس کے مطابق ہی لوگوں نے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے روزے رکھے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لیکن ہم نے تو یہاں (مدینے میں) ہفتے کی رات کو چاند دیکھا تھا، چنانچہ ہم تو پورے تیس روزے رکھیں گے یا پھر (29 رمضان کو) ہم چاند دیکھ لیں۔ تو میں نے کہا: کیا آپ کے لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رؤیت اور ان کا روزہ رکھنا کافی نہیں ہے؟ انھوں نے فرمایا: نہیں، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ہی حکم دیا ہے۔''[1]

[1] صحیح مسلم، الصیام، باب بیان أن لکل بلد رؤیتھم و أنھم إذا رأوا الھلال ببلد لا یثبت حکمه لما بعد عنھم.

......صحیح مسلم کی احادیث کی تبویب کرتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ نے اس واقعے پر باب کا جو عنوان دیا ہے، اس کا ترجمہ ہی یہ ہے:

''اس بات کا بیان کہ ہر علاقے کے لیے ان کی اپنی رؤیت ہے، نیز یہ کہ جب کسی علاقے کے لوگ چاند دیکھ لیں تو رؤیت ان لوگوں کے حق میں ثابت نہیں ہوگی جو اُن سے دور ہوں گے۔''

پھر امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

«وَ إِنَّمَا رَدَّهُ لِأَنَّ الرُّؤْيَةَ لَا يَثْبُتُ حُكْمُهَا فِي حَقِّ الْبَعِيدِ»

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت کریب رحمہ اللہ کی رؤیت کو اس لیے تسلیم نہیں کیا کہ رؤیت کا حکم دور والے لوگوں کے حق میں ثابت نہیں ہوتا۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی یہ واقعہ اپنی جامع ترمذی کے ابوابُ الصوم میں نقل کیا ہے اور انھوں نے بھی اس پر یہ عنوان قائم کیا ہے: «باب ماجاء لكل أهل بلد رؤيتهم» ''اس بات کا بیان کہ ہر علاقے کے لوگوں کے لیے ان کی اپنی رؤیت ہے۔''

بہر حال اس میں واضح طور پر موجود ہے کہ صحابیٔ رسول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مدینے والوں کے لیے شام کی رؤیت کا اعتبار نہیں کیا، جس سے اسی موقف کا اثبات ہوتا ہے کہ پورے عالم اسلام کے لیے کسی ایک ہی علاقے کی رؤیت کافی نہیں ہے۔

اور احادیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا تَصُومُوا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ، وَلَا تُفْطِرُوا حَتّٰى تَرَوْهُ، فَإِنْ أُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ»

''اور اس وقت تک روزہ نہ رکھو، جب تک چاند نہ دیکھ لو اور اس وقت تک

روزہ افطار (روزہ رکھنا ترک اور عید) نہ کرو، جب تک چاند دیکھ نہ لو، اگر بادل چھا جائیں تو پھر (تیس دن کا) اندازہ پورا کرو۔"[1]

اس کی تیسری وجہ یہ ہے کہ عیدین اگرچہ مسلمانوں کے ملی تہوار ہیں۔ لیکن یہ دوسرے مذاہب کے سے ملی تہوار نہیں، جن میں وہ لوگ تہوار کی سرمستی میں ہر چیز کو فراموش کر دیتے ہیں حتی کہ تمام اخلاقی قدروں اور ضابطوں اور تمام بندھنوں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں عیدین کا آغاز بھی اللہ کی تکبیر وتحمید اور اس کی بارگاہ میں دوگانہ ادا کر کے اس کے سامنے عجز و نیاز کے اظہار سے ہوتا ہے اور پھر کسی بھی مرحلے میں اس آزاد روی کی اجازت نہیں ہے جس کا مظاہرہ عیدین کے موقعوں پر دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی اور نقالی میں، جاہل مسلمانوں اور شریعت سے ناآشنا لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ وہ بھی خدا فراموش اور اخلاقی حدود سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں عیدین کی حیثیت ملی تہوار کے علاوہ عبادت کی بھی ہے۔ اور رمضان المبارک تو ہے ہی عبادات کا خصوصی مہینہ، اس لیے ان میں وحدت کا اہتمام غیر ضروری ہے۔ جس طرح عالم اسلام میں بلکہ ایک ملک میں بھی نمازوں کے اوقات میں فرق وتفاوت ہے اور اسے وحدت کے منافی نہیں سمجھا جاتا، تو عالم اسلام میں رؤیتِ ہلال کے حساب سے الگ الگ دن عیدین اور رمضان کے آغاز کو، عالم اسلام کی وحدت کے منافی کیوں کر سمجھا جائے؟ اپنے اپنے حساب سے ہر ملک میں الگ الگ عید منائی جاسکتی ہے اور رمضان کے روزے رکھے جاسکتے ہیں۔ شریعت نے ایسا کوئی حکم دیا ہے اور نہ اس کا کوئی اہتمام ہی کیا ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ ایک ہی

[1] صحیح مسلم، الصیام، باب وجوب صوم رمضان ......، حدیث: 1080.

دن عید منائیں اور ایک ہی دن روزے رکھیں۔ بلکہ اس کے برعکس یہ حکم دیا گیا ہے:
«صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ» ''چاند دیکھ کر روزے رکھو (رمضان کا آغاز کرو) اور چاند دیکھ کر افطار (روزہ رکھنا ترک اور عید) کرو۔'' جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب تک ہر ملک میں اس کے حساب سے رؤیتِ ہلال کا اثبات نہ ہوجائے، نہ رمضان کا آغاز کرنا صحیح ہے اور نہ روزے ختم کرکے عید کا اہتمام کرنا مناسب ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں ایک ہی ملک کے دور دراز علاقوں میں بھی رمضان اور عید کا الگ الگ اہتمام ہوسکتا ہے، بشرطیکہ رؤیت کے شرعی تقاضوں کا خیال رکھا گیا ہو۔ اس کی کچھ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

جیسے ہر ملک اور علاقے میں جب تک صبح صادق نہ ہوجائے، فجر کی نماز نہیں پڑھی جاسکتی اور جب تک سورج غروب نہ ہوجائے مغرب کی نماز نہیں پڑھی جاسکتی، اسی طرح رؤیتِ ہلال کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ بھی طلوع و غروب شمس کی طرح اختلافِ مطالع کے اعتبار سے مختلف ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے، اس میں نہ یکسانیت و وحدت پیدا کی جاسکتی ہے اور نہ اس کا ہمیں کوئی حکم ہی دیا گیا ہے۔ چودہ صدیوں سے عالم اسلام میں اپنے اپنے حساب سے عیدین اور رمضان کا اہتمام ہوتا چلا آرہا ہے، اسے کبھی بھی وحدت و یک جہتی کے منافی نہیں سمجھا گیا۔ اب ایسا کرنا کیوں کر وحدت کے منافی ہوجائے گا؟

بعض جلیل القدر علمائے احناف نے تو صرف پاکستان کی حد تک بھی ایک ہی دن عید منانے کو شرعی لحاظ سے غیر ضروری قرار دیا ہے...... چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اگرچہ شرعی حیثیت سے اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ پورے ملک میں عید ایک ہی دن ہو۔ اسلام کے قرونِ اُولیٰ میں اس وقت کے موجودہ ذرائع مواصلات

کو بھی اس کام میں استعمال کرنے اور عید ایک ہی دن منانے کا کوئی اہتمام نہیں ہوا اور ملک کے وسیع وعریض ہونے کی صورت میں شدید اختلافِ مطالع کی مشکلات بھی اس میں پیش آسکتی ہیں۔ لیکن پاکستان کے عوام اور حکومت کی اگر یہی خواہش ہے کہ عید پورے پاکستان میں ایک ہی دن ہو تو شرعی اعتبار سے اس کی بھی گنجائش ہے۔ شرط یہ ہے کہ عید کا اعلان پوری طرح شرعی ضابطۂ شہادت کے تابع ہو۔" [1]

اس تحریر پر مولانا مفتی محمد شفیع کے علاوہ، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا مفتی رشید احمد کے بھی دستخط ہیں اور یہ تحریر 1386ھ (آج سے 45 سال پہلے) کی ہے۔ اس میں مذکورہ عبارت کے بعد شہادت کا وہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی چاند کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہم نے یہ اقتباس صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ اس میں صرف ایک ملک کے اندر بھی عید کی وحدت کو غیر ضروری قرار دیا گیا ہے (جو فی الواقع درست بھی ہے) چہ جائیکہ عالم اسلام میں ایک ہی دن عید کا اہتمام ضروری قرار دیا جائے۔ اختلافِ مطالع میں بہت زیادہ فرق کی صورت میں رؤیتِ ہلال میں جو مشکلات ہیں، اس کا بھی اعتراف ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اختلافِ مطالع میں بہت زیادہ فرق کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کسی ایک چھوٹے ملک کی حد تک، تو عیدین و رمضان میں وَحدت کا اہتمام ممکن ہے اور صحیح بھی ہوسکتا ہے کیونکہ اس کے مختلف علاقوں میں مطالع کا اختلاف زیادہ نہیں ہوتا، تھوڑا بہت جو اختلاف ہے اسے ناقابل اعتبار قرار دیا جاسکتا ہے لیکن جن ملکوں کے درمیان مطالع کا بہت زیادہ اختلاف اور

[1] جواہر الفقہ، مفتی محمد شفیع مرحوم: 1/398,397.

فرق ہے، اسے کیوں کر نا قابل اعتبار قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس کے لیے جب تک کوئی معقول شرعی دلیل نہیں ہوگی، اسے تسلیم کرنا مشکل ہے۔

مذکورہ تفصیل سے مسئلے کی نوعیت بھی واضح ہوگئی اور وہ یہ کہ ہر اسلامی مہینے کے لیے چاند کا دیکھا جانا ضروری ہے، اس کے بغیر مہینے کا آغاز نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا، یہ بھی واضح ہوگیا کہ اس خواہش کی کوئی شرعی حیثیت یا بنیاد نہیں ہے کہ تمام عالمِ اسلام یا ایک وسیع اور بلادِ بعیدہ کے حامل ملک میں عیدین اور رمضان کا آغاز ایک ہی دن ہو۔

تیسرا، سعودی عرب کو بھی، جس کو عالم اسلام میں ایک خصوصی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس کے لیے بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

اختلافِ مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں؟

مذکورہ تفصیل سے اگرچہ اس امر کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار ہے، یعنی دور دراز کے علاقوں کی رؤیت ان علاقوں کے لیے کافی نہیں ہے جن کے مطالع میں بہت زیادہ فرق ہے، مثلاً: ایک جگہ ظہر کا وقت ہے تو دوسری جگہ رات کا بھی کچھ حصہ گزر چکا ہے اور یوں چاند کے طلوع ہونے میں بھی اکثر وبیشتر ایک یا دو دن کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔

لیکن چونکہ حنفی مذہب میں ظاہر الروایۃ کے مطابق اختلافِ مطالع کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اس لیے پاکستان کے بعض احناف کے نزدیک پورے عالم اسلام میں ایک ہی دن عید اور رمضان کا آغاز کیا جا سکتا ہے اور علمائے احناف کا یہ گروہ اسی پر زور دے رہا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ پاک و ہند کے حنفی علماء بھی اختلافِ مطالع کا اعتبار کرنے کے قائل ہیں، یعنی وہ کسی ایک ہی جگہ کی رؤیت کو پورے عالمِ اسلام کے لیے کافی نہیں سمجھتے۔ پاکستان کے جیّد علمائے احناف کی رائے پر مبنی ایک اقتباس ہم ''جواہر الفقہ'' سے نقل کر چکے ہیں جس میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ وحدت کے لیے ایک ہی دن عید منانا ضروری نہیں ہے۔ اب ہم ذیل میں ایک ہندوستانی حنفی عالم کی کتاب سے یہ بحث نقل کرتے ہیں جس میں انھوں نے حنفی فقہاء وعلماء کی آراء نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار ہے اور بھارت کے تمام اہل سنت کے مکاتب فکر کا متفقہ فیصلہ بھی نقل کیا ہے جس میں اختلاف مطالع کو معتبر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

اختلافِ مطالع کی بحث

یہ مسئلہ گو اپنی نوعیت کے لحاظ سے قدیم ہے لیکن عصر حاضر کے اکتشافات، نیز تیز ذرائع مواصلات کی دریافت نے اسے پھر جدید مسائل کی فہرست میں داخل کر دیا ہے۔ مَطْلَع کے معنی ''چاند کے طلوع ہونے کی جگہ'' کے ہیں۔ اس طرح ''اختلافِ مطلع'' کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کے مختلف خطوں میں چاند کے طلوع ہونے اور نظر آنے کی جگہ الگ الگ ہوا کرتی ہے، لہٰذا عین ممکن ہے کہ ایک جگہ چاند نمودار ہو اور دوسری جگہ نہ ہو۔ ایک جگہ ایک دِن چاند نظر آئے اور دوسری جگہ دوسرے دن...... اب یہاں دو سوالات ہیں:

ایک یہ کہ ''اختلافِ مطلع'' پایا جاتا ہے یا نہیں؟

دوسرے اگر پایا جاتا ہے تو اس کا اعتبار بھی ہوگا یا نہیں؟

پہلا مسئلہ اب نظری نہیں رہا بلکہ یہ بات مشاہدہ اور تجربہ کی سطح پر ثابت ہو چکی ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں مطلع کا اختلاف پایا جاتا ہے، اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بعض مقامات ایسے ہیں جن کے درمیان بارہ بارہ گھنٹوں کا فرق ہے۔ عین اس وقت جب ایک جگہ دن اپنے شباب پر ہوتا ہے تو دوسری جگہ رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی ہوتی ہے۔ ٹھیک اس وقت جب ایک مقام پر ظہر ہوتی ہے، دوسری جگہ مغرب کا وقت ہو چکا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں ان کا مطلع ایک ہو ہی نہیں سکتا۔ فرض کیجیے کہ جہاں مغرب کا وقت ہے، اگر وہاں چاند نظر آئے تو کیا جہاں ظہر کا وقت ہے وہاں بھی چاند نظر آ جائے گا یا اس کو مغرب کا وقت تسلیم کر لیا جائے گا......؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس مطلع کا اختلاف معتبر بھی ہوگا یا نہیں؟ احناف کا مشہور مسلک یہی ہے کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں ہے، یعنی اگر مشرق کے کسی خطے میں چاند نظر آیا تو وہ مغربی خطوں کے باشندوں کے لیے بھی حجت ہوگا اور یہی رؤیت ان کے لیے عیدین و رمضان ثابت کرنے کو کافی ہوگی۔

امام شافعی رحمہ اللہ اور کچھ دوسرے فقہاء کے یہاں اس اختلافِ مطالع کا اعتبار ہے اور ان کے یہاں ایک مقام کی رؤیت دوسرے مقام کے لیے بھی رؤیت اور چاند دیکھے جانے کی دلیل نہیں ہے۔ وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جس روایت کو وہ اپنی دلیل بناتے ہیں وہ ان کے نقطۂ نظر کے لیے صریح اور دو ٹوک نہیں ہے، البتہ یہ بات بہت واضح ہے کہ نمازوں کے اوقات میں سبھی اختلافِ مطالع کا اعتبار کرتے ہیں۔ اگر ایک جگہ ظہر یا عشاء کا وقت ہو چکا ہو اور دوسری جگہ نہ ہوا ہو تو جہاں وقت نہ ہوا ہو وہاں کے لوگ محض اس بنا پر ظہر و عشاء کی نماز ادا نہیں کر سکتے کہ دوسری جگہ ان نمازوں کا وقت

ہو چکا ہے یا اگر ایک جگہ مہینہ کا 28 واں ہی دن ہے اور دوسری جگہ 29 واں، جہاں چاند نظر آ گیا تو محض اس بنا پر 28 ویں تاریخ ہی پر مہینہ کر کے اگلے دن رمضان یا عید نہیں کی جائے گی کہ دوسری جگہ چاند نظر آ گیا ہے۔

اس لیے یہ بات فطری اور انتہائی منطقی ہے کہ مطلع کے اختلاف کا اور اسی لحاظ سے رمضان اور عید کا اختلاف تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ فقہائے متقدمین کے دور میں اول تو معلوم کائنات کی یہ وسعت دریافت ہی نہ ہوئی تھی اور ممالک ہی نہیں کئی براعظموں سے دنیا بے خبر اور نا آشنا تھی، پھر اس میں بھی مسلمان جزیرۃ العرب اور خلیجی علاقوں میں محدود تھے، اس وقت تک شاید یہ بات ممکن رہی ہو اور ان کے مطلع میں اتنا فرق نہ رہا ہو کہ اس کو الگ الگ سمجھا جائے، اس لیے فقہاء نے ایسا کہا ہے، چنانچہ خود فقہائے احناف میں بھی مختلف محققین نے اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا ہے۔

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محل نے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور مختلف فقہاء کی عبارتیں نقل کی ہیں جو یہاں ذکر کی جاتی ہیں، مشہور کتاب ''مراقی الفلاح'' کے مصنف لکھتے ہیں:

«وَ قِيلَ يَخْتَلِفُ ثُبُوتُهُ، بِاخْتِلَافِ الْمَطَالِعِ وَاخْتَارَهُ صَاحِبُ التَّجْرِيدِ كَمَا إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ عِنْدَ قَوْمٍ وَ غَرَبَتْ عِنْدَ غَيْرِهِمْ فَالظُّهْرُ عَلَى الْأَوَّلِيْنِ لَا الْمَغْرِبُ لِعَدَمِ انْعِقَادِ السَّبَبِ فِي حَقِّهِمْ»

''بعض حضرات کی رائے ہے کہ اختلافِ مطالع کی وجہ سے رؤیتِ ہلال کے ثبوت میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔ تجرید القدوری کے مصنف نے اسی کو ترجیح دی ہے جیسا کہ جب کچھ لوگوں کے یہاں آفتاب ڈھل جائے اور دوسروں کے یہاں غروب ہوجائے تو پہلے لوگوں پر ظہر ہے نہ کہ مغرب اس لیے کہ ان

کے حق میں مغرب کا سبب متحقق نہیں ہوا ہے۔‘‘

نیز اسی کے حاشیہ پر علامہ طحطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَهُوَ الْأَشْبَهُ لِأَنَّ انْفِصَالَ الْهِلَالِ مِنْ شُعَاعِ الشَّمْسِ يَخْتَلِفُ بِاخْتِلَافِ الْأَقْطَارِ كَمَا فِي دُخُولِ الْوَقْتِ وَ خُرُوجِهِ، وَهٰذَا مُثْبِتٌ فِي عِلْمِ الْأَفْلَاكِ وَالْهَيْئَاةِ وَأَقَلُّ مَااخْتَلَفَ الْمَطَالِعُ مَسِيرَةُ شَهْرٍ كَمَا فِي الْجَوَاهِرِ»

’’یہی رائے زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ چاند کا سورج کی کرنوں سے خالی ہونا علاقوں کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے جیسا کہ اوقات (نماز) کی آمدورفت میں۔ اور یہ فلکیات اور علم ہیئت کے مطابق ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، نیز کم سے کم جس سے اختلافِ مطالع واقع ہوتا ہے، وہ ایک ماہ کی مسافت ہے جیسا کہ ’’جواہر‘‘ نامی کتاب میں ہے۔‘‘

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

«أَهْلُ بَلْدَةٍ إِذَا رَأَوُا الْهِلَالَ هَلْ يَلْزَمُ فِي حَقِّ كُلِّ بَلْدَةٍ؟ أُخْتُلِفَ فِيهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَالَ لَا يَلْزَمُ...... وَ فِي الْقُدُورِيِّ إِنْ كَانَ بَيْنَ الْبَلْدَتَيْنِ تَفَاوُتٌ لَا يَخْتَلِفُ بِهِ الْمَطَالِعُ، يَلْزَمُهُ»

’’ایک شہر والے جب چاند دیکھ لیں تو کیا تمام شہر والوں کے حق میں رؤیت لازم ہوجائے گی؟ اس میں اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے: لازم نہیں ہوگی...... اور قدوری میں ہے کہ اگر دو شہروں کے درمیان ایسا تفاوت ہو کہ مطلع تبدیل نہ ہوتا ہو تو اس صورت میں رؤیت لازم ہوگی۔‘‘

صاحب ہدایہ اپنی کتاب ''مختارات النوازل'' میں ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

«أَهْلُ بَلْدَةٍ صَامُوا تِسْعَةً وَّعِشْرِينَ يَوْمًا بِالرُّؤْيَةِ وَ أَهْلُ بَلْدَةٍ أُخْرٰى صَامُوا ثَلَاثِينَ بِالرُّؤْيَةِ فَعَلَى الْأَوَّلِيْنِ قَضَاءُ يَوْمٍ إِذَا لَمْ يَخْتَلِفِ الْمَطَالِعُ بَيْنَهُمَا وَ أَمَّا إِذَا اخْتَلَفَتْ لَا يَجِبُ الْقَضَاءُ»

''ایک شہر والوں نے رؤیتِ ہلال کے بعد 29 روزے رکھے اور دوسرے شہر والوں نے چاند دیکھنے ہی کی بنا پر 30 روزے رکھے تو اگر ان شہروں میں مطلع کا اختلاف نہ ہو تو 29 روزے رکھنے والوں کو ایک دن کی قضا کرنی ہوگی۔ اور اگر دونوں شہروں کا مطلع جداگانہ ہو تو قضا کی ضرورت نہیں۔''

محدث علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے کنزالدقائق کی شرح ''تبیین الحقائق'' میں اس پر تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے۔ انھوں نے اختلافِ مطالع کی بحث میں فقہاءِ احناف کا اختلاف نقل کرنے کے بعد خود جو فیصلہ کیا ہے، وہ یہ ہے:

«اَلْأَشْبَهُ أَنْ يُعْتَبَرَ لِأَنَّ كُلَّ قَوْمٍ مُخَاطَبُونَ بِمَا عِنْدَهُمْ وَانْفِصَالُ الْهِلَالِ عَنْ شُعَاعِ الشَّمْسِ يَخْتَلِفُ بِاخْتِلَافِ الْمَطَالِعِ كَمَا فِي دُخُولِ وَقْتِ الصَّلَاةِ وَخُرُوجِهِ يَخْتَلِفُ بِاخْتِلَافِ الْأَقْطَارِ»

''زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اختلافِ مطالع معتبر ہے، اس لیے کہ ہر جماعت اسی کی مخاطب ہوتی ہے جو اُس کو درپیش ہو اور چاند کا سورج کی کرنوں سے خالی ہونا مطالع کے اختلاف سے مختلف ہوتا رہتا ہے، جیسے نمازوں کے ابتدائی اور انتہائی اوقات علاقائی اختلاف کی بنا پر مختلف ہوتے رہتے ہیں۔''

پھر اس موضوع پر مفصل بحث کرنے کے بعد علامہ لکھنوی نے جو جچا تلا فیصلہ کیا ہے، وہ انھی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے:

"اصح المذاہب عقلا ونقلا ہمیں است کہ ہر دو بلدہ کہ فیما بین آنہا مسافتے باشد کہ دراں اختلافِ مطالع می شود و تقدیرش مسافت یک ماہ است، دریں صورت حکم رؤیت یک بلدہ بہ بلدۂ دیگر نخواہد شد و در بلادِ متقاربہ کہ مسافت کم از کم یک ماہ داشتہ باشند حکم رؤیت بلدہ بہ بلدۂ دیگر لازم خواہد شد۔"[1]

"عقل ونقل ہر دو لحاظ سے سب سے صحیح مسلک یہی ہے کہ ایسے دو شہر جن میں اتنا فاصلہ ہو کہ ان کے مطلع بدل جائیں جس کا اندازہ ایک ماہ کی مسافت سے کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک شہر کی رؤیت دوسرے شہر کے لیے معتبر نہیں ہونی چاہیے اور قریبی شہروں میں جن کے مابین ایک ماہ سے کم کی مسافت ہو ایک شہر میں رؤیت دوسرے شہر کے لیے لازم اور ضروری ہوگی۔"

راقم الحروف کے خیال میں یہ رائے بہت معتدل، متوازن اور قرین عقل ہے، البتہ اختلافِ مطالع کی حدیں متعین کرنے میں "ایک ماہ کی مسافت" کی قید کی بجائے جدید ماہرین فلکیات کے حساب اور ان کی رائے پر اعتماد کیا جانا زیادہ مناسب ہوگا۔

مجلس تحقیقاتِ شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، منعقدہ 4,3 مئی 1967ء کو مختلف مکاتبِ فکر کے علماء اور نمائندہ شخصیتوں نے مل کر اس مسئلہ کی بابت جو فیصلہ کیا تھا، وہ حسب ذیل ہے:

1 نفس الامر میں پوری دنیا کا مطلع ایک نہیں بلکہ اختلافِ مطالع مسلّم ہے۔ یہ ایک واقعاتی چیز ہے اس میں فقہائے کرام کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور حدیث سے بھی اس

[1] مجموعة الفتاوٰی علٰی هامش خلاصة الفتاوی، جلد 1، ص: 256,255.

کی تائید ہوتی ہے۔

2 البتہ فقہاء اس باب میں مختلف ہیں کہ صوم اور افطارِ صوم کے باب میں یہ اختلافِ مطلع معتبر ہے یا نہیں؟ محققین احناف اور علماءِ امت کی تصریحات اور ان کے دلائل کی روشنی میں مجلس کی متفقہ رائے ہے کہ "بلادِ بعیدہ میں اس باب میں بھی اختلافِ مطلع معتبر ہے۔"

3 بلادِ بعیدہ سے مراد یہ ہے کہ ان میں باہم اس قدر دوری واقع ہو کہ عادتاً ان کی رؤیت میں ایک دن کا فرق ہوتا ہے۔ ایک شہر میں ایک دن پہلے چاند نظر آتا ہے اور دوسرے میں ایک دن کے بعد۔ ان بلادِ بعیدہ میں اگر ایک کی رؤیت دوسرے کے لیے لازم کردی جائے تو مہینہ کسی جگہ 28 دن کا رہ جائے گا اور کسی جگہ 30 دن کا قرار پائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔

4 بلادِ قریبہ وہ شہر ہیں جن کی رؤیت میں عادتاً ایک دن کا فرق نہیں پڑتا، ایک ماہ کی مسافت کی دوری جو تقریباً 500 یا 600 میل ہوتی ہے کو بلادِ بعیدہ قرار دیتے ہیں اور اس سے کم کو بلادِ قریبہ۔ مجلس اس سلسلے میں ایک ایسے چارٹ کی ضرورت سمجھتی ہے جس سے معلوم ہوجائے کہ مطلع کتنی مسافت پر بدلتا ہے۔ اور کن کن ملکوں کا مطلع ایک ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے بیشتر حصوں اور بعض قریبی ملکوں، مثلاً: نیپال وغیرہ کا مطلع ایک ہے۔ علماءِ ہندوپاک کا عمل ہمیشہ اسی پر رہا ہے اور غالباً تجربہ سے بھی یہی ثابت ہے۔ ان ملکوں کے شہروں میں اس قدر بعدِ مسافت نہیں ہے کہ مہینے میں ایک دن کا فرق پڑتا ہو۔ اس بنیاد پر اِن دونوں ملکوں میں جہاں بھی چاند دیکھا جائے، شرعی ثبوت کے بعد اس کا ماننا ان دونوں

ملکوں کے تمام اہل شہر پر لازم ہوگا۔

5 مصر اور حجاز جیسے دور دراز ملکوں کا مطلع ہندوپاک کے مطلع سے علیحدہ ہے۔ یہاں کی رؤیت ان ملکوں کے لیے اور ان ملکوں کی رؤیت یہاں والوں کے لیے ہر حالت میں لازم اور قابل قبول نہیں ہے، اس لیے کہ اُن میں اور ہندوپاک میں اتنی دوری ہے کہ عموماً ایک دن کا فرق ان میں واقع ہوجاتا ہے اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔

(جدید فقہی مسائل، جلد1، ص: 89-94۔ تالیف: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (فاضل دیوبند) صدر مدرس دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد دکن (بھارت)

کیا رؤیت میں علم فلکیات سے مدد لینا اور ان کی رائے کو اہمیت دینا جائز ہے؟

جائز ہی نہیں بلکہ بعض اوقات ضروری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ چاند کے اثبات کے لیے رؤیت (دیکھا جانا) ضروری ہے، اس کے بغیر چاند کا تحقق ممکن ہی نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ رصد اور فلکیات کا جو علم ہے اور جو صدیوں کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے، اسے سرے سے کوئی اہمیت ہی نہ دی جائے۔ بلکہ ہم جس طرح طلوع وغروبِ آفتاب، زوال اور طلوعِ فجر وغیرہ میں علم رصد پر اعتبار کرتے ہیں اور اسی علم کی بنیاد پر مذکورہ اوقات کا تعین کرتے اور انھیں تسلیم کرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر دائمی اوقات نامے بنائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح جب علم رصد کی رُو سے غروبِ شمس کے وقت چاند کی وِلادت ہی متحقق نہ ہو، تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اس وقت چاند اُفق پر نظر آجائے۔

اللہ تعالیٰ اگرچہ اسباب کا پابند نہیں ہے لیکن اس کی مشیت وحکمت کے تحت نظامِ کائنات اسباب کے مطابق ہی چل رہا ہے۔ کائنات کی آفرینش سے لے کر آج تک اس میں تبدیلی نہیں آئی ہے۔ چاند کی وِلادت اس کے وجود وظہور کا سبب ہے، جب تک یہ سبب (ولادت) نہ ہوگا، چاند اُفق پر نظر ہی نہیں آسکتا۔ اور رصد وفلکیات کا علم اسی سبب کے جاننے کا نام ہے، وہ اس علم کی رُو سے چاند کی رفتار کا جائزہ لیتا ہے، اس کی ولادت کا تعین کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ وہ اُفق پر کب ظاہر ہوسکتا ہے، اس لیے اس علم کا انکار کیا جاسکتا ہے، نہ اس سے استفادے کو ممنوع قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ جس طرح ہم طلوع وغروبِ آفتاب کے اوقات کے تعین میں اس علم پر اعتماد کرتے ہیں، ہمیں چاند کی ولادت وعدمِ ولادت اور اس کے امکانِ ظہور وعدمِ امکانِ ظہور میں بھی اس کی معلومات کو تسلیم کرنا چاہیے۔

بنابریں مسلمہ درایتی قواعد کی رو سے جس دن غروبِ آفتاب سے پہلے چاند کی وِلادت نہ ہوگئی ہو۔ یا چاند اس دن سورج غروب ہونے سے پہلے غروب ہو چکا ہو تو اس دن یقیناً چاند نظر آنے کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔ لیکن اس دن اگر کچھ لوگ دعویٰ کریں کہ انھوں نے چاند دیکھا ہے تو ان کا یہ دعویٰ سخت محلِ نظر ہوگا کیونکہ یہ دعویٰ ایسا ہی ہوگا جیسے سورج غروب ہو چکا ہو لیکن دعویٰ کرنے والے دعویٰ کریں کہ ابھی غروب نہیں ہوا۔ یا سورج نکل چکا ہو، لیکن دعویٰ کرنے والے دعویٰ کریں کہ سورج ابھی نہیں نکلا۔ ایسی صورت میں یقیناً رؤیتِ ہلال کا دعویٰ کرنے والوں کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرنی چاہیے۔ اور شہادت کے شرعی تقاضوں کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے، چاہے اس کی روشنی میں پہلا فیصلہ غلط قرار پائے، اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

اہل خیبر (سرحد) کا معاملہ؟

یہ ایک نہایت قابل غور معاملہ ہے کہ ہر سال یہ مسئلہ صرف صوبہ خیبر کے لوگوں کی وجہ سے اختلاف وافتراق کا باعث بنتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟...... دوسرے صوبوں میں ایسا کیوں نہیں ہوتا؟

اس کی وجہ بعض لوگ علمائے اہل خیبر کا دوسرے صوبوں کے مقابلے میں، زیادہ دین دار ہونا بتلاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف بہت سے ذمہ دار حضرات یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں بعض علاقے ایسے ہیں کہ وہ یوں ہی شور مچا دیتے ہیں: ''چاند ہوگیا اور کل عید ہے یا روزہ ہے۔'' راقم جب مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کا رکن تھا تو صوبہ خیبر کے دو نمائندے اس میں شامل تھے، وہ دونوں اختلافِ مسلک کے باوجود اس بات پر متفق تھے کہ رؤیتِ ہلال کے بارے میں صوبہ خیبر کے لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ وہ ویسے ہی چاند ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں۔

مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے سابقہ چیئر مین مولانا عبد اللہ صاحب نے ایک مرتبہ خود اس امر کا ذاتی مشاہدہ حاصل کیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ 29 شعبان 1418ھ کو، جبکہ سرحد میں یکم رمضان تھی اور وہاں 28 شعبان کو 30 آدمیوں نے چاند دیکھنے کی شہادت دی تھی اور اسی بنا پر وہاں مقامی کمیٹی نے روزے رکھنے کا اعلان کیا تھا۔ میں نے وہاں کے بعض علماء سے کہا کہ آج آپ کے حساب سے رمضان کی دوسری رات ہے اور آج چاند واضح اور صاف نظر آنا چاہیے۔ جبکہ فلکیات والوں کا کہنا یہ تھا کہ آج چاند بلوچستان اور سندھ کے بعض علاقوں میں ممکن ہے نظر آجائے، اس کے علاوہ کہیں نظر آنے کا امکان نہیں ہے، چنانچہ میں ان علمائے سرحد کو لے کر ایک پہاڑ پر چڑھ گیا،

ہمارے ساتھ سینکڑوں آدمی اور بھی تھے، لیکن بسیار کوشش کے باوجود چاند نظر نہ آیا۔ بلکہ پورے سرحد سمیت کہیں بھی نظر نہ آیا اور تھوڑی دیر کے بعد صرف بلوچستان سے چاند دیکھے جانے کی اطلاع ملی، جس کی بنیاد پر مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی نے چاند کے ہونے کا فیصلہ اور اعلان کیا۔ اس ایک واقعے نے دونوں باتوں کا فیصلہ کر دیا۔

1 رؤیت ہلالِ کے بارے میں اہل سرحد کی گواہی معتبر نہیں اور جو علماء مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی اور اس کے طریق کار سے ہٹ کر اپنے طور پر رؤیت کا فیصلہ کرتے ہیں، صحیح نہیں ہے اور ان کا یہ طرزِ عمل مستقل انتشار و اختلاف کا باعث ہے۔

2 اہل فلکیات کی رائے کو قرارِ واقعی اہمیت نہ دینا بھی غلط ہے۔ فلکیات کا یہ علم صدیوں کے مسلسل تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے، اس سے استفادہ کرنا اور اس سے وابستہ افراد کی رائے کو اہمیت دینا ضروری ہے، نیز اس کا شریعت سے کوئی تصادم بھی نہیں ہے، اس لیے ان کی رائے کو آسانی سے جھٹلانا ناممکن ہے، نہ جھٹلانے کی ضرورت ہی ہے، البتہ اگر کبھی (کسی نادِر صورت میں) واقعی اہل فلکیات کی رائے مشاہدے کے خلاف ہو تو مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی قرائن و شواہد اور گواہوں، گواہیوں کی حیثیت کا تعین کر کے اس کے خلاف فیصلہ سنا سکتی ہے۔ یہ نہ کوئی مشکل بات ہے، نہ اس سے فلکیات کی بے اعتباری کا اثبات ہوتا ہے۔ (از مکتوب مولانا عبد اللہ مرحوم بنام علمائے کرام)

پس چہ باید کرد

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں اہلِ خیبر کی بابت یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی رؤیت نہ مطلقاً قابل تسلیم ہے اور نہ مطلقاً قابل ردّ، ان کا رویہ جو قابل اصلاح ہے، وہ یہ ہے

کہ انھوں نے مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے متوازی جو غیر سرکاری کمیٹی یا کمیٹیاں بنائی ہوئی ہیں، ان کو ختم کر دیا جائے یا وہ اپنے آپ کو اس بات کا پابند کریں کہ ان کے سامنے رؤیت کی جو گواہیاں آئیں، اگر وہ ان سے مطمئن ہوں تو پہلے مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کو، اگر اس کا اجلاس ہو رہا ہو، ان سے آگاہ کریں، وہ یقیناً ان پر غور کرے گی، بلاوجہ وہ اس کو رد نہیں کرے گی جیسا کہ راقم کو ذاتی طور پر اس کے طریقِ کار سے آگاہی ہے۔ اس نے پہلے بھی اہل خیبر کی رؤیت پر بعض دفعہ فیصلہ کیا ہے جب کہ ان کی گواہی شہادت کے شرعی تقاضوں پر پوری اتری ہے۔ اور اگر ملک کے دوسرے حصوں میں 28 تاریخ ہو جیسا کہ بدقسمتی سے ایک عرصے سے یہ صورت حال چلی آ رہی ہے تو کوئی صورت ایسی بنائی جائے کہ جب تک یہ صورت حال موجود ہے مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی ہنگامی طور پر اپنے اراکین سے موبائل فون پر رابطہ کر کے ایک دوسرے کی رائے حاصل کرنے کی کوشش کرے، آج کل اس طرح فوری رابطہ کر کے فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ بصورت دیگر صوبہ خیبر کے علماء کی کمیٹی اگر پوری طرح مطمئن ہو تو وہ خیبر کی حد تک رؤیت کا فیصلہ کر دے، تاہم اس کے لیے تین باتوں کا اہتمام ضروری ہے۔

اول: یہ کہ یہ کمیٹی تمام مکاتب فکر کے علماء پر مشتمل ہو۔

دوم: سرکاری مداخلت سے آزاد ہو۔

سوم: اگر دوسرے روز خیبر میں بھی (جب کہ دوسرے حصوں میں 29 اور سرحد میں یکم تاریخ ہو) چاند افق پر نظر نہ آئے تو واضح طور پر اپنی غلطی کا اعتراف و اعلان کرے اور آئندہ کے لیے مکمل طور پر مرکزی کمیٹی کے فیصلے کی پابندی کا اہتمام کرے۔

راقم کو امید ہے کہ ایک دو مرتبہ اس طرح کرنے سے آئندہ کے لیے ایک واضح صورت متعین ہو جائے گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اہل خیبر کے معاملے کو خیبر کے علماء ہی کے سپرد کر دیا جائے، وہ جس طرح چاہیں فیصلہ کریں اور اس پر عمل کریں جیسا کہ سالہا سال سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے اور اہل خیبر اکثر اپنے صوبے کی رؤیت اور اپنے لوگوں کی شہادتوں پر اعتماد کرتے ہوئے ملک کے دوسرے حصوں سے الگ ہی رمضان اور عید کا اہتمام کرتے ہیں، ایسا کرنے کی بھی شرعاً پوری گنجائش ہے۔

اثباتِ ہلال کے لیے کیلنڈر پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا

مذکورہ وضاحت سے اس امر پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے کہ کیلنڈر پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ بعض لوگ وحدت و یکجہتی کے نقطۂ نظر سے پورے عالم اسلام کے لیے ایک اسلامی کیلنڈر کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ یہ تجویز نیک نیتی پر مبنی ہو سکتی ہے لیکن یہ نصوصِ شریعت سے متصادم ہے کیونکہ اولاً روزہ یا عید الفطر اور عید الاضحیٰ کا اہتمام ایک عبادت ہے۔ یہ دوسری قوموں کی طرح کے صرف ایک تہوار نہیں ہیں بلکہ اصلاً یہ عبادات ہیں تاہم ان میں اجتماعیت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اجتماعیت اسی حد تک ممکن ہو گی جس حد تک نصوصِ شریعت اجازت دیں گی، جیسے ایک علاقے کے لوگ ایک ہی وقت میں روزے کا آغاز یا اختتام کریں، عیدین کی نماز کھلے گراؤنڈ میں ادا کریں، وغیرہ۔ لیکن اس اجتماعیت کو اس حد تک نہیں بڑھایا جا سکتا کہ پورے عالم اسلام کو یا کسی وسیع ایک ملک کو کسی ایک علاقے کی رؤیت کا پابند کر دیا جائے یا ایک حسابی کیلنڈر بنا دیا جائے جس میں فلکیات کے اعتبار سے رمضان، شوال اور ذوالحجہ اور

دیگر اسلامی مہینوں کے آغاز کا تعین کر دیا جائے اور پورے عالم اسلام کو اس کے مطابق مہینوں کے آغاز و اختتام کا پابند بنا دیا جائے۔ ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا کیونکہ اس طرح اجتماعی طور پر عیدین وغیرہ کو بطور تہوار منانے کے جذبے کی تو تسلی ہو جائے گی لیکن ایسا کرنا نصوصِ شریعت سے متصادم ہوگا، نبی ﷺ کا فرمان ہے: ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی افطار کرو۔'' یعنی روزہ رکھنا چھوڑو۔ اسی حدیث میں آگے یہ الفاظ ہیں: «فَإِنْ غُبِّيَ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِينَ» ''اگر مطلع ابر آلود ہو تو شعبان کے 30 دن پورے کرو۔''[1]

گویا چاند کا دیکھا جانا ضروری ہے کیونکہ مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں یہ امکان بھی یقیناً موجود ہے کہ چاند موجود ہو لیکن نظر نہ آسکے لیکن امکان کو اہمیت نہیں دی گئی بلکہ رؤیت ہی کو اصل قرار دیا گیا۔ اس سے اسی امر کی تائید ہوتی ہے کہ محض فلکیات کی بنیاد پر ایسا کیلنڈر بنانا جائز نہیں ہے۔ جس کی بنیاد پر پورا عالمِ اسلام ایک ہی دن رمضان، شوال اور ذوالحجہ وغیرہ کا آغاز کرے کیونکہ اس حسابی کیلنڈر کی بنیاد امکان، تخمینہ اور غیر یقینی علم پر ہوگی جبکہ حکم رؤیت (دیکھنے) کا اعتبار کرنے کا ہے۔

بنابریں عیدین وغیرہ کسی نہ کسی حیثیت سے ملی تہوار ضرور ہیں لیکن اصلاً یہ عبادات ہیں، جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں جو سب سے اہم عبادت ہے لیکن کسی کے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ اس میں ایسی اجتماعیت ہونی چاہیے کہ ایک ہی وقت میں پورے عالم اسلام میں ہر نماز پڑھی جائے کیونکہ مطالع کے اختلاف کی وجہ سے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی طرح رمضان اور عیدین وغیرہ کا معاملہ ہے، مطالع کے اختلاف کی وجہ سے پورے عالم اسلام کے لیے ایک کیلنڈر نہیں بنایا جا سکتا۔

[1] صحيح البخاري، الصوم، حديث: 1909.

عہدِ صحابہ کے اس واقعے سے بھی، جو پہلے حضرت کریب کا گزر چکا ہے، اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ مطالع مختلف ہونے کی صورت میں اپنے اپنے علاقے ہی کی رؤیت ضروری ہوگی، یا زیادہ سے زیادہ ایک ملک کے لیے کافی ہوگی، بشرطیکہ اس کے مختلف صوبوں اور حصوں کے مطالع میں زیادہ اختلاف نہ ہو۔ کسی دور دراز کے ملک کی رؤیت، جس کا مطلع اور نظام الاوقات مختلف ہو، دوسرے علاقوں کے لیے قابلِ اعتبار نہیں ہوگی۔ یہ واقعہ صحیح مسلم میں ہے۔

یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب مطالع میں زیادہ اختلاف ہو تو ایک کی رؤیت دوسرے کے لیے معتبر نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے شام کی رؤیت کو اہلِ مدینہ کے لیے ناکافی سمجھا اور اس امر کا انتساب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف فرمایا۔

جن ممالک کے مطالع مختلف نہ ہوں، وہ ایک دوسرے کی رؤیت کا اعتبار کرسکتے ہیں

البتہ ایسے قریبی ممالک جن کے مطالع میں زیادہ اختلاف نہ ہو اور وہ رؤیت والے ملک کے مغرب میں واقع ہوں تو وہ اس کی رؤیت پر اعتماد کرسکتے ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے، چنانچہ ایک سعودی عالم و مفتی شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الجبرین رحمہ اللہ (متوفی جولائی 2009ء) تحریر فرماتے ہیں:

"شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ جن ممالک میں چاند دیکھا گیا اور جو ممالک ان سے آگے، یعنی مغرب کی جانب ہوں، ان سب پر روزہ رکھنا فرض ہوگا اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ جب کسی ایک ملک میں چاند دیکھا گیا

ہوتو ضروری ہے کہ اس سے بعد والے ممالک میں بھی چاند نظر آئے گا، اس لیے کہ چاند سورج کے بعد غروب ہوتا ہے اور جیسے جیسے اس میں تاخیر ہوگی چاند سورج سے دور ہوتا چلا جائے گا اور زیادہ واضح اور ظاہر ہوتا چلا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر بحرین میں چاند دیکھا گیا تو ان ممالک کے لوگوں پر بھی روزہ رکھنا واجب ہو جائے گا جو اس کے بعد جیسا کہ نجد، حجاز، مصر اور مغرب (مراکش وغیرہ) ہیں مگر جو ممالک بحرین سے پہلے واقع ہیں، مثلاً: ہندوستان، سندھ اور ماوراء النہر (روس کے بالائی علاقے) کے ممالک، ان ملکوں کے لوگوں پر روزہ واجب نہیں ہوگا۔'' (فتاوی الصیام، ص:72، طبع دارالسلام)

امام ابن تیمیہ کی رائے پر مبنی اس اقتباس میں مثال دے کر واضح کر دیا گیا ہے کہ اس طرح کے ممالک کا مطلع ایک ہوسکتا ہے اور وہاں سب ممالک کسی ایک ملک کی رؤیت پر رمضان، شوال وغیرہ کا آغاز کر سکتے ہیں۔

رؤیت کے اثبات کے لیے کتنے گواہ ضروری ہیں؟

احادیث میں چاند دیکھ کر روزہ رکھنے اور چاند دیکھ کر ہی افطار، یعنی عید کرنے کا جو حکم ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا ہر ہر مسلمان کا دیکھنا ضروری ہے یا کتنے مسلمانوں کا دیکھنا کافی ہے؟

یہ بات تو واضح کی جا چکی ہے کہ جن ممالک کے مطالع ایک ہیں یا ان میں زیادہ فرق نہیں ہے، وہ ایک دوسرے کی رؤیت کی بنیاد پر رمضان وشوال وغیرہ کا آغاز کر سکتے ہیں۔

اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ رؤیت کا اثبات کس طرح ہوگا؟ ظاہر بات ہے کہ ہر شخص کو تو دیکھنے کا پابند نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے علماء کے ایک گروہ کی رائے تو یہ ہے کہ ایک عادل مسلمان کی گواہی سے رؤیت کا اثبات ہو جائے گا۔ امام شوکانی اور صاحبِ ''فقہ السنہ'' وغیرہم نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ دوسرے علماء کی رائے ہے کہ رمضان المبارک کے لیے ایک عادل مسلمان کی گواہی اور رمضان کے علاوہ دیگر مہینوں (شوال، ذوالحجہ وغیرہ) کے لیے دو عادل گواہوں کی گواہی ضروری ہے۔ شرعی نصوص کی رُو سے یہ دوسری رائے راجح ہے۔ واللّٰہ أعلم.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

«تَرَاءَ ى النَّاسُ الْهِلَالَ فَأَخْبَرْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أَنِّي رَأَيْتُهُ، فَصَامَ وَ أَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ»

''لوگوں نے چاند دیکھنے کی کوشش کی (لیکن میرے سوا کسی کو نظر نہیں آیا) چنانچہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے تو آپ ﷺ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔''[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رمضان المبارک کے لیے ایک عادل مسلمان کی گواہی کافی ہے۔ امام ابوداود نے بھی جو باب باندھا ہے اس کا ترجمہ بھی یہ ہے کہ ''رمضان کے چاند کے اثبات کے لیے ایک شخص کی گواہی کا بیان۔'' اور اس کے تحت مذکورہ حدیث بیان کی ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اور اس باب سے پہلے امام ابوداود رحمہ اللہ نے باب باندھا ہے: «بَابُ شَهَادَةِ رَجُلَيْنِ عَلٰى رُؤْيَةِ هِلَالِ شَوَّالٍ» ''شوال کے چاند کے اثبات کے لیے دو آدمیوں

[1] سنن أبي داود، الصيام، باب في شهادة الواحد علٰى رُؤية هلال رمضان، حديث: 2340.

کی گواہی کا بیان۔'' اور اس کے تحت امیرِ مکہ حارث بن حاطب کا یہ واقعہ بیان کیا ہے:

«أَنَّ أَمِيرَ مَكَّةَ خَطَبَ ثُمَّ قَالَ: عَهِدَ إِلَيْنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ نَنْسُكَ لِلرُّؤْيَةِ، فَإِنْ لَمْ نَرَهُ وَ شَهِدَ شَاهِدَا عَدْلٍ نَسَكْنَا بِشَهَادَتِهِمَا»

''امیر مکہ نے خطاب کیا اور اس میں اس نے یہ بھی کہا: رسول اللہ ﷺ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم چاند دیکھ کر حج کے ارکان ادا کریں۔ اگر ہم خود نہ دیکھ سکیں اور دو عادل گواہ گواہی دے دیں تو ہم ان کی گواہی پر حج کر لیں۔''

اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ امیر مکہ نے یہ بھی کہا کہ ''اس مجلس میں بلاشبہ ایسی شخصیت موجود ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے متعلق مجھ سے زیادہ باخبر ہے۔'' اور یہ کہہ کر انھوں نے اس شخصیت کی طرف اشارہ کیا، یہ شخصیت حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی تھی، ان سے جب پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: «بِذٰلِكَ أَمَرَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ»

''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی بات کا حکم دیا ہے۔''

امام ابوداود نے ایک دوسری روایت یہ بیان کی ہے کہ ربعی بن حراش ایک صحابی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

«اِخْتَلَفَ النَّاسُ فِي آخِرِ يَوْمٍ مِنْ رَمَضَانَ، فَقَدِمَ أَعْرَابِيَّانِ فَشَهِدَا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ بِاللّٰهِ لَأَهَلَّا الْهِلَالَ أَمْسِ عَشِيَّةً، فَأَمَرَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَلنَّاسَ أَنْ يُفْطِرُوا، زَادَ خَلَفٌ فِي حَدِيثِهِ: وَ أَنْ يَغْدُوا إِلٰى مُصَلَّاهُمْ»

''رمضان کے آخری دن کی بابت لوگوں کا اختلاف ہوگیا تو دو اعرابی (دیہاتی) آئے اور انھوں نے نبی ﷺ کے سامنے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ انھوں نے (گاؤں سے مدینہ آتے ہوئے) کل شام کو چاند دیکھا ہے تو رسول اللہ ﷺ

نے لوگوں کو حکم دیا کہ روزے توڑ لیں۔ اور حدیث کے ایک راوی خلف کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آپ نے حکم فرمایا: ''اگلے دن صبح کو (نماز عید کے لیے) عیدگاہ جائیں۔''

یہ دونوں حدیثیں (2339,2338) سنن ابوداود کے اس باب میں موجود ہیں جس کا حوالہ پہلے گزرا ہے۔ پہلی حدیث میں دو گواہوں کی گواہی پر فیصلہ کرنے کا حکم ہے اور دوسری حدیث میں دو گواہوں کی گواہی پر فیصلہ کرنے کی عملی مثال ہے۔ پہلی حدیث میں حج کے ارکان کی ادائیگی، یعنی ذوالحجہ کے چاند کی صراحت ہے اور دوسری حدیث میں ہلالِ شوال کا ذکر ہے۔ ان دونوں حدیثوں سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ رمضان المبارک کے چاند کے علاوہ دیگر مہینوں کے اثبات کے لیے دو عادل مسلمان گواہوں کی گواہی ضروری ہے اور رمضان کے لیے ایک عادل مسلمان کی گواہی کافی ہے۔

عادل، جس کی گواہی معتبر ہے، کون ہے؟

عادل کا مطلب ہے کہ وہ مسلمان، متقی، احکام وفرائض اسلام کا پابند ہو اور کوئی واضح جرح اس پر ثابت نہ ہو۔ دوسری حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شوال کے چاند کی معتبر گواہی اگر تاخیر سے ملے تو روزے اسی وقت توڑ دیے جائیں اور نمازِ عید کا وقت نکل چکا ہو تو نمازِ عید اگلے دن ادا کی جائے۔

اگر کسی ملک میں مطلع اکثر ابر آلود رہتا ہو تو......؟

1979ء میں سنگاپور میں وہاں کی جمعیت دعوت اسلامی اور ایک دوسری تنظیم

اسلامی کونسل کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہوا۔ جمعیت کی رائے میں ماہِ رمضان کی ابتدا اور انتہا ادلۂ شرعیہ کے عموم کے مطابق شرعی رؤیت کے مطابق ہونی چاہیے جبکہ سنگاپور کی اسلامی کونسل کی رائے یہ تھی کہ رمضان کی ابتدا اور انتہا فلکیات کے حساب کے مطابق ہونی چاہیے کیونکہ اس وقت ایشیا کے ممالک کا مطلع عموماً اور سنگاپور کا مطلع خصوصاً ابر آلود تھا، لہٰذا اکثر ممالک میں رؤیت کے مقامات ابر آلود ہونے کی وجہ سے یہ ایک ایسا عذر ہے کہ جس کی وجہ سے فلکیات کے حساب (کیلنڈر) پر انحصار کیے بغیر چارہ نہیں۔

یہ مسئلہ سعودی عرب کی فقہی کونسل میں جس میں کبار علماء شامل ہیں، پیش ہوا، اسلامی فقہی کونسل کے ارکان نے نصوصِ شرعیہ کی روشنی میں اس موضوع کا خوب مطالعہ کیا اور اس کی روشنی میں جمعیت دعوت اسلامی کی تائید کی کیونکہ اس موقف کی تائید میں شرعی دلائل واضح طور پر دلالت کناں ہیں۔

اسلامی فقہی کونسل کی رائے ہے کہ سنگاپور اور ایشیا کے بعض دیگر ممالک جہاں عموماً مطلع ابر آلود رہتا ہے اور ان جیسے علاقوں میں مسلمانوں کے لیے چاند دیکھنا ممکن نہیں ہوتا، انھیں چاہیے کہ اس سلسلے میں ان اسلامی ملکوں پر اعتماد کریں جو چاند کے سلسلے میں کسی حساب کے بجائے صرف اور صرف رؤیتِ بصری پر اعتماد کرتے ہیں تاکہ نبی ﷺ کے اس ارشاد پر عمل ہو سکے کہ ”چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی افطار (روزہ رکھنا ترک اور عید) کرو۔“ [1]

اس فتویٰ کی رُو سے ایسے علاقوں کے لوگوں کے لیے جہاں مطلع اکثر ابر آلود رہتا ہے اور چاند کا دیکھنا ممکن نہیں ہوتا، ایسے علاقوں کی رؤیت کے مطابق رمضان و

[1] فتاویٰ اسلامیہ: 160,159/2، مطبوعہ دارالسلام۔

شوال کا آغاز کرنا جائز ہے جہاں شریعت کے مطابق رؤیت بصری پر فیصلہ کیا جاتا ہے، جیسے سعودی عرب، پاکستان وغیرہ ہیں، گویا محض فلکیات پر اعتبار کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرح شرعی حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہے جو کسی مسلمان کے شایاں نہیں ہے۔

ہمیشہ 30 روزے رکھنا بھی جائز نہیں

علاوہ ازیں ایسے علاقوں کے لوگوں کے لیے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ یہ سوچ کر کہ ہمیں چاند تو نظر ہی نہیں آتا، ہمیشہ 30 روزے رکھتے رہیں اور کسی بھی ملک کی رؤیت بصری پر اعتماد نہ کریں کیونکہ اس طرح بھی قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی ہوتی ہے، اس لیے کہ مہینہ اللہ ہی کے حکم سے کبھی 29 دن کا اور کبھی 30 دن کا ہوتا ہے اور وہ دنوں کی اس کمی بیشی کو اپنے طور پر ختم کردیں تو یہ یقیناً حدودِ الٰہی سے تجاوز ہوگا۔

﴿ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ [1]

ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرنے سے روزے 30/29 کے بجائے کم یا زیادہ ہو جائیں؟

مذکورہ تفصیل سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے جو بعض ایسے لوگ پوچھتے ہیں جن کو رمضان المبارک میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں آنے جانے کا اتفاق ہوتا ہے، ان کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ بعض دفعہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں رمضان کے آغاز یا اختتام پر آتے یا جاتے ہیں تو ان کے روزے 28 رہ جاتے ہیں یا

[1] البقرۃ2:229.

بعض دفعہ 31 ہو جاتے ہیں۔ وہ کیا کریں؟ تو حکم یہی ہے کہ جس ملک میں بھی جائیں اگر وہاں ابھی رمضان ختم نہیں ہوا ہے تو وہاں جانے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ وہ روزے رکھیں، چاہے وہ سفر کرنے سے پہلے اپنے ملک میں اس ملک سے ایک یا دو دن پہلے روزے رکھ چکے ہوں۔ اس طرح امکان ہے کہ ان کے روزے 30 کے بجائے 31 ہو جائیں، لیکن ان کے لیے وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ہی عید الفطر کرنی ضروری ہوگی، اس سے پہلے وہ روزہ رکھنا ترک نہیں کریں گے۔ ان کا ایک زائد روزہ ان کے لیے نفلی ہو جائے گا۔ اسی طرح یہ بھی امکان ہے کہ جب وہ دوسرے اسلامی ملک میں جائیں تو وہاں ہلالِ شوال نظر آ جائے جبکہ ان کے روزے 28 ہی ہوں، اس صورت میں بھی ان کے لیے عید الفطر ان کے ساتھ ہی کرنی ضروری ہوگی اور یہ ایک روزے کی بعد میں قضا دے لیں گے۔

اور اگر 29 روزے پورے ہو جائیں تو پھر کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا، ان کے روزے پورے رمضان کے روزے ہی شمار ہوں گے کیونکہ مہینہ کبھی 29 دن کا بھی ہوتا ہے، البتہ 28 یا 31 دن کا نہیں ہوسکتا۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے دن لمبا ہو جائے، مثلاً: ایک شخص روزے کی حالت میں غروب شمس کے قریب سفر کا آغاز کرتا ہے لیکن وہ جس ملک کی طرف سفر کر رہا ہے وہاں سورج تاخیر سے غروب ہوتا ہے، بنابریں اس کا دن گھنٹہ یا دو گھنٹہ لمبا ہو جائے، تو ظاہر بات ہے کہ وہ راستے میں روزہ اسی وقت افطار کرے گا جب سورج کے غروب ہونے کا یقین ہو جائے گا چاہے اپنے ملک کے مقابلے میں اس کا روزہ کچھ لمبا ہو جائے۔ علاوہ ازیں اس کے برعکس دن چھوٹا بھی ہوسکتا ہے اس صورت میں اس کو سہولت مل جائے گی اور معمول سے کچھ دیر پہلے روزہ افطار کرلے گا۔

گویا جس طرح روزہ افطار کرنے کے لیے غروبِ شمس کا تیقُّن ضروری ہے چاہے دن کچھ لمبا یا کچھ چھوٹا ہو جائے اسی طرح ایک مسلمان جس ملک میں بھی جائے گا، وہاں کی رؤیت کے مطابق ہی اسے عید الفطر کرنی ہوگی، یعنی روزہ رکھنے یا چھوڑنے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ اگر وہاں کی رؤیت پر اس کے روزے پورے 29 یا 30 ہو جاتے ہیں تو فبھا اور اگر 31 ہو جاتے ہیں تو ایک روزہ نفلی ہو جائے گا لیکن وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ اس دن کا روزہ رکھنا ضروری ہوگا اور 28 ہوں گے تو ایک روزہ عید الفطر کے بعد رکھنا ہوگا کیونکہ حکم ہے:

«اَلصَّوْمُ يَوْمَ تَصُومُونَ، وَ الْفِطْرُ يَوْمَ تُفْطِرُونَ، وَالْأَضْحٰى يَوْمَ تُضَحُّونَ»

"روزے کا وہ دن ہے جس دن تم روزہ رکھو اور روزہ افطار (عید) کرنے کا وہ دن ہے جس دن تم افطار (عید) کرو اور عید الاضحیٰ کا وہ دن ہے جس دن تم قربانیاں کرو۔"[1]

اس حدیث میں خطاب مسلمانوں سے ہے اور مسلمانوں سے مراد اپنے اپنے علاقے (یا ایک متحد المطالع ملک) کے مسلمان ہیں، اس میں ایک علاقے کی حد تک مسلمانوں کو اجتماعیت کی تاکید ہے جس سے مسئلۂ زیر بحث کی تائید ہوتی ہے۔

کچھ رؤیتِ ہلال کمیٹی اور اس کی پیش کردہ تجاویز کے بارے میں

اب آخر میں ہم دو امور پر مزید گفتگو کرنا مناسب سمجھتے ہیں:

1. وقتاً فوقتاً مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے فیصلوں اور طریق کار پر تنقید ہوتی رہتی

[1] جامع الترمذي، الصوم، باب ما جاء أن الصوم يوم تصومون......، حديث: 697.

ہے، اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس کا کوئی جواز ہے یا نہیں؟

2 رؤیت ہلالِ کمیٹی کو مزید بہتر کس طرح بنایا جا سکتا ہے اور اس کے لیے کیا مزید اقدامات کیے جانے چاہئیں؟

بعض حلقوں کی طرف سے بلکہ چند سال قبل خود وزارتِ مذہبی امور کی طرف سے یہ تجویز منظر عام پر آئی تھی کہ رؤیتِ ہلال کمیٹی کا وجود ختم کر دیا جائے اور یہ معاملہ خود وزارت مذہبی امور سنبھال لے اور وہی علماء کے فیصلے کے بغیر رؤیت یا عدم رؤیت کا اعلان کرے، البتہ ایک اطلاعاتی مرکز قائم کیا جائے جس میں تمام جدید سائنسی آلات اور سہولیات موجود ہوں۔ وزارت مذہبی اُمور اس کی مدد سے چاند کے دیکھنے اور اس کا فیصلہ کرنے کا اہتمام کرے۔

3 سعودی عرب کو حرمین مقدسین کی وجہ سے پورے عالم اسلام میں عزت و احترام کا ایک خاص مقام حاصل ہے، پاکستان میں اس کی رؤیت اور فیصلے کو بنیاد بنالیا جائے اور اس کے مطابق ہی یہاں رمضان کے آغاز کا اور عیدین منانے کا اہتمام کیا جائے۔ یہ اتحادِ اُمت کی اچھی مثال بھی بن سکتی ہے۔وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے خیال میں وزارتِ مذہبی اُمور کی مذکورہ دونوں ہی تجویزیں نہ صرف درست نہیں بلکہ قابل عمل بھی نہیں!!

جہاں تک پہلی تجویز کا تعلق ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلے سے علمائے کرام کا تعلق ختم کر دیا جائے اور یہ معاملہ کلیتًا حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے۔ لیکن اس سے مسئلہ سلجھے گا نہیں، مزید اُلجھے گا، اس لیے کہ یہ ایک شرعی مسئلہ ہے جس میں رہنمائی کے لیے عوام دینی رہنماؤں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور کریں گے کیونکہ وہ شرعی مسئلے میں حکومت پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں۔

خود مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے قیام کا پس منظر بھی یہی ہے کہ ایوب خاں کے دور میں ایک دو مرتبہ حکومت نے اپنے اعلان کے مطابق عید منوانے کی کوشش کی جو بری طرح ناکام ہوئی اور عوام نے علماء کی رائے پر ہی مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ اس تجربے کی روشنی میں بالآخر حکومت نے رؤیتِ ہلال کمیٹی قائم کی اور یہ معاملہ کلیتًا اس کمیٹی کے ذریعے سے علماء کے سپرد کردیا۔ رؤیتِ ہلال کے قیام کے بعد یہ معاملہ نہایت خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔ کمیٹی کے فیصلے میں بعض دفعہ تاخیر ہوجاتی یا اس کا فیصلہ ہدفِ تنقید بنتا ہے، تو اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ یا تو حکومت کے ناقص انتظامات تاخیر کا سبب بنتے ہیں یا ناقص اطلاعات اس کا باعث ہیں۔ اصل ضرورت ان وجوہات کا خاتمہ ہے جن سے تاخیر ہوتی ہے یا اگر فیصلہ ہدفِ تنقید بنتا ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ رؤیتِ ہلال کمیٹی کا وجود ہی تحلیل کردینا چاہیے جس کا کوئی قصور نہیں، کیونکہ کمیٹی کا کام صرف چاند دیکھنا نہیں ہے بلکہ ''چاند دیکھے جانے یا نہ دیکھے جانے کا فیصلہ کرنا ہے۔'' اور کمیٹی اپنا یہ کام، یعنی رؤیت کا فیصلہ کرنے میں دستیاب وسائل کی حد تک اپنی ممکنہ مساعی بروئے کار لاتی ہے، اس میں بالعموم کوتاہی نہیں کرتی۔

کمیٹی کی بہتر کارکردگی کے لیے مزید اقدامات کی ضرورت

اس تاخیر کے خاتمے یا غلط فیصلے کے اِزالے کے لیے مزید چند باتوں کا اہتمام ضروری ہے تاکہ کمیٹی کی راہ میں جو مشکلات ہیں، وہ دُور ہوں اور اس کی کارکردگی کو مزید بہتر بنایا جاسکے اور یہ دو اقدامات ہیں جو حسب ذیل ہیں:

ایک یہ کہ اگر مصدقہ اطلاعات ایسی ملیں جن سے کمیٹی کا فیصلہ غلط ثابت ہوتا ہو تو ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ کمیٹی کے ارکان دوبارہ جمع ہوں اور تحقیق وتفتیش کے بعد اگر

فی الواقع پہلا فیصلہ غلط ہو تو اسے تبدیل کرنے میں کوئی عار اور سبکی محسوس نہیں کرنی چاہیے نہ اسے انا اور وقار کا مسئلہ بنانا چاہیے۔ شنید ہے کہ سعودی عرب میں بھی بعض دفعہ فیصلہ تبدیل کر کے نیا اعلان کیا گیا ہے۔ اس نظیر پر یہاں بھی عمل کیا جانا چاہیے، یہ ایک شرعی مسئلہ ہے جس میں شریعت ہی کی رو سے فیصلہ تبدیل کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ملک میں عیسوی تقویم کے بجائے قمری تقویم کو اختیار کیا جائے، تاکہ لوگ چاند دیکھنے کی کوشش کیا کریں۔ ہم نے چونکہ قمری تقویم سے تعلق بالکل منقطع کر دیا ہے، اس لیے لوگ چاند دیکھنے کا اہتمام ہی نہیں کرتے، جو ایک بہت بڑی کوتاہی ہے۔ اس کوتاہی کا ازالہ بھی نہایت ضروری ہے۔ اور اس کا ایک طریقہ تو وہی ہے جو ہم نے عرض کیا، یعنی قمری تقویم کو اختیار کرنا، قمری تاریخیں ہی ملک میں رائج ہوں، اسی کے مطابق تنخواہیں ملیں اور اسی کے مطابق تعطیلات وغیرہ ہوں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہر قمری تاریخ کو 29 ویں شب کے لیے حکومت کی طرف سے چاند دیکھنے کی اپیل شائع ہو۔ حکومت اپنے مخصوص مقاصد وعزائم کے اظہار کے لیے بلا مبالغہ کروڑوں روپے اشتہارات کی مد میں خرچ کرتی ہے، اگر وہ چند لاکھ روپے اس کام پر بھی صرف کر دیا کرے تو اس کے بہترین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ چاند کی ہر 29 تاریخ کے قومی اخبارات میں اشتہار کے طور پر یہ اعلان شائع ہو کہ ''لوگ آج شام کو چاند دیکھنے کا اہتمام کریں اور چاند نظر آنے کی صورت میں حسبِ ذیل نمبروں پر فون کے ذریعے سے اطلاع دیں......'' ہر علاقے کے اخبارات میں وہاں کی زونل کمیٹی کا فون نمبر دیا جائے، دیگر ضروری نمبر دیے جا سکتے ہیں۔ بہرحال ایک مسلمان مملکت کے لیے ضروری ہے کہ وہاں ذوق وشوق کے ساتھ چاند دیکھنے کا اہتمام ہو، اگر

اس اہتمام میں کمی ہو تو اسے دور کیا جائے اور لوگوں میں چاند دیکھنے کی رغبت اور شوق پیدا کیا جائے۔

علامہ قرافی رحمہ اللہ نے رؤیتِ ہلال کے مسئلے پر بہت تفصیل سے لکھا ہے اور یہ بحث ان کی مشہور تصنیف الفُرُوق کے صفحہ 8 تا 15 میں پھیلی ہوئی ہے۔ جس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ رؤیتِ ہلال کے دو پہلو ہیں: ایک خبر کا اور دوسرا شہادت کا، اس اعتبار سے اس میں قضاء (فیصلہ) کا پہلو نمایاں ہے۔

خبر کی حد تک، تمام انتظامات کی ذمہ دار حکومت ہے (ان میں جو کمی اور کوتاہی ہے، حکومت اس کے ازالے کا اہتمام کرے) کہ ہر ممکنہ طریقے سے، سائنسی آلات وغیرہ کی مدد لے کر یا عوام میں شعور اور رؤیت کا اہتمام پیدا کر کے کمیٹی کو چاند کے بارے میں تمام خبریں بروقت پہنچائی جائیں۔

جہاں تک شہادت کا معاملہ ہے، اس کی جانچ پرکھ کا کام علماء کا ہے، وہی اس کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں کہ رؤیتِ ہلال کی جو شہادتیں میسر آئی ہیں، وہ کس حد تک قابل قبول یا قابل رد ہیں اور آیا ان کی بنیاد پر رؤیت کا فیصلہ صحیح ہے یا غلط؟...... حکومت کا کوئی انتظامی ادارہ شہادتوں کی جانچ پڑتال کا اہل نہیں کیونکہ اس میں حکومت کی سیاسی مصلحتیں اور مفادات درمیان میں آسکتے ہیں جو اس سارے کام کو مشکوک بنا دیں گے اور اسی وجہ سے عوام ان معاملات میں حکومت کے فیصلوں پر اعتماد نہیں کرتے۔ جبکہ علماء کے سامنے اس قسم کے کوئی مفادات نہیں ہوتے، وہ تو صرف لوجہِ اللہ عوام کی دینی رہنمائی کا فرضِ منصبی ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بنا بریں رؤیتِ ہلال کمیٹی کے ختم کرنے کی تجویز غیر معقول اور ایک بنے بنائے نظم کو بگاڑنے کی مذموم سعی ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کمیٹی کو زیادہ مؤثر اور قابل

اعتماد بنایا جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس میں علماء کو صرف میرٹ کی بنیاد پر شامل کیا جائے، یعنی ان علماء کو کمیٹی کا ممبر بنایا جائے جو مستند عالم اور عوام کے معتمد علیہ ہوں۔ محض سیاسی رشوت کے طور پر حکومت کی حلیف مذہبی جماعتوں کے نمائندوں اور ان کے تجویز کردہ علماء ہی کو شامل نہ کیا جائے (جیسا کہ عام طور پر معمول ہے) بلکہ حکومت کی حمایت یا مخالفت سے قطع نظر اہل تر افراد کو نامزد کیا جائے۔

4 سعودی عرب، بلاشبہ حرمین شریفین کے خادم ہونے اور دیگر بہت سی امتیازی خصوصیات کا حامل ہونے کی وجہ سے نہایت قابل احترام ہے، لیکن پاکستان اور سعودی عرب کے مطلع میں بہت زیادہ فرق ہے، اس لیے سعودی عرب کی رؤیت کو پاکستان کے لیے بھی قابل اعتبار گردانا شرعی لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہوگا۔ شرعی نصوص کا تقاضا اور اکثر علماء کا فیصلہ یہی ہے کہ ایک علاقے کی رؤیت دوسرے علاقوں کے لیے کافی نہیں ہے الا یہ کہ مطلع کا زیادہ فرق نہ ہو جیسا کہ پہلے اس پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ اس اعتبار سے سعودی عرب کے فیصلے کو پاکستان کے لیے بھی لازمی قرار دینا شرعی نصوص کے خلاف ہوگا۔

خلاصۂ مباحث

مذکورہ مباحث و تفاصیل کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

- عالمِ اسلام میں ایک ہی دن عید منانے اور رمضان وغیرہ کا آغاز کرنے کا جو تصور ہے، اس کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے، حتی کہ سعودی عرب کی رؤیت کو بھی اس کے لیے بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔
- عالمِ اسلام کے ممالک میں مطالع کا باہم شدید اختلاف اور فرق ہے، اس کے

ہوتے ہوئے کسی ایک ملک کی رؤیت کو عالَم اسلام کے تمام ممالک کے لیے کافی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

❁ ہر علاقے کے لوگوں کے لیے ان کی اپنی رؤیت ضروری ہے، البتہ ایک ملک کی حد تک کسی ایک علاقے یا ایک شہر کی رؤیت کو پورے ملک کے لیے قابل اعتبار گردانا جاسکتا ہے کیونکہ ایک ملک کے شہروں کے مطالع میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا، تاہم مختلف صوبوں میں اگر الگ الگ عیدیں بھی اپنی اپنی رؤیت کی بنیاد پر ہوں تو شرعاً یہ بھی جائز ہے۔

❁ رصد و فلکیات کے علم سے چاند کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں فائدہ اٹھانا اور اس پر اعتماد کرنا جائز ہے، تاہم فلکیات کی بنیاد پر سارے سال کے لیے کیلنڈر بنانا ناجائز ہے۔

❁ اہل خیبر کے معاملے کو علماء باہم مل کر حل کریں جیسا کہ ہم نے بھی اس سلسلے میں ایک تجویز پیش کی ہے، لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو سکے تو ان کا باقی صوبوں سے پہلے چاند دیکھ کر الگ عید منانا یا رمضان کا آغاز کرنا کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے کہ اس کو بہت زیادہ اہمیت دی جائے۔ ان کے معاملے کو ان کے علماء ہی پر چھوڑ دیا جائے۔

❁ مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کا طریقۂ کار صحیح ہے اور اس کے فیصلے کے مطابق عید و رمضان کا آغاز کرنا صحیح ہے، اہل خیبر بھی اگر اس کے مطابق ہی عیدین و رمضان کا اہتمام کریں تو بہتر ہے، تاہم اگر وہ اپنی رؤیت کے مطابق عمل کریں اور اپنے لوگوں کی شہادتوں پر اعتماد کریں جیسا کہ سالہا سال سے وہاں ایسا ہی ہوتا آ رہا ہے تو شرعاً کوئی حرج والی بات نہیں ہے۔

❁ پاک وہند کے علمائے احناف کے نزدیک بھی مطالع کا فرق و اختلاف معتبر ہے، اس لیے پاکستان میں بعض علمائے احناف اور اہل خیبر کی اس رائے میں کوئی وزن نہیں ہے کہ پورے عالمِ اسلام میں ایک ہی دن عید منائی جائے۔

❁ جن ممالک میں موسم اکثر ابر آلود رہتا ہو، وہ ایسے ممالک کی رؤیت پر اعتماد کر سکتے ہیں جہاں رؤیت کے لیے شرعی تقاضوں کا اہتمام کیا جاتا ہو۔
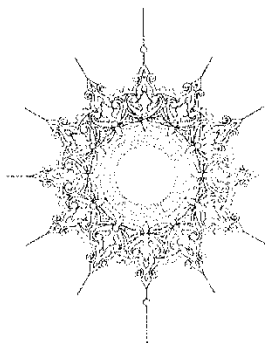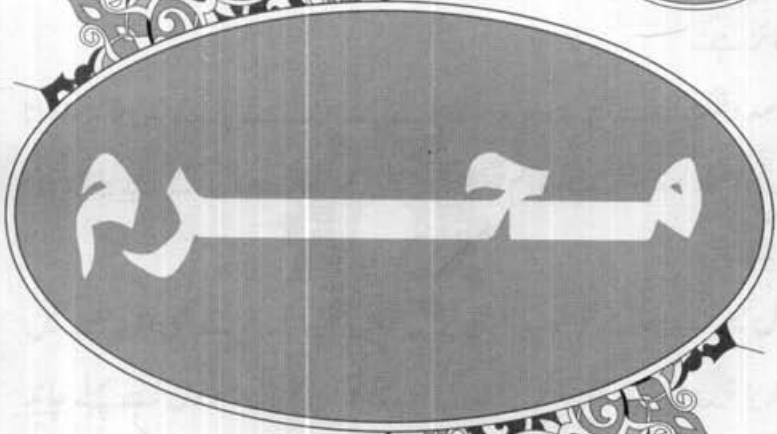
١
محرم
فضائل واعمال اور رسومات

محرم الحرام

ماہ محرم ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے جس کی بنیاد تو نبی کریم ﷺ کے واقعۂ ہجرت پر ہے لیکن اس اسلامی سن کا تقرر اور آغازِ استعمال 17 ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت سے ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ یمن کے گورنر تھے، ان کے پاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرامین آتے تھے جن پر تاریخ درج نہیں ہوتی تھی، 17 ھ میں حضرت ابوموسیٰ کے توجہ دلانے پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو اپنے ہاں جمع فرمایا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا، تبادلۂ افکار کے بعد قرار پایا کہ اپنے سن تاریخ کی بنیاد واقعۂ ہجرت کو بنایا جائے اور اس کی ابتدا ماہ محرم سے کی جائے کیونکہ 13 نبوت کے ذوالحجہ کے وسط میں بیعت عقبہ اور مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا عزم ومنصوبہ طے کر لیا گیا تھا اور اس کے بعد جو چاند طلوع ہوا وہ محرم کا تھا۔[1]

مسلمانوں کا یہ اسلامی سن بھی اپنے معنی ومفہوم کے لحاظ سے ایک خاص امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ مذاہب عالم میں اس وقت جس قدر سنین مروج ہیں وہ عام طور پر یا تو کسی مشہور انسان کے یوم ولادت کی یاد دلاتے ہیں یا وہ کسی قومی واقعۂ مسرت و شادمانی سے وابستہ ہیں کہ جس سے نسل انسانی کو بظاہر کوئی فائدہ نہیں، مثلاً: مسیحی سن

[1] فتح الباري، مناقب الأنصار، باب التاريخ، من أين أرّخوا التاريخ؟: 334/7، حديث: 3934، طبع دارالسلام.

کی بنیاد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یوم ولادت ہے۔ یہودی سن فلسطین پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی تخت نشینی کے ایک پرشوکت واقعے سے وابستہ ہے۔ بکرمی سن راجہ بکرماجیت کی پیدائش کی یادگار ہے، رومی سن سکندر فاتح اعظم کی پیدائش کو واضح کرتا ہے لیکن اسلامی سن ہجری عہد نبوت کے ایسے واقعے سے وابستہ ہے جس میں یہ سبق پنہاں ہے کہ اگر مسلمان اعلائے کلمۃ الحق کے نتیجے میں تمام اطراف سے مصائب و آلام میں گھر جائے، بستی کے تمام لوگ اس کے دشمن اور درپے آزار ہو جائیں، قریبی رشتہ دار اور خویش و اقارب بھی اس کو ختم کرنے کا عزم کر لیں، اس کے دوست احباب بھی اسی طرح تکالیف میں مبتلا کر دیے جائیں، شہر کے تمام سربرآوردہ لوگ اسے قتل کرنے کا منصوبہ باندھ لیں، اس پر عرصۂ حیات ہر طرح سے تنگ کر دیا جائے اور اس کی آواز کو جبرًا روکنے کی کوشش کی جائے تو اس وقت وہ مسلمان کیا کرے؟ اس کا حل اسلام نے یہ تجویز نہیں کیا کہ کفر و باطل کے ساتھ مصالحت کر لی جائے، تبلیغ حق میں مداہنت اور رواداری سے کام لیا جائے اور اپنے عقائد و نظریات میں لچک پیدا کر کے ان میں گھل مل جائے تاکہ مخالفت کا زور ٹوٹ جائے۔ بلکہ اس کا حل اسلام نے یہ تجویز کیا ہے کہ ایسی بستی اور شہر پر حجت تمام کر کے وہاں سے ہجرت اختیار کر لی جائے۔

چنانچہ اسی واقعۂ ہجرتِ نبوی پر سن ہجری کی بنیاد رکھی گئی ہے جو نہ تو کسی انسانی برتری اور تَفَوُّق کو یاد دلاتا ہے اور نہ شوکت و عظمت کے کسی واقعے کو بلکہ یہ واقعۂ ہجرت مظلومی اور بے کسی کی ایک ایسی یادگار ہے کہ جو ثبات قدم، صبر و استقامت اور راضی برضائے الٰہی ہونے کی ایک زبردست مثال اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔ یہ واقعۂ ہجرت بتلاتا ہے کہ ایک مظلوم و بے کس انسان کس طرح اپنے مشن میں کامیاب ہو سکتا ہے اور مصائب و آلام سے نکل کر کس طرح کامرانی و شادمانی کا زریں تاج اپنے سر پر رکھ سکتا ہے اور پستی و گمنامی

سے نکل کر کس طرح رفعت وشہرت اور عزت وعظمت کے بام عروج پر پہنچ سکتا ہے۔

وجہ تسمیہ

اسلامی سال کا، جسے قمری یا ہجری سال بھی کہا جاتا ہے، پہلا مہینہ محرم ہے، یعنی اسلامی سالِ نو کا آغاز ماہِ محرم سے ہوتا ہے، جیسے عیسوی سال کا آغاز جنوری سے ہوتا ہے۔ قمری مہینوں کے نام زمانۂ جاہلیت سے چلے آرہے ہیں سوائے محرم کے۔ اس کا نام ''صفر اول'' تھا جسے تبدیل کر کے ''محرم'' رکھا گیا۔ اسے ''شہر اللہ'' قرار دینے کی بھی یہی توجیہ بیان کی گئی ہے۔ [1]

عربوں نے اس کا نام محرم اس لیے رکھا کہ وہ لڑائی جھگڑے کو اس میں جائز نہیں سمجھتے تھے۔ [2] جبکہ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس مہینے کی حرمت میں تاکید پیدا کرنے کے لیے اس کا نام محرم رکھا گیا ہے کیونکہ عرب اسے کسی سال حلال قرار دے لیتے تھے اور اس کی جگہ دوسرے مہینے کو حرمت والا قرار دے لیتے تھے۔ [3]

فضائل

1 قرآن مجید نے چار مہینوں کو حرمت والا قرار دیا ہے، ان میں سے ایک ''محرم'' ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ﴾

''بے شک اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہی ہے اللہ کی کتاب میں جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار مہینے

[1] الديباج للسيوطي: 113/3، وجمهرة اللغة لابن دريد: 142/2. [2] لسان العرب: 10/15، مادة: ح، ر، م. [3] تفسير ابن كثير: 467/2.

حرمت والے ہیں۔"[1]

ان چار حرمت والے مہینوں کی وضاحت اور تعیین کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلسَّنَةُ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا، مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، ثَلَاثَةٌ مُتَوَالِيَاتٌ: ذُوالْقَعْدَةِ، وَذُوالْحِجَّةِ، وَالْمُحَرَّمُ، وَرَجَبُ مُضَرَ الَّذِي بَيْنَ جُمَادٰى وَشَعْبَانَ»

"سال میں بارہ مہینے ہیں، ان میں سے چار حرمت والے ہیں، تین مسلسل (لگاتار) ہیں، ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور (چوتھا) رجبِ مضر ہے جو شعبان اور جمادی (الأخری) کے درمیان ہے۔"[2]

2 شهر الله: نبی کریم ﷺ نے محرم کو شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) کہا ہے۔ یہ اعزاز کسی اور مہینے کو حاصل نہیں ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے:

«أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ، شَهْرُ اللّٰهِ الْمُحَرَّمُ»

"رمضان کے بعد افضل ترین روزے اللہ کے مہینے محرم کے ہیں۔"[3]

3 محرم کے مہینے میں نفلی روزے رکھنا رمضان کے مہینے کے روزوں کے بعد افضل ترین روزے ہیں جیسا کہ اوپر حدیث میں مذکور ہے۔

4 محرم قمری سال کا پہلا مہینہ ہے جیسا کہ "سن ہجری کا آغاز" میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

مسنون اعمال

1 محرم میں کثرت سے نفلی روزے رکھنے چاہئیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

[1] التوبة 36:9. [2] صحيح البخاري، بدء الخلق، باب ماجاء في سبع أرضين، حديث: 3197، وصحيح مسلم، القسامة والمحاربين، باب تغليظ تحريم الدماء......، حديث: 1679. [3] صحيح مسلم، الصيام، باب فضل صوم المحرم، حديث: 1163.

«أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ شَهْرُ اللّٰهِ الْمُحَرَّمُ»

''رمضان کے بعد افضل ترین روزے اللہ کے مہینے محرم کے ہیں۔''[1]

2 خصوصاً یوم عاشورہ کا روزہ رکھا جائے۔ اس سے گزشتہ سال کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«وَصِيَامُ يَوْمِ عَاشُورَاءَ أَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِي قَبْلَهُ»[2]

3 اس مہینے میں ظلم و زیادتی سے اہتمام کے ساتھ بچنا چاہیے، بچنا تو ہر وقت چاہیے لیکن حرمت والے مہینوں میں گناہ کا جرم بڑھ جاتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ﴾

''ان مہینوں میں تم اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو۔''[3]

عاشورۂ محرم کی تعیین میں غلط فہمی کا ازالہ

بالخصوص عاشورۂ محرم کے روزے کی حدیث میں یہ فضیلت آئی ہے کہ یہ ایک سال گذشتہ کا کفارہ ہے۔[4]

اس روز رسول اللہ ﷺ بھی خصوصیت سے روزہ رکھتے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے۔ پھر نبی ﷺ نے یہود کی مخالفت میں فرمایا:

«صُومُوا يَوْمَ عَاشُورَاءَ، وَخَالِفُوا فِيهِ الْيَهُودَ، صُومُوا قَبْلَهُ يَوْمًا، أَوْ بَعْدَهُ يَوْمًا»

[1] صحيح مسلم، الصيام، باب فضل صوم المحرم، حديث: 1163. [2] صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صيام ثلاثة......، حديث: 1162. [3] التوبة 9:36. [4] صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صيام ثلاثة......، حديث: 1162.

''عاشورہ (دس محرم) کا روزہ رکھو لیکن یہودیوں کی مخالفت بھی بایں طور کرو کہ اس کے بعد یا اس سے قبل ایک روزہ اور ساتھ ملا لیا کرو۔''[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے عاشورے کا روزہ رکھا اور مسلمانوں کو بھی اس دن کا روزہ رکھنے کا حکم فرمایا تو صحابہ نے آپ کو بتلایا کہ یہ دن تو ایسا ہے جس کی تعظیم یہود و نصاریٰ بھی کرتے ہیں، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَئِنْ بَقِيتُ إِلٰى قَابِلٍ لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَ»

''اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نویں محرم کا روزہ (بھی) رکھوں گا۔''[2]

لیکن اگلا محرم آنے سے قبل ہی آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ﷺ۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ ''میں نویں محرم کا روزہ رکھوں گا۔'' کا مطلب ہے کہ صرف محرم کی 9 تاریخ کا روزہ رکھوں گا، یعنی دس محرم کا روزہ نہیں بلکہ اس کی جگہ 9 محرم کا روزہ رکھوں گا، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اب صرف 9 محرم کا ایک روزہ رکھنا مسنون عمل ہے۔ 10 محرم کا روزہ رکھنا بھی صحیح نہیں اور 10 محرم کے ساتھ 9 محرم کا روزہ ملا کر رکھنا بھی سنت نہیں۔ بلکہ اب سنت صرف 9 محرم کا ایک روزہ ہے۔ لیکن یہ رائے صحیح نہیں۔ نبی ﷺ کے فرمان کا مطلب ہے کہ میں 10 محرم کے ساتھ 9 محرم کا روزہ بھی رکھوں گا، اسی لیے ہم نے ترجمے میں ...... بھی ...... کا اضافہ کیا ہے کیونکہ 10 محرم کا روزہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نجات پانے کی خوشی میں رکھا جا رہا تھا، اس اعتبار سے 10 محرم کے روزے کی مسنونیت تو مسلّم ہے لیکن یہودیوں کی مخالفت کے لیے آپ نے اس

[1] مسند أحمد: 241/1. یہ حدیث مرفوعاً ضعیف ہے۔ درحقیقت یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر ہے جو کہ صحیح سند سے مروی ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو: تحقیق مشيخة أبي طاهر بن أبي الصقر للشيخ الشريف حاتم بن عارف العوني، ص: 66-68. [2] صحيح مسلم، الصيام، باب أي يوم يصام في عاشوراء؟ حديث: 1134.

کے ساتھ 9 محرم کا روزہ رکھنے کی خواہش کا اظہار فرمایا جس پر عمل کرنے کا موقع آپ کو نہیں ملا۔ بعض آثار سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے، جیسے مُصنّف عبدالرزاق میں صحیح سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

«خَالِفُوا الْيَهُودَ وَ صُومُوا التَّاسِعَ وَالْعَاشِرَ»

''یہودیوں کی مخالفت کرو اور نو اور دس محرم کا روزہ رکھو۔''[1]

بلکہ بقول امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مذکورہ مرفوع حدیث کے بعض طرق میں لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَ (میں نو محرم کا روزہ رکھوں گا) کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں مَعَ الْعَاشِرِ (10 محرم کے روزے کے ساتھ۔) ملاحظہ ہو (مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ: 312/25)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے مَعَ الْعَاشِرِ کے ایک طریق کی طرف جو اشارہ فرمایا ہے، وہ اگر ثابت ہو جاتا ہے تو یہ ٹکڑا فیصلہ کن ہے۔ لیکن ہماری معلومات کی حد تک یہ ٹکڑا کتب حدیث میں نہیں ملتا، امام صاحب نے غالباً اپنے حافظے کی بنیاد پر اس کا حوالہ دے دیا ہے۔ بہرحال اس سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ امام صاحب کا موقف بھی وہی ہے جس کی صراحت ہم کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں 9 اور دس محرم دونوں دنوں کا روزہ رکھنا ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا صحیح مفہوم و مطلب ہے، اس لیے کہ آپ نے دس محرم کے روزے کی فضیلت بھی بیان فرمائی ہے کہ یہ گزشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہے، نیز اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نجات کی خوشی میں رکھنے کو یہودیوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو اس کا زیادہ حق دار بھی قرار دیا ہے۔ یہ دونوں باتیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ دس محرم کے روزے کا استحباب تو شبہے سے بالاتر ہے، پھر اس کو

[1] المصنف لعبد الرزاق: 287/4، حدیث: 7839.

ختم کر کے صرف 9 محرم کے روزے ہی کو فرمانِ رسول کا مصداق قرار دینا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے؟ یہ تو دس محرم کے روزے کو، جس کی فضیلت احادیث سے ثابت ہے، منسوخ کرنا ہے۔ کیا بغیر دلیل کے اس کو منسوخ قرار دینا صحیح ہے؟

علاوہ ازیں لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَ حدیث کے راوی بھی حضرت ابن عباس ہیں اور مصنف عبدالرزاق میں انھی کا قول بیان ہوا ہے۔ گویا راوی کی حدیث کی وضاحت خود راوی ہی کے فتوے سے ہوگئی ہے، اس کے بعد لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَ کے مفہوم میں اشکال باقی نہیں رہتا اور نہ رہنا ہی چاہیے۔ اسی لیے صاحب مرعاۃ مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم، حافظ ابن حجر، امام شوکانی، امام ابن حزم اور دیگر متعدد علماء رحمۃ اللہ علیہم نے اسی مفہوم کو زیادہ صحیح اور راجح قرار دیا ہے۔[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب موقف کی وضاحت

بعض لوگوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ دس محرم کے بجائے 9 محرم کا روزہ رکھتے تھے اور اسی کی ترغیب دیتے تھے اور اسی کو وہ عاشوراء سے تعبیر کرتے تھے۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی 9 محرم کا روزہ رکھتے تھے؟ تو انھوں نے فرمایا ''ہاں۔''[2] لیکن ان کی طرف یہ موقف منسوب کرنا درست نہیں بلکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا مطلب یہ ہے کہ جو عاشوراء کا روزہ رکھنا چاہے اسے چاہیے کہ 9 محرم سے شروع کرے، صرف 10 محرم کے روزے پر اکتفا نہ کرے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول تمام روایات کو جمع

[1] ملاحظہ ہو: مرعاة المفاتيح: 270/3، طبع قديم، والسيل الجرار للشوكاني، والمحلى لابن حزم، وعون المعبود. [2] صحيح مسلم، الصيام، باب أي يوم يصام في عاشوراء، حديث: 1133.

کرنے سے یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں صحیح مسلم کی مذکورہ حدیث میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا: کیا رسول اللہ ﷺ بھی 9 محرم کا روزہ رکھتے تھے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہاں۔ جبکہ واقعہ ایسا نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے 9 محرم کا روزہ نہیں رکھا، صرف آئندہ سال رکھنے کے ارادے کا اظہار فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ''ہاں'' کہنے سے بھی اسی امر کا اثبات ہوتا ہے کہ عاشورۂ محرم کا روزہ 9 محرم سے رکھا جائے، یعنی 10 اور نو محرم دونوں کا روزہ، چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی صحیح مسلم کی مذکورہ روایت، جس میں 9 محرم کو رسول اللہ ﷺ کے روزہ رکھنے کے استفسار پر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اثبات میں جواب دیا، نقل کر کے لکھتے ہیں:

«وَكَأَنَّهُ رضي الله عنه أَرَادَ صَوْمَهُ مَعَ الْعَاشِرِ وَأَرَادَ بِقَوْلِهِ فِي الْجَوَابِ نَعَمْ مَا رُوِيَ مِنْ عَزْمِهِ ﷺ عَلٰى صَوْمِهِ»

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے 9 محرم کے روزے سے مراد یہ لی ہے کہ اسے دس محرم کے روزے کے ساتھ رکھا جائے اور انھوں نے سوال کے جواب میں جو ''ہاں'' کہا، اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے 9 محرم کا روزہ رکھنے کے عزم کا اظہار فرمایا۔''

اس کے بعد امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ہماری اس بات کی وضاحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اپنا یہ قول کر دیتا ہے:

«صُومُوا التَّاسِعَ وَالْعَاشِرَ وَ خَالِفُوا الْيَهُودَ»

''9 اور 10 محرم کا روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔''[1]

[1] السنن الكبرٰى للبيهقي مع الجوهر النقي: 287/4، طبع قديم.

علاوہ ازیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث میں بھی اس امر کی صراحت موجود ہے کہ عاشوراء سے مراد دس محرم ہے:

«أَمَرَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِصَوْمِ عَاشُورَاءَ يَوْمَ الْعَاشِرِ»

''رسول اللہ ﷺ نے عاشورے کا روزہ رکھنے کا حکم دیا، یعنی دس محرم کا۔''[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اس مرفوع حدیث سے یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ عاشوراء، نو محرم کا نہیں، 10 محرم کا دن ہے۔ اور اس حدیث کے راوی بھی حضرت ابن عباس ہی ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ نو محرم کو عاشوراء قرار دیں؟ اسی لیے امام ترمذی اس حدیث کے درج کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

«وَقَدِ اخْتَلَفَ أَهْلُ الْعِلْمِ فِي يَوْمِ عَاشُورَاءَ فَقَالَ بَعْضُهُمْ: يَوْمُ التَّاسِعِ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: يَوْمُ الْعَاشِرِ وَرُوِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ قَالَ: صُومُوا التَّاسِعَ وَالْعَاشِرَ وَخَالِفُوا الْيَهُودَ»

''اہل علم نے اس امر میں اختلاف کیا ہے کہ عاشوراء کون سا دن ہے؟ بعض نے کہا ہے کہ یہ نو محرم ہے اور بعض نے کہا: دس محرم ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انھوں نے کہا: نو اور دس محرم کا روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔''

اس لیے صرف 9 محرم کے روزے کو مسنون عمل کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا، صحیح بات (ان شاء اللہ) یہی ہے کہ نو اور دس محرم کا روزہ رکھا جائے، لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَ کا یہی مطلب بنے گا نہ کہ صرف 9 محرم کا روزہ رکھنا۔ واللّٰه أعلم.

[1] جامع الترمذي، الصيام، باب ماجاء في عاشوراء أي يوم هو، حديث:755.

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی خاصی تفصیل سے اس نکتے پر بحث کی ہے اور لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَ کے اسی مفہوم کو راجح قرار دیا ہے کہ 9 اور 10 محرم کا روزہ رکھا جائے نہ کہ صرف 10 محرم کا۔ نو کا روزہ نہ رکھا جا سکے تو 10 کے ساتھ 11 محرم کا روزہ ملا لیا جائے کیونکہ فتح مکہ کے بعد آپ اہل کتاب کی مخالفت کو پسند فرماتے تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ (فتح الباري: 311/4، طبع دارالسلام)

محرم کی حرمت کے متعلق غلط خیال کی تردید

یہ بھی خیال رہے کہ اس مہینے کی حرمت سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے واقعۂ شہادت سے قبل ہی ثابت چلی آرہی ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مہینہ، اس لیے قابل احترام ہے کہ اس میں حضرت حسین کی شہادت کا سانحۂ دلگداز پیش آیا تھا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ یہ سانحۂ شہادت تو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پچاس سال بعد پیش آیا اور دین کی تکمیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں کر دی گئی تھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [1]

اس لیے یہ تصور اس آیت قرآنی کے سراسر خلاف ہے، پھر خود اسی مہینے میں اس سے بڑھ کر ایک اور سانحۂ شہادت اور واقعۂ عظیم پیش آیا تھا، یعنی یکم محرم کو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ۔ اگر بعد میں ہونے والی ان شہادتوں کے منانے کی شرعاً کوئی حیثیت ہوتی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت اس لائق تھی کہ اہل اسلام اس کا اعتبار کرتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ایسی تھی کہ اس کی یادگار منائی جاتی۔

[1] المآئدة 3:5.

پھر ان شہادتوں کی بنا پر اگر اسلام میں ماتم وشیون کی اجازت ہوتی تو یقیناً تاریخ اسلام کی یہ دونوں شہادتیں ایسی تھیں کہ اہل اسلام ان پر جتنی بھی سینہ کوبی اور ماتم وگریہ زاری کرتے، کم ہوتا۔ لیکن ایک تو اسلام میں اس ماتم وگریہ زاری کی اجازت نہیں، دوسرے یہ تمام واقعات تکمیل دین کے بعد پیش آئے ہیں، اس لیے ان کی یاد میں مجالس عزا اور محافل ماتم قائم کرنا دین میں اضافہ ہے جس کے ہم قطعاً مجاز نہیں۔

رسومات و بدعات

سالِ نو کے آغاز پر مبارک بادی کے پیغام یا جشنِ مسرت کا انعقاد

اس وقت تقریباً ساری دنیا میں عیسائی کیلنڈر رائج ہے جس میں سالِ نو کا آغاز جنوری سے ہوتا ہے، ایک دو اسلامی ملکوں کو چھوڑ کر باقی اسلامی ملکوں میں بھی یہی عیسائی تقویم نافذ ہے جو مسلمان حکمرانوں کی بے حسی اور اسلامی شعائر کی قدر و اہمیت سے بے اعتنائی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ علاوہ ازیں عیسائی سالِ نو کے آغاز پر اسلامی ملکوں میں بھی ایک طبقہ اسی طرح طرب و مسرت کا اظہار کرتا یا تبریک وتہنیت کا پیغام دیتا یا ''ہیپی نیو ائیر'' کا طربیہ الاپتا ہے، جیسے اس موقع پر مغربی ملکوں میں ہوتا ہے، حالانکہ ایسا کرنا تشبُّہ بالکُفّار (کافروں کی مشابہت اختیار کرنا) ہے جس پر حدیث میں نہایت سخت وعید آئی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»

''جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی، وہ انھی میں سے ہوگا۔''[1]

[1] سنن أبي داود، اللباس، باب في لبس الشهرة، حديث:4031.

بنا بریں عیسائی سالِ نو کے آغاز پر اس طرح کے مظاہرے مغرب زدہ طبقے کے ذہنی ارتداد و بغاوت کے غماز ہیں جن کی اسلامی ملکوں میں قطعاً اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ ہم مسلمانوں کے سالِ نو کا آغاز یکم محرم سے ہوتا ہے جو چار حرمت والے مہینوں میں سے ایک حرمت والا مہینہ ہے۔ اور حرمت والے مہینے کا مطلب ہے کہ اس مہینے میں جدال و قتال، قتل و غارت گری اور اس طرح کی دیگر بری حرکتوں کے ارتکاب کی اجازت نہیں ہے۔ ان کاموں کی اجازت تو اگرچہ کسی وقت بھی نہیں ہے لیکن حرمت والے مہینوں میں ان باتوں کی شناعت و قباحت دو چند ہو جاتی ہے۔

اس لیے اصل ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ہم مسلمان اپنے سالِ نَو کے آغاز پر یہ عہد کریں کہ ہم اللہ کی حرمتوں کو پامال نہیں کریں گے، اللہ کی حدود کو نہیں توڑیں گے، حلال و حرام کی پابندی کریں گے اور غم و حزن کی کیفیت ہو یا طرب و مسرت کا لمحہ، ہم کسی حالت میں بھی شریعت کی حدود سے تجاوز نہیں کریں گے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر تبرا بازی اور اس کا رد

عشرۂ محرم میں عام دستور و رواج ہے کہ واقعات کربلا کو مخصوص رنگ اور افسانوی و دیومالائی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ دشمنانِ صحابہ تو اس ضمن میں جو کچھ کرتے ہیں وہ عالم آشکارا ہے لیکن بدقسمتی سے بہت سے اہل سنت کے واعظان خوش گفتار اور خطیبان سحر بیان بھی گرمیٔ محفل اور عوام سے داد و تحسین وصول کرنے کے لیے اسی تال سر میں ان واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں جو مخصوص گروہ کی ایجاد اور ان کی انفرادیت کی غماز ہے۔

اس سانحۂ شہادت کا ایک پہلو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر تبرا بازی ہے جس کے بغیر ''محفل

ماتم حسین''، مکمل نہیں ہوتی۔ اہل سنت اس پستی و کمینگی تک تو نہیں اترتے، تاہم بعض لوگ بوجوہ بعض صحابہ پر کچھ نکتہ چینی کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے، مثلاً: ایک ''مفکر'' نے تو یہاں تک فرما دیا کہ قلیل الصحبت ہونے کی وجہ سے ان کی قلب ماہیت نعوذ باللہ نہیں ہوئی تھی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تمام اعلیٰ و ادنیٰ صحابہ کا فرق مراتب کے باوصف بحیثیت صحابی ہونے کے یکساں عزت و احترام اسلام کا مطلوب ہے۔ کسی صحابی کے بارے میں زبان طعن و تشنیع کھولنا اور ریسرچ کے عنوان پر نکتہ چینی کرنا ہلاکت و تباہی کے خطرے کو دعوت دینا ہے۔

صحابی کی تعریف ہر اس شخص پر صادق آتی ہے جس نے ایمان کی حالت میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہو اور اسی پر اس کی وفات ہوئی ہو۔ قرآن و حدیث میں صحابۂ کرام کے جو عمومی فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں، ان کا اطلاق بھی ہر صحابی پر ہوگا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''الإصابة'' میں صحابی کی جس تعریف کو سب سے زیادہ صحیح اور جامع قرار دیا ہے، وہ یہ ہے:

«وَأَصَحُّ مَا وَقَفْتُ عَلَيْهِ مِنْ ذٰلِكَ: أَنَّ الصَّحَابِيَّ مَنْ لَّقِيَ النَّبِيَّ ﷺ مُؤْمِنًا بِهٖ، وَمَاتَ عَلَى الْإِسْلَامِ، فَيَدْخُلُ فِيمَنْ لَّقِيَهُ مَنْ طَالَتْ مُجَالَسَتُهٗ لَهٗ أَوْقَصُرَتْ، وَمَنْ رَّوٰى عَنْهُ أَوْلَمْ يَرْوِ، وَمَنْ غَزَا مَعَهٗ أَوْلَمْ يَغْزُ، وَمَنْ رَّآهُ رُؤْيَةً وَّلَمْ يُجَالِسْهُ، وَمَنْ لَّمْ يَرَهُ لِعَارِضٍ كَالْعَمٰى»

''سب سے زیادہ صحیح تعریف صحابی کی جس پر میں مطلع ہوا وہ یہ ہے کہ وہ شخص

جس نے ایمان کی حالت میں نبی ﷺ سے ملاقات کی اور اسلام ہی پر اس کی موت ہوئی۔ پس اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جس نے نبی ﷺ سے ملاقات کی (قطع نظر اس سے کہ) اسے آپ کی ہم نشینی کا شرف زیادہ حاصل رہا یا کم، آپ سے روایت کی یا نہ کی۔ آپ کے ساتھ غزوے میں شریک ہوا یا نہیں اور جس نے آپ کو صرف ایک نظر ہی سے دیکھا ہو اور آپ کی مجالست (ہم نشینی) کی سعادت کا موقع اسے نہ ملا ہو اور جو کسی خاص سبب کی بنا پر آپ کی رؤیت کا شرف حاصل نہ کر سکا ہو، جیسے نابینا پن۔''[1]

اس لیے اہل سنت کا خلفائے اربعہ ابو بکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم اور دیگر ان جیسے اکابر صحابہ کی عزت و توقیر کو ملحوظ رکھنا تو درست ہے لیکن بعض ان جلیل القدر اصحاب رسول کی منقبت و تقدیس کا خیال نہ رکھنا یا کم از کم انھیں احترام مطلوب کا مستحق نہ سمجھنا جن کے اسمائے گرامی مشاجرات کے سلسلے میں آتے ہیں، جیسے حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن العاص، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں، یکسر غلط اور دشمنانِ صحابہ کے عقائد کا ایک حصہ ہے۔ اہل سنت کو اس نکتے پر غور کرنا چاہیے کہ خلفائے راشدین کی عزت و توقیر تو کسی حد تک ان کے معقولیت پسند حضرات بھی ملحوظ رکھنے پر مجبور ہیں اور ان کا ذکر وہ نامناسب انداز میں کرنے سے بالعموم گریز ہی کرتے ہیں، البتہ حضرت معاویہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما وغیرہ کو وہ بھی معاف نہیں کرتے۔ اگر صحابۂ کرام کے نام لیوا بھی یہی موقف اختیار کر لیں تو پھر محبان صحابہ اور دشمنان صحابہ میں فرق کیا رہ جاتا ہے؟ اور ان صحابہ کو احترام مطلوب سے فروتر خیال کر کے ان کے شرف و فضل کو مجروح کرنا کیا

[1] الإصابة في تمييز الصحابة: 158/1.

صحابیت کے قصر رفیع میں نقب زنی کا ارتکاب نہیں ہے؟ کیا اس طرح نفس صحابیت کا تقدس مجروح نہیں ہوتا؟ اور صحابیت کی ردائے احترام (معاذ اللہ) تار تار نہیں ہوتی؟

بہر حال ہم عرض یہ کر رہے ہیں کہ قرآن و حدیث میں صحابۂ کرام کے جو عمومی فضائل و مناقب مذکور ہیں، وہ تمام صحابہ کو محیط و شامل ہیں، اس میں قطعاً کسی استثنا کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ان نصوص کی وجہ سے ہم اس امر کے پابند ہیں کہ تمام صحابہ کو نفس صحابیت کے احترام میں یکساں عزت و احترام کا مستحق سمجھیں، اس سلسلے میں قرآنی آیات، احادیث رسول اور اقوالِ ائمہ ہر وقت ہمارے پیش نظر رہنے چاہئیں۔

قرآن کریم کی روشنی میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت

قرآن مجید کے متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

''مہاجرین اور انصار میں سے قبولِ اسلام میں پہلے سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جو اچھے طریقے سے ان کے پیروکار ہیں، اللہ ان سب سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی ہے کامیابی بڑی۔''[1]

اس آیت میں صرف مہاجرین و انصار، صحابہ کے دونوں گروہوں ہی کی عظمت و فضیلت

[1] التوبۃ 9:100۔

کا بیان نہیں ہے بلکہ ان کے بعد آنے والے لوگوں کی بھی فضیلت بتلائی گئی ہے، بشرطیکہ ان کے اندر ایک خوبی ہوگی اور وہ یہ کہ وہ مذکورہ دونوں قسم کے صحابہ کے نقش قدم پر چلنے والے اور اچھے طریقے سے ان کی پیروی کرنے والے ہوں گے۔ صحابہ کی کتنی عظیم فضیلت اور قدر و منزلت ہے کہ ان کے پیروکاروں کو بھی اتنا اونچا مقام عطا کر دیا گیا جس کی وضاحت اس آیت میں ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۖۚ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۠ ﴾

''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت مہربان ہیں، آپ انھیں رکوع و سجود کرتے دیکھیں گے، وہ اللہ کا فضل اور (اس کی) رضا مندی تلاش کرتے ہیں، ان کی خصوصی پہچان ان کے چہروں پر سجدوں کا نشان ہے، ان کی یہ صفت تورات میں ہے اور انجیل میں، ان کی صفت اس کھیتی کے مانند ہے جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا اور وہ (پودا) موٹا ہو گیا، پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا، کسانوں کو خوش کرتا ہے، (اللہ نے یہ اس لیے کیا) تاکہ ان (صحابۂ کرام) کی وجہ سے کفار کو خوب غصہ دلائے، اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کیے، مغفرت اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔'' [1]

[1] الفتح 29:48.

اور دوسری آیت میں ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا﴾

''البتہ تحقیق اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے، چنانچہ ان کے دلوں میں جو (خلوص) تھا، وہ اس نے جان لیا، تو اس نے ان پر طمانینت وتسکین نازل کی اور بدلے میں انھیں قریب کی فتح دی۔''[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیعت رضوان میں شریک تمام صحابہ کو پکا مومن قرار دیا ہے اور ان لوگوں کی تردید کی ہے جو ان کے دلوں میں نفاق کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں۔

اس طرح دیگر متعدد قرآنی آیات ہیں جن میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت و عظمت بیان کی گئی ہے۔

احادیث رسول میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت

احادیث میں بھی صحابہ کے بکثرت فضائل بیان کیے گئے ہیں، یہاں چند احادیث بیان کی جاتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ سَبَّ أَصْحَابِي فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ»

''جس نے میرے صحابہ پر سب وشتم کیا، (انھیں جرح وتنقید اور برائی کا ہدف بنایا) تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔''[2]

[1] الفتح 18:48. [2] المعجم الكبير للطبراني: 142/12، والسلسلة الصحيحة: 446/5، حديث:2340.

دوسری حدیث میں فرمایا:

«لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ»

''میرے صحابہ پر سبّ وشتم نہ کرو (انھیں جرح وتنقید اور برائی کا ہدف نہ بناؤ، انھیں اللہ تعالیٰ نے اتنا بلند رُتبہ عطا فرمایا ہے کہ) تم میں سے کوئی شخص اگر اُحد پہاڑ جتنا سونا بھی اللہ کی راہ میں خرچ کر دے تو وہ کسی صحابی کے خرچ کردہ ایک مُدّ (تقریباً 6 سو 25 گرام) بلکہ آدھے مُدّ (3 سو 12 گرام) کے بھی برابر نہیں ہوسکتا۔''[1]

ایک اور حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا:

«اَلنُّجُومُ أَمَنَةٌ لِّلسَّمَاءِ، فَإِذَا ذَهَبَتِ النُّجُومُ أَتَى السَّمَاءَ مَا تُوعَدُ، وَأَنَا أَمَنَةٌ لِّأَصْحَابِي، فَإِذَا ذَهَبْتُ أَنَا أَتَى أَصْحَابِي مَا يُوعَدُونَ، وَأَصْحَابِي أَمَنَةٌ لِّأُمَّتِي، فَإِذَا ذَهَبَ أَصْحَابِي أَتَى أُمَّتِي مَا يُوعَدُونَ»

''ستارے آسمان کی حفاظت کا ذریعہ ہیں، جب ستارے ختم ہو جائیں گے (قیامت کے دن) تو آسمان پر وہ وقت آجائے گا جس کا اس سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ اور میں اپنے صحابہ کی حفاظت کا ذریعہ ہوں، جب میں (دنیا سے) چلا جاؤں گا تو صحابہ پر وہ وقت آجائے گا جس کا وعدہ ان سے کیا جاتا ہے اور میرے صحابہ میری امت کی حفاظت کا ذریعہ ہیں، جب میرے صحابہ ختم ہو جائیں

[1] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبيﷺ، باب (5)، حديث: 3673، وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب تحريم سب الصحابة رضي الله عنهم، حديث: 2541,2540.

گے تو میری امت پر وہ وقت آجائے گا جس کا وعدہ ان سے کیا جاتا ہے۔‘‘[1]

اس حدیث میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے وجود کو امت کے لیے حفاظت اور خیر و برکت کا باعث قرار دیا گیا ہے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا:

«يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ، يَغْزُو فِئَامٌ مِّنَ النَّاسِ، فَيُقَالُ لَهُمْ: فِيكُمْ مَّنْ رَأَى رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ، فَيُفْتَحُ لَهُمْ، ثُمَّ يَغْزُو فِئَامٌ مِّنَ النَّاسِ، فَيُقَالُ لَهُمْ: هَلْ فِيكُمْ مَّنْ رَأَى مَنْ صَحِبَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ، فَيُفْتَحُ لَهُمْ، ثُمَّ يَغْزُو فِئَامٌ مِّنَ النَّاسِ، فَيُقَالُ لَهُمْ: (هَلْ) فِيكُمْ مَّنْ رَأَى مَنْ صَحِبَ مَنْ صَحِبَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ، فَيُفْتَحُ لَهُمْ»

’’ایک وقت آئے گا، کچھ لوگوں کی ایک جماعت جہاد کرے گی، ان سے پوچھا جائے گا: تم میں کوئی ایسا شخص (صحابی) ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے؟ لوگ کہیں گے: ہاں، پس (اس ایک صحابی کی صلاح وفضیلت سے) ان کو فتح عطا کر دی جائے گی، پھر کچھ لوگوں کی ایک جماعت جہاد کرے گی، ان سے پوچھا جائے گا: کیا تم میں کوئی شخص (تابعی) ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے صحابی کو دیکھا ہے؟ لوگ کہیں گے: ہاں، پس ان کو (اس تابعی کی صلاح وفضیلت سے) فتح عطا کر دی جائے گی، پھر کچھ لوگوں کی ایک جماعت جہاد کرے گی، ان سے پوچھا جائے گا: کیا تم میں کوئی ایسا شخص (تبع تابعی) ہے جس نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جس نے صحابیٔ رسول کو دیکھا ہے؟ لوگ کہیں گے: ہاں،

[1] صحیح مسلم، فضائل الصحابة، باب بیان أن بقاء النبي ﷺ أمان لأصحابه ......، حدیث: 2531.

پس ان کو (اس تبع تابعی کی صلاح وفضیلت سے) فتح عطا کر دی جائے گی۔'' [1]

یعنی صحابۂ کرام کی وجہ سے تین دور خیر وفضیلت کے ہوں گے، اس بات کو صراحت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح ایک اور حدیث میں بیان فرمایا:

«خَيْرُ أُمَّتِي الْقَرْنُ الَّذِينَ يَلُونِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ»

''میری اُمّت کا بہترین طبقہ وہ ہے جو مجھ سے متصل ہے، پھر وہ جو اس کے بعد اس سے متصل ہے، پھر وہ جو اس سے متصل ہے۔'' [2]

اس حدیث میں جن تین قرنوں (زمانوں) کا ذکر ہے ان سے مراد عہدِ صحابہ، عہدِ تابعین اور عہدِ تبع تابعین ہیں۔ اس حدیث کی رُو سے یہ تینوں زمانے مابعد کے زمانوں کے مقابلے میں مجموعی اعتبار سے خیر و برکت کے لحاظ سے سب سے بہتر ہیں۔ اگرچہ ان میں بھی باہم تفاوت ہے، یعنی عہد صحابہ، عہدِ تابعین و تبع تابعین سے بہتر ہے۔ لیکن یہ دونوں دور بھی، جو 220ھ تک ہیں۔ مابعد کے اعتبار سے بہت بہتر ہیں۔ ان کے بعد بدعات اور دیگر اعتقادی فتنے عام اور حالات کافی متغیر ہو گئے۔ [3]

صحابۂ کرام کے فضائل میں قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ اور بھی ہیں۔ ہم اختصار کے پیش نظر مذکورہ آیات و احادیث ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

[1] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبيﷺ، باب فضائل أصحاب النبيﷺ......، حديث: 3649، وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة، ثم الذين يلونهم......، حديث: 2532 واللفظ له. [2] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبيﷺ، باب فضائل أصحاب النبيﷺ......، حديث: 3650، وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة، ثم الذين يلونهم......، حديث:2533، واللفظ له. [3] فتح الباري: 8/7، 9 مطبوعة دارالسلام.

فضائل اہل بیت

اس موقع پر فضائل اہل بیت بالخصوص حضرت حَسَن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے فضائل بیان کرنا بھی ضروری ہیں کیونکہ ماہ محرم میں سانحۂ کربلا بحث و گفتگو اور خطبات و تقاریر کا موضوع رہتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ جو سانحۂ کربلا پر دیومالائی ڈگر سے ہٹ کر تحقیقی انداز سے گفتگو کرتا ہے، وہ نعوذ باللہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے محبت نہیں رکھتا، یہ بات خلافِ واقعہ ہے۔ اسی خلافِ واقعہ تأثر کو دور کرنے کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فضائل پر مبنی چند احادیث بھی پیشِ خدمت ہیں۔

فضیلت حسن و حسین رضی اللہ عنہما

1 نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«هُمَا رَيْحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا»

’’وہ (حسن و حسین) دونوں دنیا میں سے میرے دو پھول ہیں۔‘‘[1]

2 حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا جبکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ ایک مرتبہ لوگوں کی طرف دیکھتے اور ایک مرتبہ حضرت حسن کی طرف اور فرماتے:

«اِبْنِي هٰذَا سَيِّدٌ، وَلَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يُّصْلِحَ بِهٖ بَيْنَ فِئَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ»

[1] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبيﷺ، باب مناقب الحسن و الحسين رضي الله عنهما، حديث: 3753.

''میرا یہ بیٹا سردار ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کروائے گا۔''[1]

نبی ﷺ کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور 40 ہجری میں حسن رضی اللہ عنہ، جو علی رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ بنائے گئے تھے، کے درمیان اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان صلح ہو گئی، اس سے قبل 5 سال سے مسلمان خانہ جنگی کا شکار چلے آ رہے تھے۔ اس صلح میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا کردار سب سے زیادہ اہم اور بنیادی تھا۔

3 نبی ﷺ حضرت اسامہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کو پکڑتے اور فرماتے:

«اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أُحِبُّهُمَا فَأَحِبَّهُمَا»

''اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما۔''[2]

4 حضرت براء رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، میں نے دیکھا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے کندھے پر ہیں اور آپ ﷺ یہ دعا کر رہے ہیں:

«اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أُحِبُّهُ فَأَحِبَّهُ»

''اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت فرما۔''[3]

5 حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

«اُرْقُبُوا مُحَمَّدًا ﷺ فِي أَهْلِ بَيْتِهِ»

''محمد ﷺ کا ان کے اہل بیت کے بارے میں خیال رکھو۔''[4] یعنی انھیں

[1] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب الحسن والحسين رضي الله عنهما، حديث: 3746. [2] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب الحسن والحسين رضي الله عنهما، حديث: 3747. [3] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب الحسن والحسين رضي الله عنهما، حديث: 3749. [4] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب الحسن والحسين رضي الله عنهما، حديث: 3751.

سب وشتم کرو نہ ایذا پہنچاؤ۔

ذیل کی حدیث سے بھی اہلِ بیت کی فضیلت واضح ہوتی ہے۔

6 حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا:

«أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي»

''میں تمھیں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں اللہ کی یاد دلاتا ہوں۔''

حضرت حُصَین نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کون ہیں؟ کیا آپ کی ازواج مطہرات اہل بیت میں سے نہیں ہیں؟ حضرت زید نے جواب دیا:

«نِسَاؤُهُ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ، وَلٰكِنْ أَهْلُ بَيْتِهِ مَنْ حُرِمَ الصَّدَقَةَ بَعْدَهُ قَالَ: وَمَنْ هُمْ؟ قَالَ: هُمْ آلُ عَلِيٍّ، وَآلُ عَقِيلٍ، وَآلُ جَعْفَرٍ، وَآلُ عَبَّاسٍ......»

''آپ کی ازواج مطہرات تو اہل بیت میں سے ہیں۔لیکن آپ کے اہلِ بیت وہ بھی ہیں جن پر آپ کے بعد زکاۃ حرام ہے۔ انھوں نے پوچھا: وہ کون (کون) ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: وہ آل علی، آلِ عقیل، آل جعفر اور آلِ عباس ہیں......''[1]

7 حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ هٰذَا مَلَكٌ لَمْ يَنْزِلِ الْأَرْضَ قَطُّ قَبْلَ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ، اِسْتَأْذَنَ رَبَّهُ أَنْ يُسَلِّمَ عَلَيَّ وَيُبَشِّرَنِي بِأَنَّ فَاطِمَةَ سَيِّدَةُ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَأَنَّ

[1] صحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل علي رضي الله عنه......، حديث:2408.

الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ»

''بے شک یہ فرشتہ اس رات سے پہلے کبھی زمین پر نہیں اترا، اس نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ وہ مجھے سلام کہے اور مجھے خوشخبری دے کہ بے شک فاطمہ (رضی اللہ عنہا) جنتی عورتوں کی سردار ہیں اور حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں۔''[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، اہل بیت اور ان کے فضائل و مناقب کی طرف یہاں اجمالی اشارہ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ سانحۂ کربلا کے بیان کے سلسلے میں افراط وتفریط سے کام نہ لیا جائے۔ نہ افراط کا شکار ہو کر تاریخی حقائق کا انکار کریں اور نہ تفریط میں مبتلا ہو کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ سمیت کسی بھی صحابی کی تنقیصِ شان کا ارتکاب کریں۔ حضرت حسن اور حضرت حسین اور دیگر تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب، تفاوتِ درجات کے باوجود، قابل احترام ہیں، ان کی تنقیص و اہانت ضیاعِ ایمان کا باعث ہے۔ فنعوذ باللّٰہ من ھذا.

اہل بیت کون ہیں؟

ہم یہ بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ واضح کیا جائے کہ اہل بیت کون ہیں یا کون کون ہیں؟ اس لیے کہ اہل بیت کے مصداق میں بھی لوگوں نے افراط وتفریط سے کام لیا ہے۔ ایک گروہ ازواج مطہرات کو اہل بیت نہیں سمجھتا، حالانکہ قرآن کریم کی رُو سے ازواج مطہرات اہل بیت نبوی ہیں۔ ایک دوسرا گروہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو اہلِ بیت میں سے نہیں سمجھتا۔ ہماری رائے میں یہ دونوں ہی موقف غلط ہیں۔ اصل میں یہ

[1] جامع الترمذي، المناقب، باب إن الحسن والحسين سيدا شباب أهل الجنة، حديث:3781.

دونوں ہی اہل بیت ہیں۔ ازواج مطہرات قرآن کریم کی رُو سے اہل بیت ہیں اور حضرت علی و فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم حدیث کی رُو سے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴾

”اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اے اہل بیت! تم سے گندگی دور کر دے اور تم کو خوب پاک کر دے۔“ [1]

یہاں سیاق و سباق کی رُو سے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اہل بیت نبوی ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقام پر بھی بیوی کو اہل بیت کہا گیا ہے۔ دیکھیے (ھود 73:11)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: «نَزَلَتْ فِي نِسَاءِ النَّبِيِّ ﷺ خَاصَّةً» ”یہ آیتِ (تطہیر) نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔“ اور اس اثر کے راوی حضرت عکرمہ کہا کرتے تھے کہ اس سے مراد ازواج مطہرات ہیں، کسی کو اس سے انکار ہے تو میں اس سے مباہلہ کرنے کو تیار ہوں۔ [2]

علاوہ ازیں رسول اکرم ﷺ کا فرمان: «مَنْ يَعْذِرُنَا فِي رَجُلٍ بَلَغَنِي أَذَاهُ فِي أَهْلِ بَيْتِي؟» ”ایسے شخص کی طرف سے کون عذر خواہی کرے گا جو مجھے میرے گھر والوں کے بارے میں اذیت پہنچاتا ہے۔“ [3] بھی اس کی واضح دلیل ہے۔

اس لیے ازواج مطہرات کا اہل بیت ہونا نصِ قرآنی اور حدیث سے واضح ہے۔

علاوہ ازیں داماد اور اولاد اُن روایات کی رُو سے اہل بیت ہیں جو صحیح سند سے ثابت ہیں جن میں نبی ﷺ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو اپنی چادر

[1] الأحزاب 33:33. [2] تفسیر ابن أبي حاتم: 3132/9، اثر: 17675. [3] صحیح البخاري، الشهادات، باب إذا عدّل رجل رجلا ......، حدیث: 2637.

میں لے کر فرمایا: «اَللّٰھُمَّ! ھٰؤُلَاءِ أَھْلِي» ''اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں۔''[1] جس کا مطلب ہے کہ یہ بھی میرے اہل بیت سے ہیں، ان پر کرم فرما! اس طرح تمام دلائل میں بھی تطبیق ہو جاتی ہے۔

عشرۂ محرم کی خصوصی بدعات

عشرۂ محرم (محرم کے ابتدائی دس دن) میں جس طرح مجالس عزا اور محافل ماتم برپا کی جاتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ سب اختراعی چیزیں ہیں اور شریعت اسلامیہ کے مزاج کے قطعاً مخالف۔ اسلام نے تو نوحہ و ماتم کے اس انداز کو ''جاہلیت'' سے تعبیر کیا ہے اور اس کام کو باعث لعنت بلکہ کفر تک پہنچا دینے والا بتلایا ہے۔

بدقسمتی سے اہل سنت میں سے ایک بدعت نواز حلقہ اگرچہ نوحہ و ماتم کا رافضی انداز تو اختیار نہیں کرتا لیکن ان دس دنوں میں بہت سی ایسی باتیں اختیار کرتا ہے جن سے روافض کی ہمنوائی اور ان کے مذہب باطل کا فروغ ہوتا ہے، مثلاً:

- سانحۂ کربلا کو مبالغے اور رنگ آمیزی سے بیان کرنا۔
- سانحۂ کربلا کے ضمن میں جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ہدف طعن و ملامت بنانے میں بھی تأمل نہ کرنا۔
- دس محرم کو تعزیے نکالنا، انھیں قابل تعظیم و پرستش سمجھنا، ان سے منتیں مانگنا، حلیم پکانا، پانی یا دودھ وغیرہ کی سبیلیں لگانا۔
- اپنے بچوں کو ہرے رنگ کے کپڑے پہنا کر انھیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا فقیر بنانا۔

[1] صحیح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل علي بن أبي طالب رضی اللہ عنہ، حدیث: 2404.

❁ دس محرم کو تعزیوں اور ماتم کے جلوسوں میں ذوق وشوق سے شرکت کرنا اور کھیل کود (گتکے اور پٹہ بازی) سے ان محفلوں کی رونق میں اضافہ کرنا، وغیرہ۔

❁ ماہِ محرم کو سوگ کا مہینہ سمجھ کر اس میں شادیاں نہ کرنا اور سیاہ لباس پہننا۔

❁ ذوالجناح (گھوڑے) کے جلوس میں ثواب کا کام سمجھ کر شرکت کرنا۔

❁ ذوالجناح (گھوڑے) کو متبرک سمجھنا، اس کو چومنا اور بچوں اور عورتوں کو اس کے نیچے سے گزارنے کو سعادت سمجھنا، وغیرہ۔

اور اسی انداز کی کئی چیزیں، حالانکہ یہ سب چیزیں بدعت ہیں جن سے نبیٔ اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق اجتناب ضروری ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو تاکید کی ہے:

«فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ تَمَسَّكُوا بِهَا، وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»

''(مسلمانو!) تم میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے ہی کو اختیار کرنا اور اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا اور دین میں اضافہ شدہ چیزوں سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا، اس لیے کہ دین میں ہر نیا کام (چاہے وہ بظاہر کیسا ہی ہو) بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''[1]

یہ بات ہر کسی پر واضح ہے کہ یہ سب چیزیں صدیوں بعد کی پیداوار ہیں، بنابریں ان کے بدعات ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور نبی ﷺ نے ہر بدعت کو گمراہی سے تعبیر فرمایا ہے جس سے مذکورہ خود ساختہ رسومات کی شناعت و قباحت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

[1] سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، حديث:4607.

توسیع طعام کی بابت ایک من گھڑت روایت

محرم کی دسویں تاریخ کے بارے میں جو روایت بیان کی جاتی ہے کہ اس دن جو شخص اپنے اہل وعیال پر فراخی کرے گا، اللہ تعالیٰ سارا سال اس پر فراخی کرے گا، بالکل بے اصل ہے جس کی صراحت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور دیگر ائمۂ محققین نے کی ہے، چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''10 محرم کو خاص کھانا پکانا، خصوصی طور پر زیادہ خرچ کرنا وغیرہ من جملہ ان بدعات ومنکرات سے ہے جو نہ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہیں نہ خلفائے راشدین سے اور نہ ائمۂ مسلمین میں سے کسی نے ان کو مستحب سمجھا ہے۔''[1]

اور امام احمد رحمہ اللہ کا یہ قول مذکورہ روایت کے متعلق امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ [لَا أَصْلَ لَهٗ، فَلَمْ يَرَهٗ شَيْئًا] ''اس کی کوئی اصل نہیں، امام احمد رحمہ اللہ نے اس روایت کو قابل حیثیت شے نہیں سمجھا۔''[2]

اسی طرح امام ابن تیمیہ کی کتاب اِقْتِضَاءُ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيم (ص:301، طبع مصر 1950ء) میں اس کی صراحت موجود ہے۔

اور امام محمد بن وضاح نے اپنی کتاب ''اَلْبِدَعُ وَالنَّهْيُ عَنْهَا'' میں امام یحییٰ بن یحییٰ (متوفی 234ھ) سے نقل کیا ہے، انھوں نے کہا:

''میں امام مالک رحمہ اللہ کے زمانے میں مدینہ منورہ اور امام لیث، ابن القاسم اور ابن وہب کے ایام میں مصر میں موجود تھا اور یہ دن (عاشوراء) آیا، میں نے

[1] فتاویٰ ابن تیمیة:312/25. [2] منهاج السنة:248/2 اور فتاویٰ مذکور.

کسی سے اس میں خصوصی طور پر زیادہ خرچ کرنے کا ذکر تک نہیں سنا۔ اگر ان کے ہاں کوئی ایسی روایت ہوتی تو باقی احادیث کی طرح اس کا بھی وہ ذکر کرتے۔“ [1]

اس روایت کی پوری سندی تحقیق حضرت الاستاذ المحترم مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک مفصل مضمون میں کی ہے جو الاعتصام (13 مارچ 1970ء) میں شائع ہوا تھا۔ مَنْ شَآءَ فَلْيُرَاجِعْهُ.

شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [2]

یہ تمام مذکورہ امور وہ ہیں جو اہل سنت کے عوام کرتے ہیں، روافض ان ایام میں جو کچھ کرتے ہیں، ان سے اس وقت بحث نہیں، اس وقت ہمارا روئے سخن اہل سنت کی طرف ہے کہ وہ بھی دین اسلام سے ناواقفیت، عام جہالت اور ایک برخود غلط فرقے کی دسیسہ کاریوں سے بے خبری کی بنا پر مذکورہ بالا رسومات بڑی پابندی اور اہتمام سے بجا لاتے ہیں، حالانکہ یہ تمام چیزیں اسلام کے ابتدائی دور کے بہت بعد کی ایجاد ہیں جو کسی طرح بھی دین کا حصہ نہیں اور نبی ﷺ کے فرمان: «مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَرَدٌّ» ”دین میں نو ایجاد کام مردود ہے۔“ [3] کی مصداق ہیں ان سے اجتناب ضروری ہے۔

بدعات و رسومات کی ہلاکت خیزیاں

دین میں اپنی طرف سے اضافے ہی کو بدعت کہا جاتا ہے، پھر یہ چیزیں صرف

[1] البدع والنهي عنها، ص: 45 مطبوعہ دمشق 1349ھ. [2] السلسلة الضعيفة: 738/14، حديث: 6824. [3] صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح......، حديث: 2697، وصحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة......، حديث: 1718، واللفظ له.

بدعت ہی نہیں ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان میں سے بعض شرک و بت پرستی کے ضمن میں آجاتی ہیں، جیسے تعزیہ سازی ہے کیونکہ

أولاً: تعزیے میں روح حسین رضی اللہ عنہ کو موجود اور انھیں عالم الغیب سمجھا جاتا ہے، تب ہی تو یہ لوگ تعزیوں کو قابل تعظیم سمجھتے اور ان سے مدد مانگتے ہیں، حالانکہ کسی بزرگ کی روح کو حاضر و ناظر جاننا اور عالم الغیب سمجھنا شرک و کفر ہے، چنانچہ حنفی مذہب کی معتبر کتاب فتاویٰ بزازیہ میں لکھا ہے: «مَنْ قَالَ: أَرْوَاحُ الْمَشَايِخِ حَاضِرَةٌ، تَعْلَمُ، يُكَفَّرُ» ''جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ بزرگوں کی روحیں ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں اور وہ علم رکھتی ہیں، وہ کافر ہے۔''

ثانیاً: تعزیہ پرست تعزیوں کے سامنے سرنیہوڑتے ہیں جو سجدے ہی کے ذیل میں آتا ہے اور کئی لوگ تو کھلم کھلا سجدے بجا لاتے ہیں اور غیر اللہ کو سجدہ کرنا، چاہے وہ تعبدی ہو یا تعظیمی، شرک صریح ہے، چنانچہ کتب فقہ حنفیہ میں بھی سجدہ لغیر اللہ کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شمس الائمہ سرخسی کہتے ہیں:

«إِنْ كَانَ لِغَيْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلٰى وَجْهِ التَّعْظِيمِ كُفْرٌ»

''غیر اللہ کو تعظیمی طور پر (بھی) سجدہ کرنا کفر ہے۔''

اور علامہ قہستانی حنفی فرماتے ہیں: «يُكَفَّرُ بِالسَّجْدَةِ مُطْلَقًا» یعنی ''غیر اللہ کو سجدہ کرنے والا کافر ہے چاہے عبادتاً ہو یا تعظیماً۔''[1]

ثالثاً: تعزیہ پرست نوحہ خوانی و سینہ کوبی کرتے ہیں اور ماتم و نوحہ میں کلمات شرکیہ ادا کرتے ہیں، یہ سارے افعال غیر اسلامی ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، چنانچہ صحیح حدیث میں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] ردالمحتار: 383/6.

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُودَ وَشَقَّ الْجُيُوبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ»

''وہ شخص ہم میں سے نہیں جس نے رخسار پیٹے، گریبان چاک کیے اور زمانۂ جاہلیت کے سے بین کیے۔''[1]

یہ صورتیں جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہیں، نوحہ و ماتم کے ضمن میں آتی ہیں، جو ناجائز ہیں، اس لیے فطری اظہار غم کے علاوہ اظہار غم کی جو بھی مصنوعی اور غیر فطری صورتیں ہوں گی، وہ سب ناجائز نوحے میں شامل ہوں گی، پھر ان نوحوں میں مبالغہ کرنا اور زمین و آسمان کے قلابے ملانا اور عبد و معبود کے درمیان فرق کو مٹا دینا تو وہی جاہلانہ شرک ہے جس کے مٹانے کے لیے ہی تو اسلام آیا تھا۔

رابعًا: تعزیہ پرست تعزیوں سے اپنی مرادیں اور حاجات طلب کرتے ہیں جو صریحاً شرک ہے۔ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ میدان کربلا میں مظلومانہ شہید ہو گئے اور اپنے اہل و عیال کو ظالموں کے پنجے سے نہ بچا سکے تو اب بعد از وفات وہ کسی کے کیا کام آسکتے ہیں؟

خامسًا: تعزیہ پرست حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مصنوعی قبر، جس کو شبیہ کہا جاتا ہے، بناتے ہیں اور اس کی زیارت کو ثواب سمجھتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ بھی بت پرستی ہی کی شکل ہے جو کہ حرام ہے جیسا کہ کسی بزرگ کا مقولہ بھی ہے: «مَنْ زَارَ قَبْرًا بِلَا مَقْبُورٍ كَأَنَّمَا عَبَدَ الصَّنَمَ» یعنی ''جس نے ایسی خالی قبر کی زیارت کی جس میں کوئی میت نہیں تو گویا اس نے بت کی پوجا کی۔''[2]

[1] صحیح البخاري، الجنائز، باب لیس منا من ضرب الخدود، حدیث: 1297. [2] رسالة تنبیه الضالین، از مولانا اولاد حسن، والد نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ.

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی صراحت

علاوہ ازیں اہل سنت عوام کی اکثریت مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی عقیدت کیش ہے لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود ان کے اکثر لوگ محرم کی ان خود ساختہ رسومات میں خوب ذوق وشوق سے حصہ لیتے ہیں، حالانکہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے بھی ان رسومات محرم سے منع کیا ہے اور انھیں بدعت، ناجائز اور حرام لکھا ہے اور ان کو دیکھنے سے بھی روکا ہے، چنانچہ ان کا فتویٰ ہے:

''تعزیہ آتا دیکھ کر اعراض وروگردانی کریں۔ اس کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہیے۔'' [1]

ان کا ایک مستقل رسالہ ''تعزیہ داری'' ہے، اس کے صفحہ 4 پر لکھتے ہیں:

- ''غرض عشرۂ محرم الحرام کہ اگلی شریعتوں سے اس شریعت پاک تک نہایت بابرکت محل عبادت ٹھہرا تھا، ان بے ہودہ رسوم نے جاہلانہ اور فاسقانہ میلوں کا زمانہ کر دیا۔''
- ''یہ کچھ اور اس کے ساتھ خیال وہ کچھ کہ گویا خود ساختہ تصویریں بعینہ حضرات شہداء رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جنازے ہیں۔''
- ''کچھ اتارا باقی توڑا اور دفن کر دیے۔ یہ ہر سال اضاعت مال کے جرم میں دو وبال جداگانہ ہیں۔ اب تعزیہ داری اس طریقۂ نامرضیہ کا نام ہے۔ قطعاً بدعت و ناجائز اور حرام ہے۔''

صفحہ 11 پر لکھتے ہیں:

- ''تعزیہ پر چڑھایا ہوا کھانا نہ کھانا چاہیے۔ اگر نیاز دے کر چڑھائیں یا چڑھا کر نیاز دیں تو بھی اس کے کھانے سے احتراز کریں۔''

[1] عرفان شریعت، حصہ اوّل، ص: 15.

سوال تعزیہ بنانا اور اس پر نذر و نیاز کرنا، عرائض بہ امید حاجت برآری لٹکانا اور بہ نیت بدعت حسنہ اس کو داخل حسنات جاننا کیسا گناہ ہے؟

جواب افعال مذکورہ جس طرح عوام زمانہ میں رائج ہیں، بدعت سَيِّئَة وممنوع و ناجائز ہیں۔

اسی طرح محرم کی دوسری بدعت مرثیہ خوانی کے متعلق ''عرفان شریعت'' کے حصہ اول، صفحہ 16 پر ایک سوال و جواب یہ ہے۔

سوال محرم شریف میں مرثیہ خوانی میں شرکت جائز ہے یا نہیں؟

جواب ناجائز ہے، وہ مناہی ومنکرات سے پر ہوتے ہیں۔

محرم کو سوگ کا مہینہ سمجھا جاتا ہے، اس لیے بالعموم ان ایام میں سیاہ یا سبز لباس پہنا جاتا ہے۔ اور شادی بیاہ سے اجتناب کیا جاتا ہے، اس کے متعلق مولانا احمد رضا خاں لکھتے ہیں ''محرم میں سیاہ، سبز کپڑے علامت سوگ ہے اور سوگ حرام۔''[1]

مسئلہ: کیا فرماتے ہیں مسائل ذیل میں؟

1. بعض اہل سنت جماعت عشرۂ محرم میں نہ تو دن بھر روٹی پکاتے اور نہ جھاڑو دیتے ہیں، کہتے ہیں بعد دفن تعزیہ روٹی پکائی جائے گی۔
2. ان دس دن میں کپڑے نہیں اتارتے۔
3. ماہ محرم میں کوئی بیاہ شادی نہیں کرتے۔

الجواب: ''تینوں باتیں سوگ ہیں اور سوگ حرام ہے۔''[2]

قرآن و حدیث کی ان تصریحات اور مولانا احمد رضا خان بریلوی کی توضیح کے بعد امید ہے کہ بریلوی علماء اپنے عوام کی صحیح رہنمائی فرمائیں گے اور عوام اپنی جہالت اور

[1] احکام شریعت، حصہ اوّل، ص: 71. [2] احکام شریعت، حصہ اوّل، ص:71.

علماء کی خاموشی کی بنا پر جو مذکورہ بدعات وخرافات کا ارتکاب کرتے ہیں یا کم از کم ایسا کرنے والوں کے جلوسوں میں شرکت کر کے ان کے فروغ کا سبب بنتے ہیں، ان کو ان سے روکنے کی پوری کوشش کریں گے۔

رسومات محرم کی تاریخ ایجاد وآغاز اور نتائج

لعنت کا آغاز

''351ھ میں معزالدولہ (احمد بن بُوَیْہ دیلمی) نے جامع مسجد بغداد کے دروازے پر نعوذ باللہ ''نقل کفر کفر نہ باشد'' یہ عبارت لکھوا دی:

«لَعَنَ اللّٰهُ مُعَاوِيَةَ بْنَ أَبِي سُفْيَانَ وَمَنْ غَصَبَ فَاطِمَةَ فَدَكًا وَّمَنْ مَنَعَ مِنْ دَفْنِ الْحَسَنِ عِنْدَ جَدِّهٖ وَمَنْ نَفٰى أَبَاذَرٍّ وَّمَنْ أَخْرَجَ الْعَبَّاسَ عَنِ الشُّورٰى»

''معاویہ بن ابی سفیان، غاصبین فدک، ''امام'' حسن رضی اللہ عنہ کو روضۂ نبوی میں دفن کرنے سے روکنے والوں، حضرت ابو ذر کو جلا وطن کرنے والوں، عباس کو شوریٰ سے خارج کرنے والوں پر لعنت ہو۔''

ماتم اور تعزیہ داری کی ایجاد

352ھ کے شروع ہونے پر ابن بویہ مذکور نے حکم دیا کہ 10 محرم کو حضرت ''امام'' حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے غم میں تمام دکانیں بند کر دی جائیں، بیع وشراء بالکل موقوف رہے، شہر ودیہات کے لوگ ماتمی لباس پہنیں اور علانیہ نوحہ کریں۔ عورتیں اپنے بال کھولے ہوئے، چہروں کو سیاہ کیے ہوئے، کپڑوں کو پھاڑتے ہوئے سڑکوں اور

بازاروں میں مرثیے پڑھتی، منہ نوچتی اور چھاتیاں پیٹتی ہوئی نکلیں۔ رافضیوں نے اس حکم کی بخوشی تعمیل کی مگر اہلسنّت دم بخود اور خاموش رہے کیونکہ رافضیوں کی حکومت تھی۔ آئندہ سال 353ھ میں پھر اسی حکم کا اعادہ کیا گیا اور سنیوں کو بھی اس کی تعمیل کا حکم دیا گیا۔ اہل سنت اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے، چنانچہ شیعہ اور سنیوں میں فساد برپا ہوا اور بہت بڑی خون ریزی ہوئی۔ اس کے بعد رافضیوں نے ہر سال اس رسم کو زیر عمل لانا شروع کر دیا اور آج تک اس کا رواج ہندوستان میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان (متحدہ) میں اکثر سنی لوگ بھی تعزیے بناتے ہیں۔" [1]

رافضیت کی ابتدا

بنی بویہ نہایت متعصب رافضی تھے، چند دنوں تک وہ خاموش رہے، پھر ان کے تعصب کا ظہور ہونے لگا۔ دولت عباسیہ کے بہت سے وزراء اور متوسل، عجمی اور رافضی تھے لیکن ان میں سے کسی نے علانیہ رافضیت کی ترویج و اشاعت کی جرأت نہ کی تھی۔ معزالدولہ نے خلفاء کی قوت ختم کرنے کے ساتھ ہی بغداد میں رافضیت کی تبلیغ شروع کر دی اور 351ھ میں جامع اعظم کے پھاٹک پر مذکورہ تبرا لکھوایا۔ (جس میں کنایوں میں حضرت معاویہ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عائشہ، حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم پر لعنت کی گئی۔)

خلیفہ میں اس بدعت کو روکنے کی طاقت نہ تھی، کسی سُنّی نے رات کو یہ عبارت مٹا دی، معزالدولہ نے پھر لکھوانے کا ارادہ کیا لیکن اس کے وزیر مہلبی نے مشورہ دیا کہ صرف معاویہ کے نام کی تصریح کی جائے اور ان کے نام کے بعد وَالظّٰلِمِينَ لِآلِ رَسُولِ اللّٰهِ یعنی "آل رسول اللہ پر ظلم کرنے والوں" کا فقرہ بڑھا دیا جائے۔

[1] "تاریخ اسلام" اکبر خاں نجیب آبادی: 566/2 طبع کراچی۔

معزالدولہ نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔[1] غالباً تبرا کی اس منافقانہ شکل کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔

معزالدولہ نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ بغداد میں رافضیوں کے تمام مراسم جاری کر دیے، عید غدیر کے دن عام عید اور جشن مسرت منانے کا حکم دیا۔ محرم کے لیے حکم جاری کیا کہ عاشورے کے دن تمام دکانیں اور کاروبار بند رکھے جائیں، کل مسلمان خاص قسم کی ٹوپیاں پہن کر نوحہ و ماتم کریں۔ عورتیں چہرے پر بھبھوت مل کر پریشان مُو (بکھرے بال) وگریبان چاک، سینہ کوبی کرتی ہوئی شہر میں ماتمی جلوس نکالیں، سنیوں پر یہ احکام بہت شاق گزرے لیکن وہ رافضیوں کی قوت اور حکومت کے سامنے بے بس تھے، اس لیے ان احکام کو منسوخ تو نہ کرا سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محرم 353ھ میں رافضیوں اور سنیوں میں سخت فساد ہوا۔ اور بغداد میں بڑی بدامنی پھیل گئی۔''[2]

قیامِ امن کا واحد طریقہ

ان تاریخی حوالوں سے واضح ہے کہ سانحۂ شہادتِ حسین کے حوالے سے شیعی رسومات اور ان پر اصرار، مسلمانوں کے درمیان افتراق و انتشار اور باہم فساد و خوں ریزی کا بہت بڑا سبب ہے۔ بنابریں جب تک ان کا انسداد و خاتمہ یا کم از کم انھیں ان کی مخصوص چار دیواریوں تک محدود نہیں کیا جاتا، فتنہ و فساد ختم نہیں ہو سکتا۔ امن، محض اتحاد کے اعلانات یا امن کمیٹیوں کے قیام سے ممکن نہیں۔ اس کے لیے ان اسباب و عوامل کا سد باب ضروری ہے جو فساد اور باہم تصادم میں کارفرما ہوتے ہیں۔ جب تک یہ نہیں ہوگا، فرقہ وارانہ تصادم کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔

[1] الكامل في التاريخ لابن أثير: 275/7. [2] الكامل في التاريخ لابن أثير: 279/7و 286، وتاریخ اسلام شاہ معین الدین احمد ندوی، اعظم گڑھ: 13,12/4.

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی، دامن ترمکن، ہشیار باش

رسوماتِ محرم......علمائے اسلام کی نظر میں

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ

حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ نے فرمایا:

«يَا مَعَاشِرَ بَنِي اٰدَمَ! اِتَّخَذْتُمْ رُسُومًا فَاسِدَةً تُغَيِّرُ الدِّينَ، اِجْتَمَعْتُمْ يَوْمَ عَاشُورَآءَ فِي الْأَبَاطِيلِ، فَقَوْمٌ اتَّخَذَهُ مَأْتَمًا، أَمَا تَعْلَمُونَ أَنَّ الْأَيَّامَ أَيَّامُ اللّٰهِ وَالْحَوَادِثَ مِنْ مَشِيئَةِ اللّٰهِ وَإِنْ كَانَ حُسَيْنٌ رضی اللہ عنہ قُتِلَ فِي هٰذَا الْيَوْمِ فَأَيُّ يَوْمٍ لَمْ يَمُتْ فِيهِ مَحْبُوبٌ مِّنَ الْمَحْبُوبِينَ؟ وَقَدِ اتَّخَذُوهُ لَعِبًا بِحِرَابِهِمْ وَسِلَاحِهِمْ............ اِتَّخَذْتُمُ الْمَأْتَمَ عِيدًا كَأَنَّ إِكْثَارَ الطَّعَامِ وَاجِبٌ عَلَيْكُمْ وَضَيَّعْتُمُ الصَّلَاةَ وَقَوْمٌ اسْتَغَلُّوا بِمَكَاسِبِهِمْ فَلَمْ يَقْدِرُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ»

”اے بنی آدم! تم نے اسلام کو بدل ڈالنے والی بہت سی رسمیں اپنا رکھی ہیں، (مثلاً:) تم دسویں محرم کو باطل قسم کے اجتماع کرتے ہو۔ کئی لوگوں نے اس دن کو نوحہ و ماتم کا دن بنا لیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے حادثے ہمیشہ رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس دن (مظلوم شہید کے طور پر) قتل کیے گئے تو وہ کون سا دن ہے جس میں کوئی نہ کوئی اللہ کا نیک بندہ

فوت نہیں ہوا؟ (لیکن تعجب کی بات ہے کہ) انھوں نے اس سانحۂ شہادت مظلومانہ کو کھیل کود کی چیز بنا لیا...... تم نے ماتم کو عید کے تہوار کی طرح بنا لیا، گویا اس دن زیادہ کھانا پینا فرض ہے اور نمازوں کا تمھیں کوئی خیال نہیں (جو فرض ہیں) ان کو تم نے ضائع کر دیا، یہ لوگ اپنے ہی من گھڑت کاموں میں مشغول رہتے ہیں، نمازوں کی توفیق ان کو ملتی ہی نہیں۔‘‘ [1]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ 354ھ کے واقعات میں ماتمی جلوسوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

«هٰذَا تَكَلُّفٌ لَا حَاجَةَ إِلَيْهِ فِي الْإِسْلَامِ وَلَوْ كَانَ أَمْرًا مَّحْمُودًا لَّفَعَلَهٗ خَيْرُ الْقُرُونِ وَصَدْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَخِيرَتُهَا وَهُمْ أَوْلٰى بِهٖ وَأَهْلُ السُّنَّةِ يَقْتَدُونَ وَلَا يَبْتَدِعُونَ»

’’یہ (ماتمی مجالس وغیرہ کی) رسمیں، اسلام میں ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر یہ واقعتاً اچھی چیز ہوتی تو خیر القرون اور اس امت کے ابتدائی اور بہتر لوگ اس کو ضرور کرتے، وہ اس کے سب سے زیادہ اہل تھے (بات یہ ہے کہ) اہل سنت (سنت نبوی کی) اقتدا کرتے ہیں، اپنی طرف سے بدعتیں نہیں گھڑتے۔‘‘ [2]

شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ

از جملہ بدعات رَفَضَہ کہ در دیار ہندوستان اشتہار تمام یافتہ ماتم داری وتعزیہ سازی است در ماہ محرم بزعم محبت حضرت حسنین رضی اللہ عنہما...... وصور ظاہریہ ایں بدعات چند چیز

[1] التفہیمات الإلٰھیۃ: 288/1، تفہیم رقم: 69، طبع حیدر آباد سندھ 1970ء۔ [2] البدایۃ والنہایۃ: 271/11.

است۔ اول ساختن نقل قبور ومقبرہ وعلم وشدہ وغیرہا۔ وایں معنی بالبداہت از قبیل بت سازی وبت پرستی است چہ ساختن نقل شکل قبور ومقبرہ وآنرا تعظیم کردن ...... اصل قبر ومقبرہ دانستن از اطوار مشرکین صنم پرست است۔ حقیقت صنم پرستی ہمین است کہ شکلے از دست خود تراشیدہ وساختہ ونام شخصے برآں نہادہ باوہماں معاملہ کہ با اصل باید با آن نقل کہ چوب یا سنگ تراشیدہ است بعمل آرند...... وآنچہ اہل زمانہ با تعزیہ ہامی کنند ہرگز باقبور واقعیہ ہم نباید کرد چہ جائے قبور جعلیہ وایں مبتدعان عبادت سجدہ وطواف کردہ صراحۃً خود رابسرحد شرک قبیح می رسانند وشدہ وعلم وتعزیہ چوں مسجود ومطاف گرد دہمہ درمعنی بت پرستی است۔ [1]

خلاصۂ عبارت یہ ہے کہ پاک و ہند میں رافضیوں کے زیر اثر تعزیہ سازی کی جو بدعت رائج ہے یہ شرک تک پہنچا دیتی ہے کیونکہ تعزیے میں حسین رضی اللہ عنہ کی قبر کی شبیہ بنائی جاتی ہے اور پھر اس کو سجدہ کیا جاتا ہے اور وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جو بت پرست اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں اور اس معنی میں یہ پورے طور پر بت پرستی ہے۔ أعاذنا اللہ منه.

اسی طرح مولانا شہید ماہ محرم میں قصۂ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے ذکر کو بھی مذموم و مکروہ قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

”ذکر قصۂ شہادت است بشرح وبسط عقد مجلس کردہ بایں قصد کہ مردم آں رابشنوند وتأسفہا نمایند وحسرتہا فراہم آرند وگریہ وزاری کنند۔ ہر چند در نظر ظاہرے خللے دراں ظاہر نمی شود۔ امافی الحقیقت ایں ہم مذموم ومکروہ است۔“ [2]

[1] صراط مستقیم، ص: 59. [2] صراط مستقیم، ص: 61.

امام ابن رجب رحمہ اللہ

امام ابن رجب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«وَأَمَّا اتِّخَاذُهُ مَأْتَمًا كَمَا تَفْعَلُهُ الرَّافِضَةُ لِأَجْلِ قَتْلِ الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہما فِيهِ، فَهُوَ مِنْ عَمَلِ مَنْ ضَلَّ سَعْيُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُوَ يَحْسَبُ أَنَّهُ يُحْسِنُ صُنْعًا، وَلَمْ يَأْمُرِ اللّٰهُ وَلَا رَسُولُهُ بِاتِّخَاذِ أَيَّامِ مَصَائِبِ الْأَنْبِيَاءِ وَمَوْتِهِمْ مَأْتَمًا فَكَيْفَ بِمَنْ دُونَهُمْ؟»

”عاشورا کے دن کو ماتم کا دن بنا لینا، جیسے روافض نے اس دن میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت واقع ہونے کی بنا پر، اس کو ماتم کا دن بنا لیا ہے تو یہ ان لوگوں کا شعار ہے جن کا عمل وسعی اس دنیا ہی میں رائیگاں ہو گیا اور وہ سمجھتے یہ رہے کہ وہ کوئی اچھا کام کر رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں یہ حکم نہیں دیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مصائب کے ایام اور ان کی موت کو ماتم کا دن بنایا جائے، تو ان سے کم تر لوگوں کی موتوں کو کیسے ماتم کا دن بنایا جا سکتا ہے۔“[1]

مولانا عبدالماجد دریا بادی رحمہ اللہ

مولانا عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں:

”جوانانِ جنت کے سردار کی برسی اس ماہ میں ہر جگہ کے طول و عرض میں منائی جائے گی لیکن کیونکر اور کس طرح؟

[1] لطائف المعارف فیما لمواسم العام من الوظائف، ص:53,52.

اس کے سرخ سرخ خون کی یاد میں نئے نئے سبز رنگ کے کپڑے رنگ کر پہنے جائیں گے۔

وہ بھوکا رہا تھا اس کی بھوک کی یاد میں لذیذ کھانے کھائے جائیں گے اور گھر گھر مزیدار حلوے اور شیر مالوں کے حصے تقسیم ہوں گے۔

وہ پیاس میں تڑپا تھا اس کی پیاس کو یاد کر کے برف اور دودھ ڈال کر اعلیٰ درجے کے مکلّف شربت تیار ہوں گے اور اُن کے کئی کئی گلاس زیرِ حلق اتارے جائیں گے۔

اس نے اپنی راتیں رکوع وسجود میں، قیام وتلاوت میں، مناجات وزاری میں بسر کی تھیں اور اس کی برسی منانے والے مٹی کے چراغ، بجلی کے قمقمے اور گیس کے ہنڈے جلا جلا کر ساری رات ایک میلہ اور جشن قائم رکھیں گے۔

اس کے گھر کی معزز خواتین معاذ اللہ موسیقی کا ذکر ہی کیا، شاید شاعری کے بھی قریب نہیں گئی تھیں، اس گھرانے کی باندی اور کنیز ہونے پر فخر کرنے والی عورتیں اپنی راتیں خوش الحانی کی پوری رعایت کے ساتھ سوز خوانیوں کے کمالات دکھانے میں بسر کر دیں گی۔

اس کے کان میں شاید ساری عمر کبھی باجے کی آواز نہ پڑی ہو، آج اس کے نام پر عشرہ بھر ہر ہر گلی کوچہ ڈھول اور تاشوں کے شور سے گونج کر رہے گا۔ تعزیے اٹھیں گے، علَم گشت کریں گے، براق بنیں گے، مجلسیں برپا ہوں گی، کہیں چائے تقسیم ہو گی، کہیں شیر مال بٹیں گے۔ غرض پورے دس دن خوب دل کھول کر جشن رہے گا، جو کھانے کبھی نہ کھائے تھے کھانے میں آئیں گے، جو منظر کبھی نہ دیکھے تھے دیکھنے میں آئیں گے۔

اور سب کچھ کون کرے گا؟ آریہ نہیں، یہودی نہیں، عیسائی نہیں، ہندو نہیں، سکھ نہیں، پارسی نہیں، دشمن نہیں دوست، غیر مسلم نہیں اپنے کو مسلمان کہلانے والے اور مسلمانوں میں بھی اپنے کو سُنی کہنے والے اور اپنے اہل سنت ہونے پر فخر کرنے والے لوگ کریں گے اور اگر کوئی اس سارے ہنگامۂ عیش و عشرت کے خلاف اس یادِ ایام کے نہیں، تمسخر یادِ ایام کے خلاف زبان کھولے تو وہ مردود ہے، دشمن اہلِ بیت ہے، لامذہب ہے، بے دین ہے اور سب کے عقائد کو بگاڑنے والا ہے۔''[1]

اہل سنت کے غور و فکر کے لیے چند باتیں

ماہ محرم کی ان بدعات و رسومات غیر شرعیہ کے علاوہ واقعۂ کربلا سے متعلق بھی اکثر اہل سنت کا زاویۂ فکر صحیح نہیں۔ اس سلسلے میں چند باتیں پیش خدمت ہیں، امید ہے کہ اہل سنت حلقے اس پر پوری سنجیدگی، متانت اور علم و بصیرت کی روشنی میں غور فرمائیں گے۔

اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ اہل سنت کے خطباء اور واعظین فلسفۂ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کو بالعموم اس طرح بیان کرتے ہیں جو خالصتاً رافضی آئیڈیالوجی کا مظہر ہوتا ہے اور اس کے متعلق یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ تاریخ اسلام میں حق و باطل کا سب سے بڑا معرکہ تھا۔ واعظین خوش بیان یہ نہیں سوچتے کہ اگر ایسا ہی ہوتا تو اس دور خیر القرون میں، جبکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بھی ایک معتدبہ جماعت موجود تھی اور ان کے فیض یافتگان تابعین تو بکثرت تھے، اس معرکے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ہی اکیلے کیوں صف آرا ہوتے؟ معرکہ ہوتا حق و باطل اور کفر و اسلام کا اور صحابہ و تابعین

[1] منقول از ہفت روزہ المنبر فیصل آباد، شمارہ 6، دسمبر 1978ء۔

اس سے نہ صرف یہ کہ الگ رہتے بلکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی اس سے روکتے، کیا ایسا ممکن تھا؟

رافضی آئیڈیالوجی تو یہی ہے کہ وہ (معاذ اللہ) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے کفر وارتداد اور منافقت کے قائل ہیں اور وہ یہی کہیں گے کہ ہاں اس معرکۂ کفر و اسلام میں ایک طرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ تھے اور دوسری طرف صحابہ سمیت یزید اور دیگر ان کے تمام حمایتی، صحابہ و تابعین اس جنگ میں خاموش تماشائی بنے رہے اور حسین رضی اللہ عنہ نے اسلام کو بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ لیکن کیا اہل سنت اس نقطۂ نظر کو تسلیم کرلیں گے؟

یقیناً کوئی اہل سنت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق اس قسم کا عقیدہ نہیں رکھتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی بڑی تلخ ہے کہ اہل سنت شہادت حسین کا جو فلسفہ بیان کرتے ہیں وہ اسی تال سر سے ترتیب پاتا ہے جو رافضیت کا مخصوص راگ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سانحۂ کربلا کو حق و باطل کا سب سے بڑا معرکہ باور کرانے سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کردار اور ان کی دینی حمیت مجروح ہوتی ہے اور دشمنانِ صحابہ کا مقصد بھی یہی ہے لیکن یہ ہمارے سوچنے کی بات ہے کہ واقعہ ایسا ہے یا نہیں؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ کفر و اسلام کا معرکہ نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس راہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اکیلے نہ ہوتے، ان صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تعاون بھی انھیں حاصل ہوتا جن کی پوری عمریں اعلائے کلمۃ اللہ میں گزریں، جو ہمہ وقت باطل کے لیے شمشیر برہنہ اور کفر و ارتداد کے لیے خدائی للکار تھے۔ یہ تصادم دراصل بعض اجتہادی غلطیوں کے نتیجے میں پیش آیا تھا، اس نکتے کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل پہلو قابل غور ہیں۔

❁ واقعات کربلا سے متعلقہ سب ہی تاریخوں میں ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب کوفے کی طرف کوچ کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو ان کے رشتہ داروں اور ہمدردوں نے انھیں روکنے کی پوری کوشش کی اور اس اقدام کے خطرناک نتائج سے انھیں آگاہ کیا۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابوواقد لیثی، جابر بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بھائی محمد ابن الحنفیہ رحمہ اللہ نمایاں ہیں۔ آپ نے ان کے جواب میں نہ عزم سفر ملتوی فرمایا نہ اپنے موقف کی کوئی دلیل پیش کی، ورنہ ممکن تھا کہ وہ بھی اس موقف میں آپ کے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ ہو جاتے۔ دراصل حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اہل کوفہ ان کو مسلسل کوفہ آنے کی دعوت دے رہے ہیں، یقیناً وہاں جانا مفید ہی رہے گا۔

❁ یہ بھی تمام تاریخوں میں آتا ہے کہ ابھی آپ راستے ہی میں تھے کہ آپ کو خبر پہنچی کہ کوفے میں آپ کے چچیرے بھائی (چچازاد) مسلم بن عقیل شہید کر دیے گئے جن کو آپ نے کوفے کے حالات معلوم کرنے کے لیے ہی بھیجا تھا۔ اس المناک خبر سے آپ کا اہل کوفہ سے اعتماد متزلزل ہو گیا اور واپسی کا عزم ظاہر کیا لیکن حضرت مسلم رحمہ اللہ علیہ کے بھائیوں نے یہ کہہ کر واپس ہونے سے انکار کر دیا کہ ہم تو اپنے بھائی مسلم کا بدلہ لیں گے یا خود بھی مر جائیں گے، اس پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمھارے بغیر میں بھی جی کر کیا کروں گا؟''

«فَهَمَّ أَنْ يَّرْجِعَ وَكَانَ مَعَهُ إِخْوَةُ مُسْلِمِ بْنِ عَقِيلٍ فَقَالُوا: وَاللّٰهِ! لَا نَرْجِعُ حَتّٰى نُصِيبَ بِثَأْرِنَا أَوْنُقْتَلَ»

''چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے واپسی کا ارادہ کر لیا لیکن آپ کے ساتھ مسلم بن عقیل کے جو بھائی تھے، انھوں نے کہا کہ واللہ! ہم تو اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے جب تک کہ ہم انتقام نہ لے لیں یا پھر خود بھی قتل ہو جائیں۔''[1]

اور یوں اس قافلے کا سفر کوفے کی طرف جاری رہا۔

❁ پھر اس پر بھی تمام تاریخیں متفق ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب مقام کربلا پر پہنچے تو گورنر کوفہ ابن زیاد نے عمر بن سعد کو مجبور کر کے آپ کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ عمر بن سعد نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے گفتگو کی تو متعدد تاریخی روایتوں کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی:

«اِخْتَرْ مِنِّي إِحْدٰی ثَلَاثٍ إِمَّا أَنْ أَلْحَقَ بِثَغْرٍ مِّنَ الثُّغُورِ وَإِمَّا أَنْ أَرْجِعَ إِلَى الْمَدِينَةِ وَإِمَّا أَنْ أَضَعَ يَدِي فِي يَدِ يَزِيدَ بْنِ مُعَاوِيَةَ فَقَبِلَ ذٰلِكَ عُمَرُ مِنْهُ»

یعنی ''تین باتوں میں سے ایک بات مان لو۔ میں یا تو کسی اسلامی سرحد پر چلا جاتا ہوں یا واپس مدینہ منورہ لوٹ جاتا ہوں یا پھر میں (براہ راست جا کر) یزید بن معاویہ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیتا ہوں، (اس سے بیعت کر لیتا ہوں) عمر بن سعد نے ان کی یہ باتیں قبول کر لیں۔''[2]

ابن سعد نے خود منظور کر لینے کے بعد یہ تجویز ابن زیاد (گورنر کوفہ) کو لکھ کر بھیجی مگر اس نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ پہلے وہ (یزید کے لیے) میرے ہاتھ پر بیعت کریں۔

[1] تاریخ الطبري: 292/4 مطبعة الاستقامة، قاهرة: 1939ء. [2] الإصابة: 71/2 الطبعة 1995ء، دارالكتب العلمية.

«فَكَتَبَ إِلَيْهِ عُبَيْدُ اللّٰهِ (ابْنُ زِيَادٍ) لَا أَقْبَلُ مِنْهُ حَتّٰى يَضَعَ يَدَهُ فِي يَدِي»

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے اور ان کی طبع خود دار نے یہ گوارا نہ کیا، چنانچہ اس شرط کو مسترد کر دیا جس پر لڑائی چھڑ گئی اور آپ کی مظلومانہ شہادت کا یہ حادثۂ فاجعہ پیش آ گیا۔ [1]

«فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. فَامْتَنَعَ الْحُسَيْنُ فَقَاتَلُوهُ...... ثُمَّ كَانَ آخِرُ ذٰلِكَ أَنْ قُتِلَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَأَرْضَاهُ.»

اس روایت کے مذکورہ الفاظ جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بیعتِ یزید پر رضامندی کا اظہار فرمایا ''الإصابة'' کے علاوہ تهذيب التهذيب (353-328/2)، تاريخ الطبري: 293/4، تهذيب تاريخ ابن عساكر (337-325/4)، البداية والنهاية (175-170/8)، الكامل لابن الأثير (283/3) اور دیگر کئی کتابوں میں موجود ہیں۔ حتی کہ شیعی کتابوں میں بھی ہیں۔ ان کے دوسرے الفاظ بھی ہیں، تاہم نتیجے میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

ان تاریخی شواہد سے معلوم ہوا کہ اگر یہ کفر و اسلام کا معرکہ ہوتا تو کوفے کے قریب پہنچ کر جب آپ کو مسلم بن عقیل کی مظلومانہ شہادت کی خبر ملی تھی۔ آپ واپسی کا عزم ظاہر نہ فرماتے۔

پھر ان شرائطِ مصالحت سے، جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عمر بن سعد کے سامنے رکھیں، یہ بات بالکل نمایاں ہو جاتی ہے کہ آپ کے ذہن میں کچھ تحفظات تھے بھی تو آپ ان

[1] الإصابة: 71/2، وتاريخ الطبري: 293/4.

سے دست بردار ہو گئے تھے۔ بلکہ یزید کی حکومت تک کو تسلیم کر لینے پر آمادگی ظاہر کردی تھی۔

ایک یہ بات اس سے واضح ہوئی کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ، یزید کو حکومت کا نااہل نہیں سمجھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ کسی حالت میں بھی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار نہ ہوتے جیسا کہ وہ تیار ہو گئے تھے بلکہ یزید کے پاس جانے کے مطالبے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس سے حسن سلوک ہی کی توقع تھی۔

اس تفصیل سے اس حادثے کے ذمہ دار بھی عریاں ہو جاتے ہیں اور وہ ہے ابن زیاد کی فوج، جس میں سب وہی کوفی تھے جنھوں نے آپ کو خط لکھ کر بلایا تھا، انھی کوفیوں نے عمر بن سعد کی سعیٔ مصالحت کو بھی ناکام بنایا جس سے کربلا کا یہ المناک سانحۂ شہادت پیش آیا۔ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا.

حضرت عثمان اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی شہادتیں

جب واقعہ یہ ہے کہ یہ معرکہ اجتہادی نوعیت کا حامل ہے تو بہتر ہے کہ ایام محرم میں اس موضوع ہی سے احتراز کیا جائے کہ ان دنوں میں اس سانحے کو اپنے بیان و خطابت کا موضوع بنانا بھی رافضیت کو فروغ دینا ہے کیونکہ تاریخ اسلام میں اس سے بھی زیادہ اہم تر شہادتوں کو نظر انداز کر کے سانحۂ کربلا کو اجاگر کرنا یہ بھی روافض ہی کا انداز ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کچھ کم جگر سوز اور دل دوز ہے جو 18 ذوالحجہ کو ہوئی؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادتِ عظمیٰ کیا معمولی سانحہ ہے جو یکم محرم کو پیش آیا؟ اسی طرح اور بڑی بڑی شہادتیں ہیں لیکن ان سب کو نظر انداز کر کے صرف شہادت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنی زبان وقلم کا موضوع بنانا کسی طرح صحیح نہیں اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ بالواسطہ اور شعوری یا غیر شعوری طور پر رافضی انداز فکر کو فروغ دینے کا باعث بنتا ہے۔

''امام'' اور ''علیہ السلام''

اسی طرح اہل سنت کی اکثریت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلا سوچے سمجھے ''امام حسین علیہ السلام'' بولتی ہے، حالانکہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ''امام'' کا لفظ بولنا اور اسی طرح ''رضی اللہ عنہ'' کے بجائے ''علیہ السلام'' کہنا بھی اہل سنت کا منہج نہیں ہے۔ اہل سنت کبھی ''امام ابو بکر صدیق''، ''امام عمر'' نہیں بولتے۔ اسی طرح ہم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی کے بعد ''رضی اللہ عنہ'' لکھتے اور بولتے ہیں۔ اور کبھی ''ابو بکر صدیق علیہ السلام یا حضرت عمر علیہ السلام'' نہیں بولتے لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' کے بجائے ''علیہ السلام'' بولتے ہیں۔ کبھی اس پر بھی غور کیا کہ ایسا کیوں ہے؟ دراصل یہ رافضیت کا وہ اثر ہے جو غیر شعوری طور پر ہمارے اندر داخل ہو گیا ہے، اس لیے یاد رکھیے کہ چونکہ رافضیوں کا ایک بنیادی مسئلہ ''امامت'' کا بھی ہے اور امام ان کے نزدیک انبیاء کی طرح من جانب اللہ نامزد اور معصوم ہوتا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی ان کے بارہ اماموں میں سے ایک امام ہیں، اس لیے ان کے لیے ''امام'' کا لفظ بولتے ہیں اور اسی طرح ان کے لیے ''علیہ السلام'' لکھتے اور بولتے ہیں۔ ہم اہل سنت کے نزدیک وہ ایک صحابیٔ رسول ہیں ''امام معصوم'' نہیں، نہ ہم رافضیوں کی امامت معصومہ کے قائل ہی ہیں، اس لیے ہمیں انھیں دیگر صحابۂ کرام کی طرح ''سیدنا حسین رضی اللہ عنہ'' لکھنا اور بولنا چاہیے۔ ''امام حسین علیہ السلام'' نہیں کیونکہ یہ رافضیوں کے معلوم عقائد اور مخصوص تکنیک کے غماز ہیں۔

یزید کے متعلق مولانا احمد رضا خاں کی صراحت

مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی، جو تکفیر مسلم میں نہایت بے باک مانے جاتے ہیں، یزید کے بارے میں یہ وضاحت فرمانے کے بعد کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ

اسے کافر جانتے ہیں اور امام غزالی وغیرہ مسلمان کہتے ہیں، اپنا مسلک یہ بیان کرتے ہیں:

''اور ہمارے امام سکوت فرماتے ہیں۔ ہم نہ مسلمان کہیں نہ کافر، لہٰذا یہاں بھی سکوت کریں گے۔''[1]

فسق و فجور کے افسانے؟

رہی بات یزید کے فسق و فجور کے افسانوں کی تو اس کے بارے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے برادر اصغر محمد ابن الحنفیہ فرماتے ہیں:

«مَا رَأَيْتُ مِنْهُ مَا تَذْكُرُونَ وَقَدْ حَضَرْتُهُ وَأَقَمْتُ عِنْدَهُ فَرَأَيْتُهُ مُوَاظِبًا عَلَى الصَّلَاةِ مُتَحَرِّيًا لِّلْخَيْرِ يَسْأَلُ عَنِ الْفِقْهِ مُلَازِمًا لِّلسُّنَّةِ»

یعنی ''تم ان کے متعلق جو کچھ کہتے ہو میں نے ان میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی، میں نے ان کے ہاں قیام کیا ہے اور میں نے انھیں پکا نمازی، خیر کا متلاشی، مسائل شریعت سے لگاؤ رکھنے والا اور سنت کا پابند پایا ہے۔''[2]

غزوۂ قسطنطنیہ کے شرکاء کی مغفرت کے لیے بشارتِ نبوی

علاوہ ازیں کم از کم ہم اہل سنت کو اس حدیث کے مطابق ہی یزید کو برا بھلا کہنے سے باز رہنا چاہیے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ قسطنطنیہ میں شرکت کرنے والوں کے متعلق مغفرت کی بشارت دی ہے اور یزید اس جنگ کا کمانڈر تھا۔ یہ بخاری کی صحیح حدیث ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے، کسی کاہن یا نجومی کی پیشین گوئی

[1] احکام شریعت، حصہ دوم، ص: 88. [2] البداية والنهاية: 233/8.

نہیں کہ بعد کے واقعات اسے غلط ثابت کردیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر نبی کے فرمان اور کاہن کی پیشین گوئی میں فرق باقی نہ رہے گا۔ کیا ہم اس حدیث کی مضحکہ خیز تاویلیں کر کے یہی کچھ ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ یہ حدیث مع ترجمہ درج ذیل ہے:

«أَوَّلُ جَيْشٍ مِّنْ أُمَّتِي يَغْزُونَ مَدِينَةَ قَيْصَرَ مَغْفُورٌ لَّهُمْ»

”میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) میں جہاد کرے گا، وہ بخشا ہوا ہے۔“[1]
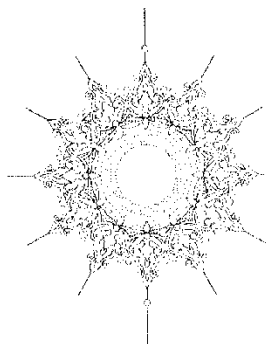
[1] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب ما قيل في قتال الروم، حديث:2924.

عاشورۂ محرم کی فضیلت میں موضوع (من گھڑت) روایات

موسیٰ الطّویل حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے یکم سے نویں محرم تک کا روزہ رکھا اس کے لیے اللہ نے فضا میں ایک مربع میل ایک رقبہ بنا دیا جس کے چار دروازے ہیں۔'' امام ابن جوزی اس حدیث کو اپنی سند سے بیان کرنے کے بعد رقمطراز ہیں: ''یہ حدیث من گھڑت ہے۔'' دیکھیے: (الموضوع لابن الجوزي: 199/2) حافظ ابن حبان کے بیان کے مطابق موسیٰ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایسی موضوع روایات بیان کرتا ہے جس کا موجد وہ خود ہوتا ہے۔ یا اسے گھڑ کر کوئی حدیث دے دی جاتی ہے اور وہ اسے بیان کر دیتا ہے۔ اس کی حدیث لکھنا درست نہیں ہے، ہاں از روئے تعجب لکھی جا سکتی ہیں۔ دیکھیے: (المجروحین: 243/2) موسیٰ کو علامہ برہان الدین حلبی نے الکشف الحثیث عمن رمی بوضع الحدیث (ص: 433) میں ذکر کیا ہے جس میں وہ وضاعین کو ذکر کرتے ہیں۔ گویا اس حدیث کو موسی الطّویل نے وضع کیا ہے۔

دوسری من گھڑت روایت

1 یہ حدیث کہ جس نے عاشورا کا روزہ رکھا اس کے لیے اللہ نے ان ساٹھ سال کی عبادت لکھ دی جس میں نماز روزے بھی ہیں۔

2 جس نے عاشورا کا روزہ رکھا اسے اللہ نے دس ہزار فرشتوں کی عبادت کا ثواب دیا۔

3 جس نے عاشورا کا روزہ رکھا اسے اللہ نے ہزار حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کا ثواب دیا۔

4 عاشورا کا روزہ رکھنے والے کو اللہ دس ہزار شہیدوں کا ثواب دیتا ہے۔

5 عاشورا کا روزہ رکھنے والے کو اللہ سات آسمانوں کا ثواب عنایت کرتا ہے۔

6 عاشورے کے دن جس مسلمان کے ہاں کسی مومن نے افطاری کی تو گویا اس کے ہاں پوری امت محمدیہ نے افطاری کی۔

7 عاشورے کے دن جس نے کسی بھوکے کو کھانا کھلایا تو گویا اس نے امت محمدیہ ﷺ کے تمام فقیروں کو کھانا کھلا کر شکم سیر کیا۔

8 جس نے عاشورا کے دن کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے ہر بال کے عوض ہاتھ پھیرنے والے کو جنت میں بلند مراتب دیے جائیں گے۔

9 حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عمر نے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ عزوجل نے عاشورے کے دن کی بدولت ہمیں فضیلت دی ہے؟ فرمایا: ''ہاں۔''

10 عاشورا کے دن اللہ نے زمینوں اور آسمانوں کو پیدا کیا۔

11 عاشورا کے دن پہاڑ اور ستارے پیدا کیے۔

12 اللہ نے عاشورا کے دن لوح وقلم پیدا کیے۔

13 عاشورا کے دن اللہ نے جبریل علیہ السلام، فرشتوں، آدم علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پیدا کیا۔

14 عاشورا کے دن اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نارِ نمرود سے نجات دی۔

15 عاشورا کے دن ہی اللہ نے دنبہ کی صورت میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا فدیہ دیا۔

16 عاشورا کے دن فرعون کو اللہ نے دریائے نیل میں غرق کیا۔

17 عاشورا کے روز اللہ نے حضرت ادریس علیہ السلام کو رفیع الدرجات بنایا اور وہ اسی روز پیدا ہوئے۔

18 عاشورا کے دن اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کی۔

19 عاشورا کے دن اللہ نے حضرت داود علیہ السلام کی بھول چوک معاف کی۔

20 عاشورا کے دن ہی اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا۔

21 عاشورے کے روز حضرت سلیمان علیہ السلام کو بادشاہی دی۔

22 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی روز پیدا ہوئے۔

23 عاشورا کے دن ہی قیامت برپا ہوگی۔

مذکورہ حدیث بھی موضوع ہے۔ حبیب بن ابی حبیب الخرططی نے اسے گھڑا ہے۔ حافظ ابن حبان رحمہ اللہ نے اس کے ترجمے میں مذکورہ بالا حدیث کو ذکر کیا ہے۔ اور یہ صراحت کی ہے کہ حبیب ثقہ راویان پر حدیثیں گھڑ کر بیان کرتا ہے۔ دیکھیے: (المجروحین: 266,265/1) امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حبیب جھوٹ بولتا تھا۔ دیکھیے: (الموضوعات لابن الجوزي: 203/2) حافظ ابن عدی فرماتے ہیں کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔ (الكامل: 818/2) امام ابن حبان نے اس حدیث کو باطل لا أصل له (باطل اور بے بنیاد ہے)۔ اور امام ابن الجوزی نے موضوع بلاشك (بلاشبہ موضوع ہے) قرار دیا ہے، لہٰذا اس حدیث سے استدلال باطل ہے۔

اس کے علاوہ یہ احادیث کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر سال بھر میں عاشورا کا روزہ فرض کیا، اس لیے اے لوگو! اس دسویں محرم کے دن روزہ رکھو اور اس روز اپنے بال بچوں و متعلقین کو خوب کھلاؤ پلاؤ کیونکہ جس نے اپنے مال وزر وغیرہ کے ذریعے

سے عاشورا کے دن اپنے متعلقین پر کشادگی کی تو اس پر اللہ تعالیٰ سال بھر تک کشادگی کرتا ہے۔ عاشورا کے دن روزہ رکھو کیونکہ یہی وہ دن ہے جس میں اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کی۔

اور یہی وہ دن ہے جس میں اللہ نے حضرت ادریس کو بلند مرتبے پر سرفراز فرمایا۔

یہ وہی دن ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے نجات دی گئی۔

اور یہی وہ دن ہے جس میں اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی پر سے اتارا۔

عاشورا ہی وہ دن ہے جس میں اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی۔

اسی دن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل کا فدیہ (دنبہ کی صورت میں) دیا۔

اسی دن اللہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل سے چھٹکارا دلایا۔

اور اسی دن اللہ نے یعقوب علیہ السلام کو ان کی قوت بینائی واپس دی۔

اسی دن اللہ نے ایوب علیہ السلام سے بلائیں دور فرمائیں۔

یہی وہ دن ہے جس میں اللہ نے حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے نکالا۔

اسی دن اللہ نے دریا کو چیر کر بنی اسرائیل کے لیے راستہ بنایا۔

اسی دن اللہ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب اگلے پچھلے گناہ معاف کیے۔

اسی دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریائے نیل عبور کیا۔

یہی وہ دن ہے جس میں حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کو توبہ کرنے کی توفیق ہوئی۔

اور جس نے عاشورا کا روزہ رکھا اس کے چالیس سال کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔

دنیا میں سب سے پہلے اللہ نے یوم عاشورا پیدا کیا۔

عاشورا کا دن ہی وہ پہلا دن ہے جس دن اللہ نے آسمان سے مینہ برسایا۔

سب سے پہلی رحمت عاشورے کے روز نازل ہوئی۔

جس نے عاشورا کا روزہ رکھا تو گویا اس نے پورا زمانہ (عمر بھر) روزہ رکھا اور یہ نبیوں کا روزہ ہے۔

جس نے دسویں محرم کی رات کو شب بیداری کی تو گویا اُس نے ساتوں آسمانی مخلوق کے مماثل عبادت کی۔

جس نے عاشورا کے دن چار رکعات اس طرح پڑھیں کہ ہر رکعت میں سورۃ الحمد ایک مرتبہ اور سورۂ اخلاص پچاس مرتبہ تلاوت کی تو اللہ نے اس کے ماضی و مستقبل کے پچاس پچاس سالہ گناہ معاف کر دیے۔ اور ملاءِ اعلیٰ (بلند ترین مقام اقتدار) میں اس کے لیے ایک لاکھ نوری منبر بنا دیے۔

عاشورا کے دن جس نے ایک گھونٹ شربت پلایا تو گویا اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی۔

عاشورا کے دن جس نے اہل بیت کے مسکینوں کو پیٹ بھر کھلایا تو وہ پل صراط پر سے بجلی کی چمک کی طرح گزر جائے گا۔

عاشورا کے دن جس نے کچھ بھی خیرات کی تو گویا سال بھر اس نے کسی سائل کو اپنے در سے واپس نہیں کیا۔

عاشورا کے دن جس نے غسل کیا تو وہ مرض موت کے سوائے کبھی بیمار نہیں ہوگا۔

عاشورا کے دن جس نے سرمہ لگایا تو پورا سال اس کی آنکھیں نہیں آئیں گی۔

عاشورا کے دن جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا تو گویا اس نے دنیا جہاں کے تمام یتیموں کے ساتھ بھلائی کی۔

عاشورا کے دن جس نے کسی کی عیادت کی تو گویا اس نے تمام اولاد آدم علیہ السلام کے مریضوں کی عیادت کی۔

امام ابن الجوزی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ کوئی عقل مند اس حدیث کے موضوع ہونے کا انکار نہیں کرے گا۔ دیکھیے: (الموضوعات لابن الجوزي: 201/2) علامہ سیوطی اور حافظ ابن عراق نے امام ابن الجوزی کی تائید کی ہے۔ مزید دیکھیے: (اللآلي المصنوعة في الأحاديث الموضوعة للسيوطي: 110/2، وتنزيه الشريعة المرفوعة لابن عراق: 151/2)
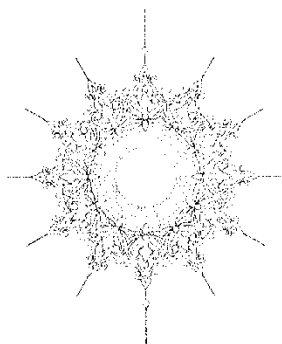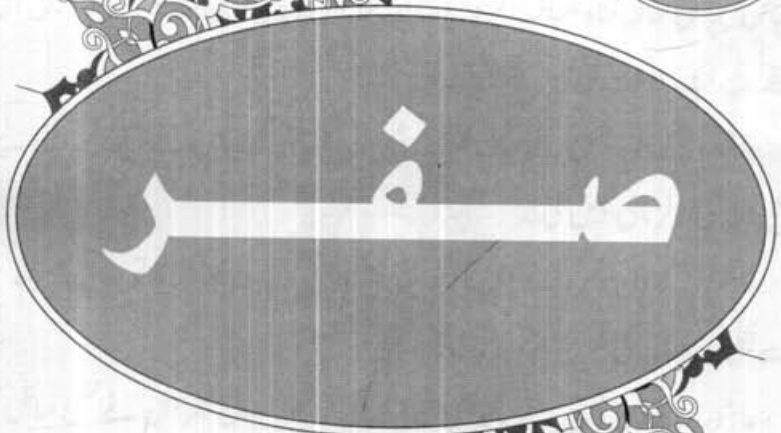
٢
صفر
فضائل واعمال اور رسومات

ماہِ صفر اور اس کی بابت بعض تصورات اور بدعات کی حقیقت

وجہِ تسمیہ

صفر کے لغوی معنی خالی ہونے کے ہیں، جو گھر سامان سے خالی ہو اسے کہتے ہیں: بیتٌ صفر من المتاع. خالی ہاتھ کو کہتے ہیں: صفر الید (المنجد) کہا جاتا ہے کہ عرب محرم کے مہینے کا احترام کرتے ہوئے اس میں قتال وغیرہ سے باز رہتے تھے لیکن ماہ صفر کے شروع ہوتے ہی وہ قتال و جدال کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے اور گھروں کو خالی چھوڑ دیتے تھے، اس لیے اس مہینے کا نام صفر پڑ گیا۔ واللہ أعلم.

فضائل

1 ''صفر'' اسلامی مہینوں کی لڑی کا دوسرا موتی ہے۔

2 صفر میں نحوست کے عقیدے کی کوئی حیثیت نہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لَا عَدْوٰی وَلَا طِيَرَةَ وَلَاهَامَةَ وَلَا صَفَرَ»

''کوئی بیماری (مشیتِ الٰہی کے بغیر) متعدی نہیں ہوتی، بدشگونی لینا (جائز) نہیں ہے، الو کی نحوست (یا روح کی پکار) اور ماہِ صفر کی نحوست کی کوئی

حقیقت نہیں۔"[1]

مسنون اعمال

قرآن و حدیث میں کہیں بھی ماہِ صفر میں کسی نیک عمل کو فضیلت کے ساتھ خاص نہیں کیا گیا، لہٰذا جو مسنون اعمال عام دنوں میں کیے جاتے ہیں، وہ اس ماہ میں بھی کیے جائیں۔

رسم و رواج

ماہِ صفر کو منحوس سمجھنا، نحوست کی وجہ سے اس میں شادیاں نہ کرنا، اس میں مٹی کے برتن توڑ ڈالنا، ماہِ صفر کے آخری بدھ، یعنی چہار شنبہ کو جلوس نکالنا اور شہروں اور بستیوں کے باہر بڑی بڑی محفلیں منعقد کر کے خاص قسم کے کھانے اور حلوے تقسیم کرنا، بیماریوں سے شفا کی نیت سے صبح صبح گھاس پر چلنا اور کہنا کہ نبی ﷺ ایک بار بیمار ہوئے تھے تو اسی دن اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفا دی تھی، پھر آپ نے لطیف اور عمدہ حلوہ کھایا تھا، مریضوں کو صحت یابی کے لیے تعویذ یا چھلا وغیرہ پہنانا اور چُوری کی رسم ادا کرنا وغیرہ۔

رسومات کا رد

اس مہینے کی بابت لوگوں میں مذکورہ رسومات و بدعات رواج پا چکی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اسے منحوس سمجھتے ہیں، جس کی تردید نبی ﷺ نے اس حدیث میں فرمائی:

«لَا عَدْوٰی وَلَا طِیَرَةَ وَلَا هَامَةَ وَلَا صَفَرَ»

"نہیں ہے (اللہ کی مشیت کے بغیر) بیماری کا متعدی ہونا اور نہیں ہے (جائز)

[1] صحيح البخاري، الطب، باب الجذام، حديث: 5707.

بدشگونی، نہ اُلّو کی نحوست یا روح کی پکار اور نہ ماہ صفر کی نحوست۔"[1]

1 اس حدیث میں کسی بھی بیماری کے متعدی ہونے کی نفی کی گئی ہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض بیماریاں یقیناً متعدی ہوتی ہیں جیسا کہ خود اسی حدیث ہی میں ہے: مجذوم سے اس طرح بھاگو جیسے تم شیر سے بچنے کے لیے بھاگتے ہو۔ فِرَّ مِنَ الْمَجْذُومِ كَمَا تَفِرُّ مِنَ الْأَسَدِ. حدیث کے اس آخری ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ جذام (کوڑھ) کی بیماری ایسی ہے کہ وہ دوسروں کو لگ سکتی ہے، اس لیے کوڑھ کی بیماری میں مبتلا شخص سے دُور رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔

جب یہ بات ہے تو پھر لَا عَدْوٰی کہہ کر متعدی ہونے کی نفی کیوں کی گئی ہے؟ تو اصل بات یہ ہے کہ اس میں صحتِ عقیدہ کا اہتمام کیا گیا ہے کہ ایک مسلمان کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کی مشیت اور حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص کی بیماری کسی دوسرے شخص کو تب ہی لگے گی جب اللہ کی مشیت ہوگی، اللہ کی مشیت کے بغیر کسی کو کسی کی بیماری نہیں لگ سکتی۔ لیکن دوسری طرف احتیاط کی تاکید اور اسباب کی اہمیت کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کیونکہ کائنات کا نظام اسباب ہی پر قائم ہے، اس لیے فرمایا: "مجذوم سے بھاگو۔" یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے: آگ سے بچو۔ سیلاب کے آتے ہوئے ریلے کی بابت کہا جائے: اس سے بچو۔ کوئی دیوار یا چھت خستہ اور بوسیدہ ہو تو اس سے بچنے کی تاکید کی جائے کیونکہ ظاہری اسباب کی رُو سے یہ تمام باتیں ہلاکت کا باعث بن سکتی ہیں (مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ بچا لے۔)

2 دوسری بات اس حدیث میں یہ فرمائی گئی ہے کہ بدشگونی لینی بھی جائز نہیں ہے۔ عربوں میں یہ عادتِ بد بھی عام تھی، وہ سفر پر جاتے ہوئے یا کوئی کام کرتے ہوئے

[1] صحيح البخاري، الطب، باب الجذام، حديث: 5707.

پرندے کو اڑاتے اور وہ بائیں جانب کو اڑتا تو کہتے کہ ہمارا یہ سفر یا کام صحیح نہیں ہوگا۔ یہ بدشگونی لے کر وہ سفر ہی اختیار نہ کرتے یا وہ کام ہی نہ کرتے جو ان کے پیش نظر ہوتا۔ حدیث میں ایسی بدشگونی لینے سے روکا گیا ہے کیونکہ اس کا تعلق توہمات اور مشرکانہ عقائد سے ہے، البتہ نیک فالی جائز ہے کیونکہ اس میں اللہ سے اچھی امید وابستہ کی جاتی ہے جو مستحسن ہے۔

ایک اور عادتِ بد اللہ کے نافرمان بندوں اور قوموں میں یہ پائی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے رسولوں اور اس کے نیک بندوں کے مجسمِ خیر وجود اور شخصیت کو (نعوذ باللہ) منحوس سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ ان کی فطرت کے بالکل مسخ ہو جانے کی دلیل ہے کہ جو افراد سراپا خیر اور باعثِ سعادت ہیں، ان کو باعثِ نحوست قرار دیا جائے، حالانکہ نحوست کا باعث خود ان کا رویہ اور اللہ کی نافرمانی کا شیوہ ہوتا ہے، جیسے مشرکینِ مکہ کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُولُوا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُولُوا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ﴾

''اور اگر ان کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کو کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: (اے محمد!) یہ تیری طرف سے ہے۔''[1]

یعنی نعوذ باللہ اسے رسول اللہ ﷺ کی نحوست کا نتیجہ بتلاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا ۝ مَآ أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾

''کہہ دیجیے: سب کچھ صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے

[1] النسآء 4:78.

کہ بات کو سمجھتے نہیں، آپ کو جو بھلائی پہنچے، وہ اللہ کی طرف سے ہے اور آپ کو جو برائی پہنچے، وہ آپ کے اپنے نفس کی طرف سے ہے۔" [1]

یعنی برائی، انسانوں کی کوتاہیوں اور گناہوں کا نتیجہ ہے، جس طرح دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ﴾

"اور تمھیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمھارے ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔" [2]

﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا ﴾

"خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا ہے لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے تاکہ اللہ ان کو ان کے بعض کرتوتوں کا مزا چکھائے۔" [3]

نبیٔ کریم ﷺ کی طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی لوگوں نے اسی طرح کا معاملہ کیا، ان پاک باز ہستیوں کو بھی ان کی قوم نے نحوست کا باعث قرار دیا، حالانکہ وہ سراپا خیر تھے، قرآن مجید میں ہے کہ فرعون کی قوم حضرت موسیٰ اور ان پر ایمان لانے والوں کو (نعوذ باللہ) منحوس سمجھتی تھی:

﴿ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ﴾

"اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی تو وہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو منحوس قرار دیتے۔" [4]

قومِ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے کہا:

﴿ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ﴾

[1] النسآء 4:78،79. [2] الشورٰی 42:30. [3] الروم 30:41. [4] الأعراف 7:131.

''انھوں نے کہا: (اے صالح!) ہم نے تجھ سے اور تیرے ساتھیوں سے بدشگونی لی ہے۔'' [1]

یعنی انھوں نے بھی حضرت صالح اور ان پر ایمان لانے والوں کو منحوس قرار دیا۔

سورۂ یٰسٓ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین شخصوں کو ایک بستی میں دعوت و تبلیغ کے لیے بھیجا، انھوں نے جب جا کر بتلایا کہ ہم اللہ کے فرستادے ہیں اور ہمارا کام اللہ کا پیغام تم تک پہنچانا ہے تو بستی والوں نے ان پیغمبروں کو کہا:

﴿ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○﴾

''کہنے لگے: ہم نے تو تمھیں نامبارک (منحوس) دیکھا ہے۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمھیں سنگسار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تمھیں سخت سزا بھگتنی ہوگی۔'' [2]

بہر حال مشرک قوموں کا یہ وتیرہ رہا ہے کہ وہ اللہ کے فرستادوں، رسولوں اور نبیوں کو (نعوذ باللہ) منحوس قرار دیتی تھیں اور جب بھی ان پر کوئی آزمائش آتی تو اس کی وجہ وہ ان پاکباز ہستیوں کو قرار دیتیں، حالانکہ اگر نحوست تھی تو خود ان کے رویّے میں تھی، ان کی نافرمانی میں تھی اور ان کے اللہ کے احکام سے اعراض و استکبار میں تھی۔ ورنہ کوئی چیز بجائے خود شر ہے نہ خیر۔ وہ چیز شر بنتی ہے تو اللہ کے حکم سے، خیر بنتی ہے تو اللہ کے حکم اور اس کی مشیت سے۔

مسلمان کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ تمام اختیارات صرف ایک اللہ کے پاس ہیں، وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے اور وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

[1] النمل 27:47. [2] یٰسٓ 36:18.

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«واعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى أَنْ يَّنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ، وَإِنِ اجْتَمَعُوا عَلٰى أَنْ يَّضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ.»

''جان لو! اگر لوگ اس بات پر جمع ہو جائیں کہ وہ تمھیں کچھ فائدہ پہنچائیں تو وہ کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے، مگر وہی جو اللہ نے تمھاری تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ اور اگر لوگ اس بات پر جمع ہو جائیں کہ وہ تمھیں کچھ نقصان پہنچائیں تو وہ تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ نے تم پر لکھ دیا ہے۔''[1]

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ دنیا کا نظام اسباب پر قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ اگرچہ اسباب کا محتاج نہیں ہے، تاہم دنیا کا عمومی انتظام اسباب کے تحت ہی چل رہا ہے اور یہ سب اس کے حکم ومشیت ہی سے ہو رہا ہے، اس میں خیر کے اسباب بھی ہیں اور شر کے بھی۔ گویہ اسباب بذات خود خیر یا شر پیدا نہیں کر سکتے، ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے، خیر اور شر بھی اسی کے حکم سے پیدا ہوتا ہے، تاہم ہمیں حکم یہی ہے کہ ظاہری اسباب کے مطابق خیر ہی کے اسباب اختیار کریں اور شر کے اسباب سے مکمل اجتناب کریں۔ اسبابِ خیر اختیار کرنے کے باوجود نتائج حسب دل خواہ نہ نکلیں تو ایسا اللہ کی مشیت ہی سے ہوتا ہے۔ اس میں زمانے کا یا کسی اور کا دخل نہیں ہوتا، اسی لیے زمانے کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کیا گیا ہے۔

3 هَامَة، سے مراد اُلّو کی نحوست ہے، یعنی اس کے دیکھنے کو نحوست قرار دیا جاتا تھا۔ اور بعض نے اس کا مطلب تناسخِ ارواح کا عقیدہ بیان کیا ہے جس میں جاہلیت کے

[1] جامع الترمذي، صفة القيامة، باب [حديث حنظلة......]، حديث: 2516.

عرب مبتلا تھے، یعنی ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد مرنے والے کی روح یا اس کی ہڈیاں پرندہ بن جاتی ہیں جس طرح ہندوؤں کا عقیدہ بھی ہے کہ مرنے والے کی روح کسی جانور میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یہ گویا عقیدۂ آخرت اور اس کے حساب کتاب کا انکار ہے۔

4 وَلَا صَفَرَ کا ایک مطلب عربوں کے طریقۂ نَسِيئ کا انکار ہے، جس کی بابت قرآن نے کہا ہے: ﴿ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ ﴾ ”نسيئ کفر میں زیادتی ہے۔“[1] نسيئ کا مطلب ہے کہ امن کے مہینے کو آگے پیچھے کر لینا۔ جاہلیت میں مبتلا عرب یہ کیا کرتے تھے کہ اگر ان کو کسی حرمت والے مہینے میں قتال و جدال یا لوٹ مار کی ضرورت لاحق ہوتی تو وہ اس مہینے کی حرمت توڑ کر اپنی من مانی کر لیتے اور اس حرمت والے مہینے کی جگہ کسی اور مہینے کو حرمت والا قرار دے کر حرمت والے چار مہینوں کی گنتی پوری کر لیتے، جیسے کسی سال محرم کی بجائے صفر کو حرمت والا مہینہ قرار دے لیا۔ نبی ﷺ کے فرمان لَا صَفَرَ کا مطلب ہے کہ آئندہ اس طرح نہیں ہو گا۔ اور وہی مہینے حرمت والے رہیں گے جو ابتدائے کائنات ہی سے حرمت والے چلے آ رہے ہیں، ان میں کوئی شخص ردّو بدل کا مجاز نہیں ہے۔ اس بات کا اعلان اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ﴾

”بلاشبہ اللہ کے نزدیک کتاب اللہ میں مہینوں کی گنتی بارہ ہے، اس دن سے ہی جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار مہینے

[1] التوبۃ 9:37.

حرمت والے ہیں۔"[1]

اور حدیث میں اس بات کو نبی ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا:

«إِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ، اَلسَّنَةُ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا، مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، ثَلَاثَةٌ مُّتَوَالِيَاتٌ: ذُوالْقَعْدَةِ، وَذُوالْحِجَّةِ، وَالْمُحَرَّمُ، وَرَجَبُ مُضَرَ، الَّذِي بَيْنَ جُمَادٰى وَ شَعْبَانَ»

"زمانہ گھوم گھما کر پھر اسی حالت پر آگیا ہے جس حالت پر اس وقت تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی تھی۔ سال بارہ مہینوں کا ہے جن میں چار حرمت والے ہیں، تین پے در پے، ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور چوتھا قبیلۂ مُضَر کا رجب، جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان ہے۔"[2]

اس میں نبی ﷺ نے وضاحت فرما دی کہ اب حرمت والے مہینوں کی وہی ترتیب رہے گی جو ابتدائے آفرینش کے وقت تھی۔ اور رجب کے مہینے کو قبیلۂ مُضَر کی طرف اس لیے منسوب کیا گیا ہے کہ وہ اس مہینے کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ بہر حال لَا صَفَرَ کا ایک مطلب یہ ہے کہ اب صفر کا مہینہ وہی ہے جو محرّم کے بعد ہے۔ اس میں ردّو بدل نہیں ہوگا۔

اور دوسرا مطلب لَا صَفَرَ کا یہ ہے کہ صفر کا مہینہ منحوس نہیں جیسا کہ عربوں میں اس کی نحوست کا تصور پایا جاتا تھا۔ اسلام میں کسی مہینے، دن اور وقت کے منحوس ہونے کا تصور نہیں ہے، اس لیے صفر کے منحوس ہونے کی بھی آپ نے نفی فرمائی۔

[1] التوبة 9:36. [2] صحيح البخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في سبع أرضين، حديث: 3197، و صحيح مسلم، القسامة والمحاربين، باب تغليظ تحريم الدماء......، حديث: 1679.

تیرہ تیزی کے دن؟

برصغیر پاک و ہند کے بعض علاقوں میں بھی صفر کے پہلے تیرہ دن منحوس سمجھے جاتے ہیں اور انھیں تیرہ تیزی کے دن کہا جاتا ہے۔ ان ایام میں یہ توہم پرست لوگ شادی کرنے کو نحوست کا باعث قرار دیتے ہیں۔ یہ خیال اور عقیدہ بھی محرم کو سوگ کا مہینہ سمجھنے کی طرح غلط ہے۔ آپ سال کے کسی مہینے یا دن میں شادی کر سکتے ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، نہ کسی عظیم شخصیت کی شہادت کی وجہ سے کوئی مہینہ سوگ کا مہینہ ہی قرار پا سکتا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ذوالحجہ کا مہینہ بھی سوگ کا مہینہ ہوتا جس میں خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا المناک سانحہ پیش آیا تھا۔ لیکن اس مہینے میں سب سے زیادہ شادیاں ہوتی ہیں۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ماہ صفر کے ابتدائی دنوں کی نحوست کا عقیدہ بھی یکسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

آخری بدھ یا آخری چہار شنبہ کی حقیقت

اسی ماہِ صفر کے آخری بُدھ میں، جسے فارسی میں چہار شنبہ کہتے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس مرض کا آغاز ہوا تھا، جس سے پھر آپ صحت یاب نہ ہو سکے تا آنکہ اس کے بعد شروع ہونے والے مہینے (ربیع الاول) کی بارہ تاریخ کو آپ دنیا سے تشریف لے گئے، صلی اللہ علیہ وسلم۔ جیسا کہ ذیل کے تاریخی حوالے سے واضح ہے:

«بَدَأَ بِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ مَرَضُهُ الَّذِي مَاتَ فِيهِ يَوْمَ الْأَرْبِعَاءِ، لِلَيْلَتَيْنِ بَقِيَتَا مِنْ صَفَرَ سَنَةَ إِحْدٰى عَشْرَةَ فِي بَيْتِ مَيْمُونَةَ، ثُمَّ انْتَقَلَ حِينَ اشْتَدَّ مَرَضُهُ إِلٰى بَيْتِ عَائِشَةَ، وَقُبِضَ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ ضُحًى

فِي الْوَقْتِ الَّذِي دَخَلَ فِيهِ الْمَدِينَةَ لِاثْنَتَيْ عَشْرَةَ خَلَتْ مِنْ رَبِيعِ الْأَوَّلِ»

''رسول اللہ ﷺ کی اُس بیماری کا آغاز جس میں آپ کی وفات ہوئی، 11 ھ کے اواخر صفر میں بدھ کے دن جبکہ ماہ صفر کی دو راتیں باقی رہ گئی تھیں، حضرت اُمّ المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ہوا، پھر جب آپ ﷺ کی بیماری شدّت اختیار کر گئی تو آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر منتقل ہو گئے اور بارہ ربیع الاوّل بروز پیر بوقت چاشت جس وقت آپ مدینہ میں داخل ہوئے تھے، آپ کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔''[1] (ﷺ)

لیکن عجیب بات ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے بہت سے مسلمان گھرانوں میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ وہ صفر کے آخری بدھ کو رسول اللہ ﷺ کے ''یومِ غسلِ صحت'' کے طور پر مناتے ہیں۔ اس روز صبح سویرے باغوں کی چہل قدمی کو اجر و ثواب کا باعث سمجھتے ہیں اور اس خوشی میں بہت سی جگہ تعطیل بھی ہوتی ہے اور اب چند سالوں سے ''چہار شنبہ'' کا جلوس بھی نکلتا ہے۔

اوّل تو ''یوم'' منانے کی رسم کا کوئی تعلق ہی اسلام سے نہیں ہے۔ یہ خالص کافر قوموں کا شعار ہے۔ نبی ﷺ کے عہدِ سعادت اور خیر القرون میں بڑے بڑے اہم واقعات رُونما ہوئے۔ بڑے بڑے معرکے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اور اپنی ایمانی قوت سے سَر کیے اور اولو العزمی و سرفروشی کے انمٹ نقوش جریدۂ عالم پر ثبت کیے لیکن ان میں سے کسی بھی اہم واقعے اور فتح کو ''یوم'' کے طور پر نہیں منایا گیا۔ نبی ﷺ کا پورا دَورِ رسالت بھی اس سے خالی ہے، خلافت راشدہ میں اس کا نام و

[1] أسد الغابة: 144/1، طبع دارالکتب العلمیہ (بیروت).

نشان نہیں ملتا اور اس کے بعد کے عہد صحابہ و تابعین میں بھی اس قسم کی کوئی چیز نہیں ملتی، اس لیے ''یومِ غسل صحت'' سراسر خانہ ساز ہے جس کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے۔

علاوہ ازیں تاریخی طور پر بھی یہ بات خلافِ واقعہ ہے کہ صفر کے آخری بدھ کو رسول کریم ﷺ نے غسلِ صحت فرمایا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس تاریخوں میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ آپ ﷺ کے مرض الموت کا آغاز ماہِ صفر کے بالکل آخر میں (جبکہ اس کی چند راتیں یا صرف دو راتیں باقی رہ گئی تھیں) ہوا۔ بعض تاریخوں میں اسے یوم اربعاء (بدھ کا دن) قرار دیا گیا ہے یا بقولِ بعض ربیع الاوّل کی ابتدا میں آپ ﷺ بیمار ہوئے اور پھر بیمار ہی رہے۔ یہاں تک کہ بارہ (12) ربیع الاول بروز پیر آپ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ فکان شکواه إلٰی أن قبض ﷺ. [1]

مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کا اعتراف اور صراحت

علاوہ ازیں خود بریلویوں کے ''امام'' احمد رضا خاں بریلوی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ اُن سے جب آخری چہار شنبہ کی بابت یہ سوال کیا گیا:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ صفر کے اخیر چہار شنبہ کے متعلق عوام میں مشہور ہے کہ اس روز حضرت ﷺ نے مرض سے صحت پائی تھی بنابر اس کے اس روز کھانا وشیرینی وغیرہ تقسیم کرتے ہیں اور جنگل کی سیر کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس مختلف جگہوں میں مختلف معمولات ہیں۔ کہیں اس روز کو نحس و مبارک جان کر گھر کے پُرانے برتنِ گِل توڑ ڈالتے ہیں اور تعویذ و چھلا چاندی کے اس روز کی صحت بخشی جناب رسول اللہ ﷺ میں مریضوں کو استعمال کراتے ہیں یہ جملہ اُمور بربنائے صحت

[1] ملاحظہ ہو: تاریخ الطبري :184/3 طبع جدید، و سیرت ابن ھشام:624/4، و طبقات ابن سعد: 11/2، والبدایة والنھایة224,223/5، وأسد الغابة:34,33/1، طبع قدیم اور دیگر کتب تواریخ۔

پانے رسول اللہ ﷺ عمل میں لائے جاتے ہیں، لہٰذا اصل اس کی شرع میں ثابت ہے کہ نہیں اور فاعل عامل اس کا بر بنائے ثبوت یا عدم مرتکبِ معصیت ہوگا یا قابلِ ملامت وتادیب؟''

تو مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے حسبِ ذیل جواب تحریر فرمایا:

''آخری چہار شنبہ کی کوئی اصل نہیں نہ اس دن صحت یابیٔ حضور سید عالم ﷺ کا کوئی ثبوت ہے بلکہ مرضِ اقدس، جس میں وفات ہوئی، اس کی ابتدا اسی دن سے بتائی جاتی ہے۔ اور ایک حدیث مرفوع میں آیا ہے: «آخر أربعاء من الشهر يوم نحس مستمر» اور مروی ہے ابتدائے ابتلائے سیدنا ایوب علی نبينا و عليه الصلاة والتسلیم اسی دن تھی اور اسے نحس سمجھ کر مٹی کے برتن توڑ دینا گناہ و اضاعتِ مال ہے۔ بہر حال یہ سب باتیں بے اصل و بے معنی ہیں۔'' واللّٰہ تعالٰی أعلم.[1]

اسی طرح اس فرقے کے ایک اور مفتی لکھتے ہیں:

''ماہ صفر کا آخری چہار شنبہ ہندوستان میں بہت منایا جاتا ہے۔ لوگ اپنے کاروبار بند کر دیتے ہیں۔ سیر وتفریح اور شکار کو جاتے ہیں، پُوریاں پکتی ہیں اور نہاتے دھوتے ہیں، خوشیاں مناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس روز غسلِ صحت فرمایا تھا اور بیرون مدینہ سیر کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

یہ سب باتیں بے اصل ہیں بلکہ ان دنوں میں حضورِ اکرم ﷺ کا مرض شدت کے ساتھ تھا، لوگوں کی جو باتیں بنائی ہوئی ہیں، سب خلافِ واقعہ ہیں۔''[2]

الغرض مذکورہ صراحت اور اعتراف کے بعد اس دن کو، جس میں نبی ﷺ ایسے شدید بیمار ہوئے کہ آپ جانبر نہ ہو سکے، جشن کے طور پر منانا اور خوشی میں جلُوس نکالنا

[1] احکامِ شریعت مسئلہ: 93 حصہ دوم، ص: 111,110. [2] ''بہارِ شریعت'' سولھواں حصہ، ص: 258.

اور سیر وتفریح کے لیے نکلنا بڑا عجیب ہے۔ جو لوگ ناواقفیت میں ایسا کر رہے ہیں ان کا عذر تو پھر بھی شاید مسموع ہو لیکن تاریخی حقائق جاننے کے باوجود کوئی شخص صفر کے آخری بدھ کو جاہلانہ اور مبتدعانہ خیالات کے مطابق بطورِ جشن مناتا ہے تو اس کی سنگدلی قابلِ صد ماتم ہے۔

إِنْ كُنْتَ لَا تَدْرِي فَتِلْكَ مُصِيبَةٌ وَإِنْ كُنْتَ تَدْرِي فَالْمُصِيبَةُ أَعْظَمُ
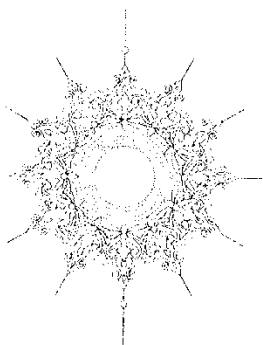
۳
ربیع الأول
فضائل واعمال اور رسومات

ربیع الاول

وجہ تسمیہ

عربوں کے ہاں یہ مہینہ موسم بہار کا پہلا مہینہ قرار پایا تھا، اس لیے اسے ربیع الاول کہتے تھے۔ [1]

فضائل

ربیع الاول، اسلامی سال کا تیسرا مہینہ ہے۔ یہ مہینہ اس اعتبار سے نہایت ممتاز ہے کہ اس مہینے کی 9 تاریخ ہی کو ہمارے پیغمبر نبی عربی، سید الاولین والآخرین حضرت محمد ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی اور اسی مہینے کی بارہ تاریخ کو آپ دنیا سے رحلت بھی فرما گئے۔ ﷺ۔

مسنون اعمال

اس مہینے سے مخصوص کسی نیک عمل کی فضیلت کے بارے میں کوئی نص قرآن و حدیث میں نہیں ہے نہ اس کی کوئی فضیلت ہی کسی حدیث میں بیان کی گئی ہے، لہٰذا جو مسنون اعمال عام دنوں میں کیے جاتے ہیں، وہ اس مہینے میں بھی کیے جائیں۔

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔

رسوم و بدعات

ربیع الاول کا چاند دیکھ کر لوگوں کو ''عید مبارک'' کہنا یا آمدِ عید کا اعلان کرنا۔ مہینہ بھر محافل میلاد کا انعقاد کرتے رہنا اور محافل میں آمد مصطفےٰ ﷺ کا انتظار کرتے ہوئے تعظیماً کھڑے ہو جانا۔ بارہ ربیع الاول کو ''تیسری عید'' قرار دینا اور اس کو اللہ اور رسول کی مقرر کردہ دونوں عیدوں سے زیادہ اہم سمجھنا، نیز جشن میلاد منانا اور بسوں، کاروں، ٹرالیوں اور بیل گاڑیوں کی صورت میں جلوس نکالنا یا اس میں شرکت کرنا۔ مختلف مقامات پر جھنڈیاں لگانا اور مبالغہ آمیز نعتیں پڑھنا، خانہ کعبہ، روضۂ مبارکہ، مسجد نبوی اور دیگر مقامات مقدسہ کے ماڈل بنا کر ان کا طواف کرنا اور آتش بازی، ہلڑ بازی اور رقص و سرود کی مخلوط اور غیر مخلوط محفلیں جمانا۔ وغیرہ وغیرہ ہیں۔

''عید میلاد'' چند قابل غور پہلو!

1 سالہا سال سے مذکورہ بدعات دیکھنے میں آرہی ہیں، بالخصوص 12 ربیع الاول کو بڑی دھوم دھام سے نبیٔ اکرم ﷺ کا یوم ولادت منایا جاتا ہے۔ جگہ جگہ جلوس نکلتے ہیں۔ گلی گلی چراغاں ہوتا ہے۔ کھانے پکانے کا بھی خوب خوب اہتمام اور ایک عجیب جشن کا سا سماں ہوتا ہے۔ اسے کہنے کو بھی ''جشن میلاد'' یا ''عید میلاد'' کہا جاتا ہے، حالانکہ اسلام میں عیدیں صرف دو ہی ہیں۔

بلاشبہ یہ سب مناظر عوام کی نبیٔ اکرم ﷺ کے ساتھ والہانہ عقیدت و محبت کا مظہر ہیں۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ہمیں نبی ﷺ کے ساتھ کس قسم کی محبت کا حکم دیا گیا ہے۔ آیا محبت کا مطلب یہ ہے کہ ہم سال میں صرف ایک روز آپ ﷺ کی ولادت

کا جشن منالیں؟ یا محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم آپ کے لائے ہوئے دین اسلام کو اپنی زندگی میں بھی نافذ کریں اور اپنے گردوپیش کے ماحول کو بھی اس کے مطابق بنانے کی حتی المقدور سعی کریں۔

اگر اول الذکر بات ہے تو ظاہر ہے کہ اس خود ساختہ معیار محبت کی رو سے تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام اور ائمۂ دین بھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بے گانہ قرار پائیں گے کیونکہ ''جشن میلاد'' کا یہ اہتمام صحابۂ کرام، تابعین اور ائمۂ دین میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔ نہ کسی نے اس کا حکم دیا۔

اور اگر محبت کا مفہوم وہ ہے جو صحابۂ کرام نے سمجھا، تابعین و تبع تابعین نے سمجھا اور امامانِ دین نے سمجھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو اپنایا جائے، اپنے کردار کو دین کے سانچے میں ڈھالا جائے اور دینی اقدار و روایات کو فروغ دیا جائے جیسا کہ صحابہ و تابعین اور ائمۂ دین نے کیا تو پھر سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ہمارا یہ ''جشن میلاد'' اس سے کسی قسم کی کوئی مناسبت رکھتا ہے؟

2 نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی رو سے دین میں اپنی طرف سے اضافہ مردود اور ناقابل قبول ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ»[1]

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ دین میں اضافہ شدہ کام (بدعت) مردود ہی نہیں بلکہ گمراہی ہے جو جہنم میں لے جانے والی ہے۔

«كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَ كُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ»

[1] صحيح البخاري، الصلح، باب: إذا اصطلحوا على صلح جور......، حديث: 2697، و صحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة......، حديث: 1718.

''ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔'' [1]

جب یہ واضح ہو گیا کہ ''عید میلاد'' کا کوئی شرعی ثبوت نہیں نہ صحابہ وتابعین اور ائمۂ دین (امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم) اور دیگر ائمہ نے اسے منایا۔ بلکہ خیر القرون کے کئی سو سال کے بعد اس کی ایجاد ہوئی تو یہ کام نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق ''بدعت'' ہی قرار پائے گا۔ اب آپ خود سوچ لیں کہ بدعت کا ارتکاب کر کے آپ ''ثواب'' کمار ہے ہیں یا اپنی تمام نیکیاں ہی برباد کر رہے ہیں؟

3 نبیٔ اکرم ﷺ کی وفات کے بارے میں اکثر اہل علم و اہل تاریخ کا قول ہے کہ 12 ربیع الاول کو ہوئی ہے۔ اسی لیے 12 ربیع الاول کا دن ''بارہ وفات'' کے نام سے مشہور چلا آرہا ہے، نیز آپ ﷺ کی تاریخ ولادت کے بارے میں اختلاف ہے۔ علمائے محققین نے تو 8 یا 9 ربیع الاول ہی کو آپ کا یوم ولادت صحیح بتلایا ہے۔ [2] تاہم بارہ ربیع الاول ہی کو آپ ﷺ کا یوم ولادت بھی تسلیم کر لیا جائے (جیسا کہ اس روز جشن ولادت منایا جاتا ہے) تو ظاہر ہے کہ یہی روز آپ ﷺ کی وفات کا بھی ہے۔ اس اعتبار سے ذرا سوچیے! کہ کیا نبیٔ اکرم ﷺ کی وفات والے دن ''جشن'' منانا صحیح ہے؟ اگر کوئی غیر مسلم آپ سے پوچھ بیٹھے کہ بھئی! یہ تم اپنے نبی کی وفات کا ''جشن'' منا رہے ہو یا ولادت کا؟ کیونکہ یہ تاریخ تو آپ کی وفات کی بھی ہے تو اس کا کیا معقول جواب ہمارے پاس ہے؟

[1] سنن النسائي، صلاة العيدين، باب كيف الخطبة، حديث: 1579. [2] ملاحظہ ہو مقالہ ''السيرة النبوية، توقيتي مطالعه'' (از پروفیسر ظفر احمد سابق صدر شعبۂ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ ایس ای کالج، بہاول پور۔ پنجاب۔) ص 219-223، شائع شدہ در رسالہ ششماہی ''السیرۃ، عالمی'' کراچی (شمارہ 14، اکتوبر 2005۔) اس مقالے میں نہایت تفصیل سے توقیتی حساب سے 12 ربیع الاول ہی کو یوم وفات اور 8 ربیع الاول کو یوم ولادت ثابت کیا گیا ہے۔

4 پھر خوشی یا ''جشن'' منانے کا یہ انداز، جس کا مظاہرہ 12 ربیع الاول کو کیا جاتا ہے، اسلام میں اس کی کوئی گنجائش بھی ہے؟ خوشی کے موقع پر جلوس نکالنا، چراغاں کرنا، لڈیاں، بھنگڑے اور دھمالیں ڈالنا، دین اسلام سے ان کا کوئی تعلق بھی ہے؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ اسلام نے ہمارے لیے دو عیدیں مقرر فرمائی ہیں۔ لیکن ان میں نماز پڑھنے اور تکبیر و تہلیل ہی کا حکم ہے۔ اس کے علاوہ کسی بات کا حکم نہیں۔ لیکن تیسری ''عید میلاد'' جو بنالی گئی ہے۔ اس میں تکبیر و تہلیل کے علاوہ سب کچھ کیا جاتا ہے بلکہ بڑے اہتمام سے کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ سارا انداز غیر اسلامی ہے جس کا دین اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ جس طرح اپنے اکابر کا ''یوم'' منانا ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ اسی طرح زیر بحث ''جشن میلاد'' منانے کا انداز بھی از اول تا آخر غیر اسلامی ہے۔ بلکہ کفار کی نقالی اور ان کی مشابہت ہے، حالانکہ ہمیں کفار کی مشابہت اختیار کرنے سے روکا گیا ہے۔ اور نبی ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»

''جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا، وہ انھی میں سے سمجھا جائے گا۔'' [1]

بہر حال جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے ''جشن میلاد'' کی کوئی شرعی و دینی حیثیت سمجھ میں نہیں آئے گی۔ یہ محبت رسول ﷺ کے عنوان پر ایسا کھوکھلا مظاہرۂ عقیدت ہے جس کی تائید نہ قرآن سے ہوتی ہے نہ حدیث سے، نہ صحابہ و تابعین کے کردار سے اور نہ ائمۂ دین کے اقوال و افعال سے۔

5 پھر سب سے زیادہ قابل غور بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز تو آپ کی ولادت نہیں رسالت ہے۔ یوم رسالت ہی سے مسلمانوں کو وہ توحید

[1] سنن أبي داود، اللباس، باب في لبس الشهرة، حديث:4031.

ملی جس سے گم گشتگانِ بادیۂ ضلالت محروم تھے۔ یہ دعوت توحید ہی کفار ومشرکین مکہ کے لیے سب سے زیادہ اچنبھے کی چیز تھی اور انھوں نے کہا:

﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ○﴾

''یہ تو سب معبودوں کو (ختم کرکے) ایک معبود ٹھہراتا ہے یہ تو بڑی ہی تعجب والی بات ہے۔''[1]

اس یوم رسالت ہی سے آپ ﷺ کی ذات مسلمانوں کے لیے واجب الاطاعت ٹھہری اور آپ کی اطاعت اور آپ کی تابعداری اللہ کی اطاعت اور اس کی محبت کا معیار قرار پائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''[2] اور

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ﴾

''کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری پیروی کرو تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے اور وہ تمھارے گناہ بھی معاف فرمادے گا۔''[3]

اس یوم رسالت ہی سے مسلمانوں کو ایمان و اخلاق کی وہ دولت لازوال حاصل ہوئی جس کی برکت سے مسلمان عرب وعجم پر چھا گئے۔ ایران وروما جیسی عظیم الشان حکومتوں کو روند ڈالا اور دنیا کے خزانے ان کے قدموں میں ڈھیر ہو گئے۔

یہ برکت اور شان، یہ اعجاز اور تاثیر کس کی تھی؟ محمد بن عبداللہ کی نہیں۔ محمد رسول اللہ کی تھی۔ ﷺ۔ محمد بن عبداللہ کو تو کفار مکہ بھی مانتے تھے، ان کے اخلاق کے معترف

[1] صٓ 38:5. [2] النسآء 4:80. [3] اٰل عمرٰن 3:31.

اور راست بازی کے بھی قائل تھے۔ لیکن 40 سالہ محمد بن عبداللہ جب محمد رسول اللہ ﷺ بنے اور دعوت توحید دی تو مشرکین مکہ جو پہلے ان کی راہوں میں دیدہ و دل بچھایا کرتے تھے، انھوں نے کانٹے بچھانے شروع کر دیے، ان کو لہولہان کیا اور قدم قدم پر مزاحمت کی اور مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ ان کی محبت، مخالفت میں اور تعلق، دشمنی میں کیوں بدلا؟ کیا انھیں راست بازی سے کد تھی؟ اخلاقیات اسلام سے انکار تھا؟ یقیناً نہیں، یہ قدریں تو ان کے ہاں بھی معروف تھیں اور وہ رسول اللہ ﷺ کی عزت بھی اسی لیے کرتے تھے کہ آپ ﷺ ان انسانی قدروں کے حامل تھے۔

انھیں اختلاف ہوا تو اسی دعوت توحید سے، دعوت مساوات قانون سے اور محمد ﷺ کو بحیثیت رسول اللہ تسلیم کرنے سے۔ آج بھی اگر ہم صرف اپنے پیغمبر کے حسن اخلاق کی تعریف کریں۔ ان کے حسن سراپا کا نقشہ کھینچیں اور محمد بن عبداللہ کا یوم ولادت دھوم دھام سے منائیں۔ لیکن ان کی دعوت توحید سے اعراض و تغافل ہو۔ اور قبروں پر کفر و شرک کی گرم بازاری ہو اور محمد رسول اللہ کی حیثیت سے تو ہم ان کو تسلیم کرنے میں متأمل ہوں اور ان کی اس مسند پر ائمہ کو بٹھا دیں۔ ان کے علاوہ دوسروں کے اقوال و اجتہادات کو واجب الاطاعت سمجھیں تو ذرا غور کیجیے کہ ہم میں اور مشرکین مکہ میں پھر فرق کیا ہوا؟

اس لیے محترم! اصل چیز یوم ولادت دھوم دھام سے منانا نہیں، آپ ﷺ کے پیغام توحید پر ایمان لانا ہے، کفر و شرک کو مٹانا ہے، آپ کی ان تعلیمات کو اپنانا ہے، جن کے اپنانے سے مسلمانوں کو عروج حاصل ہوا، قبروں کے لات و منات اور عزیٰ و ہبل کو توڑنا ہے اور عقیدت اور اطاعت کے ان محوروں کو تبدیل کرنا ہے جس نے مسلمانوں کو ایک مرکز رسالت سے ہٹا کر بیسیوں فرقوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اگر یہ

نہیں، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور ایمان وتوحید کے تقاضوں کو نہیں مانتا تو پھر محمد بن عبداللہ کی ''ولادت'' کا ''جشن'' ایک فریب نفس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

''سیرت گوئی'' سے زیادہ ''سیرت سازی'' کی ضرورت

مرکزی وزارت مذہبی امور کے تحت اسلام آباد میں اور محکمۂ اوقاف کے تحت صوبوں میں کئی سال سے ربیع الاول کے مہینے میں سالانہ سیرت کانفرنسیں بڑے تزک واحتشام سے ہورہی ہیں، ان کانفرنسوں میں ملک کے ممتاز رہنما، علماء وفضلاء اور مفکرین واہل قلم شرکت کرتے ہیں۔ جن کی آمدورفت اور مہمان نوازی پر لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا ہے۔

بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت مقدسہ پوری دنیا کے لیے ایک بہترین اور بے مثال نمونہ ہے۔ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [1]

نبی ﷺ نے آکر فی الواقع صنم کدۂ عرب میں توحید کا علم بلند فرمایا۔ شرک وکفر کے ظلمات سے نکال کر لوگوں کے دلوں کو توحید و ہدایت ربانی کے نور سے منور کیا۔ اخلاق باختہ لوگوں کو بااخلاق بلکہ معلم اخلاق بنایا، آپس کے بغض وعناد کو دور کرکے ان میں محبت والفت پیدا کی۔ بتان رنگ ونسل کو توڑ کر پوری امت مسلمہ کو یک قالب بنایا اور تمیز ما وتو کو مٹایا، غرض محمد عربی نبی ﷺ نے سسکتی ہوئی انسانیت کو سہارا دیا اور اسے مشرکانہ عقائد وتوہمات اور اخلاق رزیلہ کی دلدل سے نکال کر توحید اور اخلاق عالیہ کی صراط مستقیم پر گامزن فرمایا۔

[1] الأحزاب 21:33.

مسلمانوں کے لیے اپنے عظیم الشان پیغمبر ﷺ کا یہ بے مثال کارنامہ جس کی نظیر تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی، انتہائی قابل فخر ہے۔ لیکن (قطع نظر بعض دوسری اہم باتوں کے) اس سلسلے میں اصل سوال یہ ہے نبیٔ کریم ﷺ کا یہ انسانیت ساز کردار اس لائق ہے کہ سب مسلمان اس کو اپنائیں اور اس کو اختیار کریں؟ یا اس کی حیثیت صرف یہ ہے کہ سال بہ سال آپ ﷺ کی ولادت کے موقع پر آپ کے ان محاسن و تعلیمات کا زبانی اظہار کر کے عقیدت و تحسین کے چند پھول آپ کی ذات گرامی کو پیش کر دیے جائیں اور بس...... اگر آپ کی سیرت صرف موضوعِ گفتار ہی ہے تو پھر ہم میں اور غیر مسلموں میں کیا فرق رہا؟ گفتار کی حد تک تو غیر مسلم بھی آپ ﷺ کی خدمت میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور ان کارناموں کو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں جو جلسہ ہائے سیرت میں بیان کیے جاتے ہیں۔

اور اگر آپ ﷺ کی سیرت اس لائق ہے کہ اس سے صرف زبان و بیان کی محفلوں کو ہی سجانے کا کام نہ لیا جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عملاً وہ سیرت و کردار بھی اپنایا جائے جن سے آپ نے دنیائے انسانیت کو روشناس کیا تو ہمیں بتلایا جائے کہ پھر آخر ہماری سرگرمیاں جلسہ و جلوس تک ہی محدود ہو کر کیوں رہ گئی ہیں! ہم نبیٔ اکرم ﷺ کی تعلیمات کو اپنانے کے لیے کیوں تیار نہیں ہوتے؟ اور جس حساب سے زبانی عقیدت کا جوش و خروش ظاہر کیا جا رہا ہے اسی حساب سے ہمارا عمل و کردار پست تر کیوں ہوتا جا رہا ہے، اسی حساب سے ہمارے دلوں کی دنیا کیوں تاریک تر ہوتی جا رہی ہے؟ آپ ﷺ کے محاسن و فضائل کی گونج سے ہمارے اپنے ہی کان کیوں بے بہرہ ہیں؟ اور آپ ﷺ کی سیرت و کردار کی اس روشنی سے جس سے سارا عالم بقعۂ نور بنا، ہماری اپنی ہی آنکھیں کیوں محروم ہیں؟ بہر حال ہمارا مقصد اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اصل

چیز عمل ہے، اس کے بغیر محض زبانی عقیدت و محبت کا اظہار کوئی چیز نہیں۔

تَعْصِي الْإِلٰهَ وَأَنْتَ تَزْعُمُ حُبَّهٗ   هٰذَا مَحَالٌ، فِي الْقِيَاسِ بَدِيعُ

لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَأَطَعْتَهٗ   إِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُّحِبُّ مُطِيعُ [1]

کیا محض سیرت کانفرنسوں کا انعقاد اور مروجہ رسومات کا اہتمام ہی کافی ہے؟

ربیع الاول میں ''عقیدت و محبت'' کے عنوان سے جو کچھ کیا جاتا ہے، جیسے جلوس نکالا جاتا ہے جس میں دنیا بھر کی بے ہودگیاں روا رکھی جاتی ہیں، چمٹے بجائے جاتے ہیں، فلمی دھنوں پر نعتیں پڑھی جاتی ہیں، بھنگڑا ڈالا جاتا ہے اور ڈھولک کی تھاپ پر رقص کیا جاتا ہے، بھلا ان چیزوں کا اسلام سے کیا تعلق؟ اسلام نے تو ان سب چیزوں کو مٹایا تھا۔ اب پھر پیغمبر اسلام ﷺ کے نام پر ہی ان خرافات کا احیا کس قدر شوخ چشمانہ جسارت ہے۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ حکومت جس کا دعویٰ ہے کہ اسلام اس کا دین ہے، ان ایجاد بندہ رسومات کا سد باب کرتی، اس لیے کہ اسلام کی ابتدائی چھ صدیوں میں یوم میلاد النبی ﷺ کو کوئی حیثیت نہیں دی گئی نہ کوئی مولود کو جانتا تھا، نہ کوئی اس کو پڑھتا تھا نہ ''مناتا'' تھا۔ عہد نبوی، عہد صحابہ و تابعین حتی کہ چاروں مذہبوں کے امام اور ان کے تلامذہ سے کوئی اس کی اصل نہیں ملتی اور دین کے نام پر کیے گئے ایسے نئے کام اسلام میں بدعت کہلاتے ہیں۔ ہر اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ ایسی بدعات کا قلع قمع کرے لیکن افسوس کہ ہماری حکومتوں کے طرز عمل سے ان ''رسومات'' کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔

وزارت مذہبی امور اور محکمۂ اوقاف کی طرف سے جو سیرت کانفرنسیں مسلسل کئی

[1] زاد المعاد: 4/194.

سال سے ہمارے ملک میں ہورہی ہیں۔ بیان سیرت کی حد تک تو یہ ٹھیک ہے اور مقصد اور جذبہ اگر صحیح ہے تو اس کے کار خیر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ لیکن ایک تو مولود مروج کے موقع پر ان کا انعقاد محل نظر ہے کیونکہ اس طرح ان کا تعلق ان ہی بدعات سے جڑ جاتا ہے جن کا ذکر ہم نے گزشتہ سطور میں کیا ہے۔ یہ کسی اور مہینے میں رکھی جائیں تو بہتر ہے تاکہ برخود غلط لوگوں نے ''جشن ولادت'' کے عنوان سے جو غیر شرعی رسمیں ایجاد کرلی ہیں، ان سیرت کانفرنسوں سے ان کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔

دوسرے، حکومت کے پاس ہر طرح کے وسائل موجود ہیں اور وہ نبی ﷺ کی سیرت کے پہلوؤں کو عملاً اجاگر کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے۔ وہ صرف سیرت کانفرنسوں کے انعقاد سے اپنے منصبی فرائض کی ادائیگی سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی تاآنکہ وہ عملی اقدامات بھی بروئے کار نہ لائے۔

اس لیے ہم وزارت مذہبی امور، محکمۂ اوقاف اور حکومت کے دیگر اہم ذمے داروں سے عرض کریں گے کہ نبی ﷺ سے جذباتی وابستگی کے مظاہرے سے کچھ بلند ہوکر سیرت نبوی کو عملاً اپنانے کی شدید ضرورت ہے۔ ہمارا ملک اخلاقی زوال کی انتہا کو پہنچ چکا ہے، قبر پرستی کی صورت میں کاروبارِ لات ومنات عروج پر ہے، رنگ ونسل اور زبان کے وہ بت، جن کو پیغمبر اسلام ﷺ نے پاش پاش کردیا تھا، ہم نے نہ صرف اپنے حریم دل کے طاقوں میں سجا لیے ہیں بلکہ ان کی پرستش بھی کررہے ہیں، جس کا مظاہرہ سندھ کے علاقوں اور کراچی وغیرہ میں سالہاسال سے ہورہا ہے اور جس کا سلسلہ وقفے وقفے سے تاحال جاری ہے۔

ان حالات میں یہ بانگ دہل مجمع لگا کر لوگوں کو یہ سنانا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ نے یہ یہ کارنامے انجام دیے۔ جبکہ خود ہماری اپنی زندگی کا ایک ایک عمل، ایک ایک ادا اور

ایک ایک حرکت پیغمبر اسلام کے کارناموں پر خط تنسخ پھیر رہی ہو، کون سا دانش مندانہ فعل ہے؟ اور یہ عقل وفہم کا کون سا صحیح استعمال ہے کہ نسخۂ کیمیا بھی موجود ہو اور مریض جاں بلب بھی سامنے پڑا کراہ رہا ہو لیکن ہم اس نسخۂ کیمیا سے جاں بلب مریض کا علاج کرنے کی بجائے اس امر کا اہتمام کریں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا اجتماع کرکے ہم ان کے سامنے اس نسخۂ کیمیا کے وہ اثرات ونتائج اور فوائد بیان کریں جو آج سے چودہ سو سال پہلے جاں بلب قوم کو اس کے استعمال سے حاصل ہوئے تھے۔

ہماری اس حرکت سے دنیا یا تو ہمیں ہی احمق تصور کرے گی یا پھر ان کارناموں کو ہی داستان طرازی سمجھے گی جو ہم نبی ﷺ کی سیرت کے ضمن میں بیان کرتے ہیں اور جو سیرت کانفرنسوں کا خاص موضوع ہوتے ہیں۔ بہرحال اخلاقی انحطاط سے دوچار قوم کو سیرت گوئی کی نہیں، سیرت سازی کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں اگر کچھ کرسکتے یا کرنے کا عزم رکھتے ہیں تو سیرت سازی کا یہ کام کریئے!

اگر یہ نہیں تو پھر کچھ نہیں بابا

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ﴾

”(اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ معاف کردے گا۔“ [1]

میلاد النبی۔ شبہات کا ازالہ

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ، صحابہ، تابعین اور مشہور ائمہ کے عہد میں میلاد النبی کی محفلیں منعقد کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن ان کے جواز کے لیے نبی کریم ﷺ

[1] آل عمرٰن 31:3.

اور صحابہ کے بعض اقوال اور افعال سے استدلال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں ان شبہات کا ازالہ درج ذیل ہے:

1 جب نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہودی عاشورا کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ آپ نے ان سے پوچھا تو وہ کہنے لگے: اس دن اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی تھی۔ ہم شکرانے کے طور پر روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَأَنَا أَحَقُّ بِمُوسٰى مِنْكُمْ، فَصَامَهُ وَأَمَرَ بِصِيَامِهِ»

''میں تمھاری نسبت موسیٰ علیہ السلام کا زیادہ حق دار ہوں۔ آپ ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو رکھنے کا حکم دیا۔''[1]

ازالہ: نبی کریم ﷺ نے صرف یہودیوں کو دیکھ کر یہ روزہ شروع نہیں کیا تھا بلکہ مکہ میں بھی آپ عاشورا کا روزہ رکھتے تھے اور دوسروں کو رکھنے کا حکم دیتے تھے۔ جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو آپ نے اسے لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«كَانَ يَوْمُ عَاشُورَاءَ تَصُومُهُ قُرَيْشٌ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَصُومُهُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، فَلَمَّا قَدِمَ الْمَدِينَةَ صَامَهُ وَأَمَرَ بِصِيَامِهِ، فَلَمَّا فُرِضَ رَمَضَانُ تَرَكَ يَوْمَ عَاشُورَاءَ، فَمَنْ شَاءَ صَامَهُ وَمَنْ شَاءَ تَرَكَهُ»

''عاشورا کے دن قریش روزہ رکھا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ بھی بعثت سے

[1] صحيح البخاري، الصوم، باب صوم يوم عاشوراء، حديث:2004، وصحيح مسلم، الصيام، باب صوم يوم عاشوراء، حديث: 1130.

پہلے ہی سے اس دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ جب آپ مدینہ آئے۔ آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو آپ نے عاشورا کا روزہ ترک کر دیا۔ جو چاہے روزہ رکھے جو چاہے نہ رکھے۔"[1]

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

«هٰذَا يَوْمُ عَاشُورَاءَ وَلَمْ يَكْتُبِ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ صِيَامَهُ وَأَنَا صَائِمٌ، فَمَنْ شَاءَ فَلْيَصُمْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُفْطِرْ»

"یوم عاشورا کا روزہ اللہ نے تم پر فرض نہیں کیا۔ میں نے روزہ رکھا ہوا ہے۔ تم میں سے جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔"[2]

عاشورا کا روزہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی رکھا ہے اور دوسروں کو بھی رکھنے کی ترغیب دی ہے۔ اس کے برعکس عید میلاد نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منائی، نہ صحابہ نے منائی، نہ تابعین سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور نہ ائمۂ عظام ہی نے اس کا اہتمام کیا۔ اسے ایک مسنون عمل پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر دین میں نئے امور ایجاد کرنے سے منع فرمایا ہے، سیدنا عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِيَّاكُمْ وَالْأُمُورَ الْمُحْدَثَاتِ، فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»

"نئے نئے کام ایجاد کرنے سے بچنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔"[3]

[1] صحيح البخاري، الصوم، باب صوم يوم عاشوراء، حديث: 2002، وصحيح مسلم، الصيام، باب صوم يوم عاشوراء، حديث: 1125. [2] صحيح البخاري، الصوم، باب صوم يوم عاشوراء، حديث: 2003، وصحيح مسلم، الصيام، باب صوم يوم عاشوراء، حديث: 1129. [3] سنن ابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين، حديث: 42.

اور بہت سی دوسری احادیث ہیں جن کا ذکر مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

2 عید میلاد النبی کے لیے اس حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ سے پیر کے روزے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«ذَاكَ يَوْمٌ وُلِدْتُّ فِيهِ، وَيَوْمٌ بُعِثْتُ فِيهِ»

''اس دن میری پیدائش ہوئی اور اسی دن مجھے نبوت عطا کی گئی۔''[1]

آپ اپنے یوم پیدائش کی تعظیم کیا کرتے تھے اور اپنی پیدائش کی خوشی میں روزہ رکھا کرتے تھے۔

ازالہ: رسول اللہ ﷺ صرف پیر کو روزہ نہیں رکھا کرتے تھے بلکہ پیر اور جمعرات کا روزہ رکھا کرتے تھے اور اس کی وجہ آپ نے یہ بتائی:

«تُعْرَضُ الْأَعْمَالُ يَوْمَ الِاثْنَيْنِ وَالْخَمِيسِ، فَأُحِبُّ أَنْ يُّعْرَضَ عَمَلِي وَأَنَا صَائِمٌ»

''پیر اور جمعرات کو اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ مجھے یہ بات پسند ہے، جب میرے اعمال پیش ہوں تو میں روزے کی حالت میں ہوں۔''[2]

رسول اللہ ﷺ ہر پیر کو روزہ رکھا کرتے تھے نہ کہ صرف بارہ ربیع الاول کو۔

اس حدیث سے تو محض اس قدر ہی استدلال ہوسکتا ہے کہ اس دن روزہ رکھا جائے، باقی سرگرمیوں کا جواز کہاں سے نکل سکتا ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ واضح طور پر ارشاد فرماتا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

[1] صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صيام ثلاثة......، حديث: 1162. [2] جامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء في صوم يوم الاثنين والخميس، حديث: 747.

''اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور تم اللہ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[1]

مزید ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾

''اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے وہ لے لو اور جس سے منع کرے اسے چھوڑ دو۔''[2]

دلچسپ بات یہ ہے کہ استدلال تو نبیٔ کریم ﷺ کے روزہ رکھنے سے کیا جاتا ہے، لیکن اس دن روزہ بالکل نہیں رکھا جاتا، بلکہ بہت سے افراد نے لکھا ہے کہ اس دن روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

ابن عباد اور ابن عاشر نے اس دن روزہ رکھنے سے منع کیا ہے۔ شیخ ابوعبداللہ محمد بن محمد بن عبدالرحمٰن طرابلسی اپنی کتاب ''مواہب الجلیل شرح مختصر خلیل'' میں لکھتے ہیں، شیخ زروق ''شرح القرطبیہ'' میں بیان کرتے ہیں:

«إِنَّهٗ مِنْ أَعْيَادِ الْمُسْلِمِينَ فَيَنْبَغِي أَنْ لَّا يُصَامَ فِيهِ»

''یہ دن مسلمانوں کی عیدوں میں سے ہے، اس دن روزہ رکھنا مناسب نہیں ہے۔''[3]

شیخ احمد بن خالد الناصری اپنی کتاب ''الاستقصاء لأخبار دول المغرب الأقصی'' (کی جلد دوم صفحہ: 144) میں لکھتے ہیں کہ میں ساحل سمندر کی طرف گیا۔ مجھے ابن عاشر اور ان کے مرید ملے جو کھانے پینے میں مشغول تھے۔ انھوں نے مجھے بھی کھانے

[1] الحجرات 1:49. [2] الحشر 7:59. [3] القول الفصل في حكم الاحتفال بمولد خير الرسل، ص:631.

میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ میں نے بتایا کہ میں نے روزہ رکھا ہوا ہے، انھوں نے ناپسندیدہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا:

«هٰذَا يَوْمُ فَرَحٍ وَّ سُرُورٍ يُسْتَقْبَحُ فِي مِثْلِهِ الصَّوْمُ كَالْعِيدِ»

''یہ خوشی اور لطف اندوز ہونے کا دن ہے۔عید کی طرح اس دن بھی روزہ رکھنا انتہائی بری بات ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے تو سات دنوں کو مسلمانوں کے لیے عید قرار دیا ہے:

❁ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے اور ان لوگوں کے ہاں دو دن مقرر تھے، ان میں وہ کھیل کود کیا کرتے تھے۔ آپ نے پوچھا: ''یہ دو دن کیا ہیں؟'' انھوں نے کہا: ہم دورِ جاہلیت میں ان دنوں میں کھیلتے کودتے تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَبْدَلَكُمْ بِهِمَا خَيْرًا مِنْهُمَا: يَوْمَ الْأَضْحٰى، وَيَوْمَ الْفِطْرِ»

''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان کے بدلے ان سے اچھے دن دیے ہیں۔ أضحی (قربانی) اور فطر کا دن۔''[2]

❁ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَوْمُ عَرَفَةَ وَيَوْمُ النَّحْرِ وَأَيَّامُ التَّشْرِيقِ عِيدُنَا، أَهْلَ الْإِسْلَامِ، وَهِيَ أَيَّامُ أَكْلٍ وَشُرْبٍ»

[1] القول الفصل في حكم الاحتفال بمولد الرسل، ص: 633. [2] سنن أبي داود، الصلاة، باب صلاة العيدين، حديث: 1134.

”عرفہ (9 ذوالحجہ)، نحر (الاضحیٰ) اور ایام تشریق (عید الاضحیٰ کے بعد والے تین دن) ہم اہل اسلام کے لیے عید کے دن ہیں۔“[1]

❁ اسی طرح جمعہ کے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ يَوْمُ عِيدٍ، فَلَا تَجْعَلُوا يَوْمَ عِيدِكُمْ يَوْمَ صِيَامِكُمْ إِلَّا أَنْ تَصُومُوا قَبْلَهُ أَوْ بَعْدَهُ»

”بے شک جمعے کا دن عید کا دن ہے، اپنے اس عید کے دن روزہ نہ رکھو مگر یہ کہ اس سے ایک دن پہلے یا بعد میں روزہ رکھو۔“[2]

رسول اللہ ﷺ نے تو انھی سات دنوں کو عید قرار دیا ہے۔ اب عید کا آٹھواں دن کہاں سے آ گیا؟ اللہ تعالیٰ تو واضح انداز میں اعلان فرماتا ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾

”آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا۔“[3]

دین کی تکمیل کے بعد اس میں اپنی طرف سے اضافہ بدعت ہی ہے چاہے اس پر کیسی ہی ملمع سازی کی گئی ہو۔

3 یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی پیدائش پر خوشی منانا تو قرآن کی رو سے مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ﴾

[1] جامع الترمذي، الصوم، باب ما جاء في كراهية صوم......، حديث: 773. [2] مسند أحمد: 303/2. [3] المآئدة 3:5.

''کہہ دیجیے! کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے خوش ہو جاؤ۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے رحمت سے خوش ہونے کا حکم دیا ہے، نبی کریم ﷺ سب سے بڑی رحمت ہیں تو ہم کیوں اس پر خوش نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''اور ہم نے آپ کو سب جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''[2]

ازالہ: سورۂ یونس کی آیت کو پیچھے والی آیت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں رحمت سے کیا مراد ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝﴾

''اے لوگو! یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے (قرآن کی) نصیحت آ گئی ہے اور (یہ) شفا ہے ان (بیماریوں) کے لیے جو سینوں میں ہیں اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے! (یہ) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے، لہٰذا (لوگوں کو) چاہیے کہ وہ اسی کے ساتھ خوش ہوں، یہ ان چیزوں سے بہت بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''[3]

ان آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رحمت سے مراد قرآن مجید ہے۔ صحابۂ کرام بھی اس سے قرآن اور اسلام ہی مراد لیتے تھے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ابوسعید خدری اور ابن عباس رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں:

[1] یونس 10:58. [2] الأنبیآء 21:107. [3] یونس 10:57,58.

«فَضْلُ اللّٰهِ: الْقُرْآنُ، وَرَحْمَتُهُ: الْإِسْلَامُ»

"اللہ کا فضل قرآن اور اس کی رحمت اسلام ہے۔"

اسی طرح حسن بصری، ضحاک، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ کہتے ہیں:

«فَضْلُ اللّٰهِ: الْإِيمَانُ، وَرَحْمَتُهُ: الْقُرْآنُ»

"اللہ کا فضل ایمان اور اس کی رحمت قرآن ہے۔"[1]

اسی طرح امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے قرآن مجید ہی کی دوسری آیات سے ثابت کیا ہے کہ قرآن ہی کو اللہ نے لوگوں کے لیے اپنی رحمت قرار دیا ہے۔[2]

4 اسی طرح مندرجہ ذیل حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَقَّ عَنْ نَفْسِهِ بَعْدَ النُّبُوَّةِ»

"نبی ﷺ نے نبوت کے بعد اپنا عقیقہ کیا۔"[3]

نبیٔ کریم ﷺ کا عقیقہ آپ کے دادا عبدالمطلب نے ساتویں دن کیا تھا۔ عقیقہ دوسری مرتبہ نہیں کیا جا سکتا۔ نبیٔ کریم ﷺ نے اپنی ولادت کی خوشی منانے اور امت کو تعلیم دینے کے لیے ایسا کیا۔ ہمیں بھی اس سنت پر عمل کرتے ہوئے اس عظیم نعمت کے شکرانے کے طور پر اجتماعات منعقد کرنے اور انواع و اقسام کے کھانوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

[1] الجامع لأحكام القرآن: 11,10/11. [2] تفسير ابن كثير: 553/2. [3] السنن الكبرىٰ للبيهقي، حديث: 19813، و مجمع الزوائد، حديث: 6203.

ازالہ: یہ حدیث ثابت ہی نہیں ہے۔

«قَالَ عَبْدُ الرَّزَّاقِ فِي مُصَنَّفِهِ...... أَنْبَأَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَرَّرٍ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَقَّ عَنْ نَّفْسِهِ بَعْدَ النُّبُوَّةِ»

امام ابن قیم اس حدیث کو عبدالرزاق کے حوالے سے بیان کرنے کے بعد عبدالرزاق کا یہ قول بیان کرتے ہیں:

«إِنَّمَا تَرَكُوا ابْنَ مُحَرَّرٍ بِهٰذَا الْحَدِيثِ»

''انھوں (محدثین) نے ابن محرر کو اس حدیث کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے۔''[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ حدیث ثابت نہیں۔''

بزار کہتے ہیں: اس حدیث کو بیان کرنے والا اکیلا عبداللہ بن محرر ہے اور وہ ضعیف ہے۔[2]

امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَأَمَّا الْحَدِيثُ الَّذِي ذَكَرَهُ فِي عَقِّ النَّبِيِّ ﷺ عَنْ نَّفْسِهِ فَرَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ بِإِسْنَادِهِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُحَرَّرٍ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ......الخ. هٰذَا حَدِيثٌ بَاطِلٌ وَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَرَّرٍ ضَعِيفٌ، مُتَّفَقٌ عَلٰى ضُعْفِهِ، قَالَ الْحُفَّاظُ: هُوَ مَتْرُوكٌ.

عقیقہ والی حدیث کو امام بیہقی عبداللہ بن محرر عن قتادہ عن انس سے بیان کرتے ہیں۔ یہ حدیث باطل ہے۔ عبداللہ بن محرر ضعیف ہے اور اس کے ضعف پر سب کا اتفاق ہے۔ حفاظ حدیث کہتے ہیں: ''یہ متروک ہے۔''[3]

[1] تحفة المودود، ص: 93. [2] فتح الباري: 737,736/9. [3] المجموع شرح المهذب: 12/8.

امام ذہبی کہتے ہیں: ''یہ متروک ہے اور ثقہ نہیں ہے۔''[1]

امام احمد کہتے ہیں: ''لوگوں نے اس کی حدیث کو ترک کر دیا ہے۔''

امام دارقطنی کہتے ہیں: ''یہ متروک ہے۔''

امام ابن حبان کہتے ہیں: ''یہ بغیر علم کے جھوٹ بولتا ہے اور اخبار کو بغیر سمجھے الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔''

امام ابن معین کہتے ہیں: ''یہ ثقہ نہیں ہے۔''

امام بخاری کہتے ہیں: ''منکر الحدیث ہے۔''[2]

5 ایک اشکال یہ پیش کیا جاتا ہے، مان لیتے ہیں عید میلاد النبی بدعت ہے نبیِ کریم ﷺ اور صحابہ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا لیکن یہ بدعت حسنہ ہے جیسا کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے تراویح کی جماعت شروع کروائی تو لوگوں کو باجماعت نماز تراویح ادا کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: «نِعْمَةِ الْبِدْعَةُ هٰذِهِ» ''یہ اچھی بدعت ہے۔'' یہی مثال عید میلاد النبی کی ہے۔

ازالہ: اس کا مفصل جواب کتاب کے مقدمہ میں گزر چکا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

6 اسی طرح ایک اشکال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے جواز پر متفق اور اس کے منانے کا اہتمام کرتی ہے اور حدیث میں آتا ہے:

«مَا رَآهُ الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ»

''جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے ہاں بھی اچھا ہی ہوتا ہے۔''[3]

ازالہ: اس کا مفصل جواب کتاب کے مقدمہ میں، ص: 95-103 میں گزر چکا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

[1] ميزان الاعتدال: 500/2. [2] الضعفاء الكبير: 309/2، وميزان الاعتدال: 500/2. [3] مسند أحمد: 379/1.

7 اسی طرح ایک اشکال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام میں جو اچھا کام رائج کرتا ہے اسے اس پر عمل کرنے والوں کے برابر ثواب ملتا رہتا ہے۔ حدیث میں ہے:

«مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً......الخ»

''جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کیا...... الخ''[1]

تو میلاد النبی بھی اچھا طریقہ ہے لہٰذا ہمیں اسے منانا چاہیے۔

ازالہ: اس کا مفصل جواب بھی کتاب کے مقدمہ میں گزر چکا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

خود ساختہ ثقافت کے حوالے سے جواز؟ کیا ''ثقافت'' دین و مذہب سے الگ چیز ہے؟
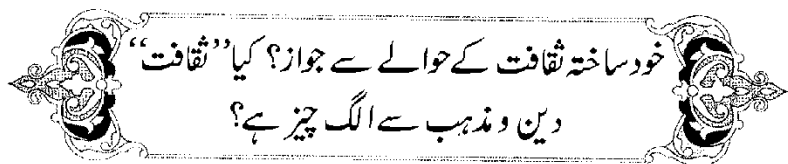
''میلاد'' کو دھوم دھام سے منانے کی ایک ''دلیل'' اب یہ بھی پیش کی جارہی ہے کہ اس کا تعلق دین ومذہب سے نہیں بلکہ ثقافت سے ہے۔ پہلے لوگوں کا رہن سہن، معاشرت سادہ تھی، لوگوں کے مکان تنگ اور چھوٹے ہوتے تھے، لباس اور بودوباش اور خوراک وغیرہ سب سادہ تھی۔ اب اس کے برعکس عالیشان رہائشیں ہیں، پوشاکیں اور خوراکیں بھی پرتکلف ہیں حتی کہ مساجد بھی پختہ ہی نہیں، نہایت عالی شان اور زرنگار ہیں۔ اسی طرح میلاد کے جشن میں جو یہ دھوم دھام اور اسرافِ بے جا کی صورتیں ہیں یا جلوس اور اس قسم کے دیگر مظاہر ہیں، ان کا تعلق بھی ثقافت سے ہے، اس لیے جس طرح ثقافت کے دیگر مظاہر کو ''بدعت'' نہیں کہا جاتا، میلاد کے ان خود ساختہ مظاہروں کو بھی ''بدعت'' قرار نہیں دیا جاسکتا۔

[1] صحیح مسلم، العلم، باب من سن ......، حدیث: 1017، بعد الحدیث، 2673.

سبحان اللہ! یہ ''دلیل'' بھی خوب ہے۔ گویا علاقائی طور اطوار بھی، جس کو ثقافت کا نام دیا گیا ہے، اب ''شرعی دلیل'' بن گئے ہیں۔ اس اعتبار سے بعض علاقوں میں جو ''ونی'' یا کاروکاری کی رسمیں ہیں جن کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جاتا رہتا ہے، وہ بھی علاقائی ثقافت کے نام پر جائز ہی ہونی چاہئیں؟ مختلف علاقوں میں جو اپنے اپنے علاقوں کے حساب سے مختلف قسم کے ''ڈانس'' رائج ہیں، جیسے ''خٹک ڈانس'' ''لُڈی'' ''بھنگڑا'' وغیرہ یہ بھی ثقافتی مظاہر ہیں، ان کو بھی دین و شریعت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، بس علاقائی ثقافت کی وجہ سے ان کا جواز تسلیم کر لینا چاہیے۔ اسی طرح ہماری شادی بیاہ کی بہت سی رسومات ہندوؤں کی نقالی یا اسلامی تہذیب سے نفرت و بیگانگی پر مبنی ہیں، جیسے مہندی کی رسم ہے، بینڈ باجوں کا رواج ہے، آتش بازی کا سلسلہ ہے، مردوں اور عورتوں کا بے باکانہ اختلاط اور ان کی ویڈیو فلم سازی ہے، عورتوں کا پردے سے یکسر بے نیاز ہوکر برسرِ عام اپنے حسن و جمال، اپنی آرائش و زیبائش اور اپنے لباس اور زیورات کی نمائش کرنا ہے، انواع و اقسام کے کھانوں کی صورت میں اسراف و تبذیر کا شیطانی سلسلہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب گویا ثقافتی مظاہر ہیں جو قابل نکیر نہیں بلکہ مذکورہ دلیل کی رو سے جائز قرار پائیں گے۔ سچ ہے:

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملاں
کار طفلاں تمام خواہد شد

اس لیے ہم عرض کریں گے کہ کسی ملک یا قوم کی ثقافت کوئی چیز نہیں، اصل چیز اس قوم کا مذہب اور نظریہ ہے، ہر چیز اس کے مذہبی نظریات کے تابع ہوتی ہے۔

ہندومت ایک مذہب ہے، اس کے ماننے والوں کی ہر چیز اس کے تابع ہے، وہ اپنے مردوں کو دفناتے نہیں، جلاتے ہیں، وہ اپنی لڑکیوں کو وراثت میں سے حصہ نہیں دیتے، بلکہ شادی کے موقع پر دان (جہیز) دیتے ہیں۔ وعلیٰ ھذا القیاس ان کی ثقافت کے اور مظاہر ہیں، وہ محض ثقافت نہیں، ان کے مذہب اور نظریۂ حیات کا حصہ ہیں۔

حیا باختگی مغربی ثقافت ہے جس کے بہت سے مظاہر ہیں، جیسے بے پردگی وعریانی، مردوزن کا بے باکانہ و بے حجابانہ اختلاط بلکہ برسرعام چوکوں اور سڑکوں پر بوس وکنار، شراب نوشی، جوڑوں کا باہم رقص وسرود، نکاح کے بغیر مردوزن کا باہم جنسی تعلق وغیرہ یہ ان کی اس ثقافت کا حصہ ہیں جو انھوں نے مذہب سے آزاد ہوکر اختیار کی ہے۔ اب یہی ان کا مذہب اور نظریۂ حیات ہے اور یہی ان کی ثقافت اور کلچر ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ آج کل جس کو ثقافت یا کلچر کہا جاتا ہے، وہ کسی قوم کے مذہبی تصورات اور نظریۂ حیات سے الگ نہیں ہوتا بلکہ اس کے نظریۂ حیات ہی کے اجزائے ترکیبی سے تشکیل پاتا ہے۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کی ثقافت ہرگز وہ نہیں ہوسکتی جس کے اجزائے ترکیبی اس کے اسلامی تصورات کے بجائے غیروں کے تصورات، یا غیروں کی نقالی ومشابہت پر مبنی یا اسلام کے بیان کردہ اصولوں سے متصادم ہوں۔

''میلاد'' کے اجزائے ترکیبی کا اسلام کے تصورات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے سب اجزاء غیروں کی نقالی اور مشابہت پر مبنی ہیں جن سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے، جیسے:

- ''یوم'' منانا
- چراغاں کرنا
- جلوس نکالنا
- بھنگڑے، لڈیاں ڈالنا

❀ اسراف وتبذیر اور ❀ افراط وغلو کا مظاہرہ

❀ تعین کے ساتھ صدقہ وخیرات کرنا۔

ان میں سے کوئی جز بھی اسلامی نہیں ہے، پھر اس کو اسلامی ثقافت یا مسلمانوں کی ثقافت کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ یا ثقافت کے نام پر غیروں کی اس نقالی کو کیوں کر جائز یا اجر وثواب کا باعث سمجھا جاسکتا ہے؟

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ پہلے معاشرت سادہ تھی، اب آسائشوں اور سہولتوں کی فراوانی ہے۔ لیکن ان کا تعلق تو مادی اسباب و وسائل سے ہے، پہلے یہ وسائل کم تھے، اب وسائل کی فراوانی ہے جس کی وجہ سے معاشرت میں سادگی کی بجائے آسائشوں کے استعمال میں زیادتی آگئی ہے اور ایسے حالات میں جب اللہ تعالیٰ اسباب و وسائل سے نوازے، شریعت اسلامیہ میں ان سے فیض یاب ہونے کی اجازت دی گئی ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی پر انعام واکرام فرمائے تو وہ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے اثرات بھی اس شخص میں نظر آئیں۔ [1]

اس اعتبار سے اگر کوئی شخص اللہ کے دیے ہوئے وسائل سے اچھا مکان بنا لیتا ہے، اچھی بودوباش اختیار کرتا ہے، اچھی خوراک استعمال کرتا ہے بشرطیکہ وہ اسراف اور تکبر سے بچتا ہے تو یہ نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ لیکن ان مادی اسباب و وسائل کو استعمال کرنے والا کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ سادہ مکان کی بجائے اچھا مکان بنا کر رہنے میں اجر وثواب زیادہ ہے، سادہ خوراک کی بجائے اچھی خوراک کی فضیلت زیادہ ہے، سادہ لباس کی بجائے بیش قیمت لباس پہننے کا اجر مجھے زیادہ ملے گا۔ وغیرہ۔

[1] جامع الترمذي، الأدب، باب ماجاء أن الله تعالى يحب أن يرى ......، حديث: 2819.

جب کہ ''جشن میلاد'' میں کروڑوں کے حساب سے جو بے مصرف پیسہ برباد کیا جاتا ہے، وہ ایک تو سراسر اسراف و تبذیر ہے جو قرآن کی رو سے اخوانِ شیاطین کا کام ہے، لیکن جواز کا فلسفہ تراشنے والے ''مفکرینِ اسلام'' کی طرف سے اس شیطانی کام کو اجر و ثواب اور نہایت فضیلت والا کام باور کرایا جاتا ہے۔ دوسرا، یہ غیر مسلموں کی نقالی ہے جو فرمانِ رسول کی رو سے سخت ناجائز اور حرام ہے۔ اسی طرح اس رسم کے دوسرے مظاہر ہیں، ان میں سے کسی کا بھی اسلامی نقطۂ نظر سے جواز نہیں ہے۔

علاوہ ازیں مسجد، مکان، خوراک وغیرہ یہ سب چیزیں تو ایسی ہیں جو عہد رسالت و عہد صحابہ میں سادگی کے ساتھ موجود تھیں، وسائل کی فراوانی سے یہی ہوا ہے کہ ان میں کچھ ترقی ہوگئی ہے۔ اگرچہ اس ترقی کو کوئی اجر و ثواب کا باعث قرار نہیں دیتا۔ لیکن ''میلاد'' کی رسم تو ایسی ہے کہ عہد رسالت و ادوارِ خیر القرون میں اس کا سرے سے کوئی نام و نشان ہی نہیں ملتا، اس کی دھوم دھام کو معاشرتی ترقی سے کس طرح جوڑا جاسکتا ہے؟ بہرحال جس اعتبار سے بھی اس رسم کا جائزہ لیا جائے، اس کو جواز یا استحسان کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ یہ سراسر اپنے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے ناجائز اور بدعت و منکر ہے۔ أعاذنا اللّٰہ منھا.

ملحوظہ: یہ ثقافت والی ''دلیل'' ڈاکٹر طاہر القادری کی ذہنی اُپج ہے جو قرآن کریم کی بیان کردہ حقیقت ﴿ وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِهِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ ...... ﴾ (الأنعام: 121:6) کی مصداق ہے۔

''جشن میلاد'' کے جواز میں پیش کیے جانے والے دیگر ''دلائل'' کی حقیقت جاننے کے لیے ملاحظہ ہو، ہماری کتاب ''جشنِ میلاد'' کی حقیقت اور مجوزین کے دلائل کا جائزہ۔''

چراغاں اور آتش بازی کا رواج اور اس کی حقیقت

چراغاں کا سلسلہ بھی آج کل عام اور روز افزوں ہے۔ پہلے پہل ہندوستان میں یہ شب برات کے موقع پر ہوتا تھا اور لوگ عام طور پر اپنے گھروں کی منڈیروں پر موم بتیاں یا تیل کے چھوٹے چھوٹے دیے جلا کر چراغاں کرتے تھے، پھر شبِ معراج میں بھی یہ کام کیا جانے لگا اور پھر بڑھتے بڑھتے یہ سلسلہ ''عید میلاد'' تک دراز ہوگیا، علاوہ ازیں یہ سلسلہ موم بتیوں اور تیل کے دیوں سے بڑھ کر بجلی کے بلبوں، ٹیوبوں اور قمقموں تک پہنچ گیا، نیز منڈیروں سے نکل کر سڑکوں، گلی کوچوں، چوراہوں اور بازاروں اور پوری پوری عمارتوں حتی کہ مسجدوں تک وسیع ہوگیا۔

اور ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ بجلی کے بلبوں اور قمقموں کے ذریعے سے جو زبردست چراغاں کیا جاتا ہے، وہ بیشتر چوری کی بجلی ہوتی ہے، یعنی براہ راست واپڈا کے بجلی کے تاروں سے کُنڈا لگا کر حاصل کی جاتی ہے۔ ان سے پوچھا جاسکتا ہے کہ حکومت نے اس چوری کی ان کو اجازت دی ہوئی ہے؟ اور اگر یہ اجازت نہیں ہے اور ہمارے خیال میں نہیں ہے تو کیا اس چوری کی بجلی سے چراغاں کر کے جشن منانے کا کوئی شرعی جواز ہے؟

اب ''میلاد'' کے موقع پر تو رنگ ونور کا یہ سیلاب کئی دنوں تک جاری رہتا ہے بلکہ انعامی مقابلے منعقد ہوتے ہیں اور جس علاقے کے گلی کوچوں یا بازار اور چوراہے کو یا نمایاں بڑی بڑی عمارتوں کو زیادہ سجایا یا برقایا (بجلی کے قمقموں سے آراستہ کیا) گیا ہوتا ہے، اسے انعام سے نوازا جاتا ہے، اس طرح آرائش وزیبائش اور ''چراغاں'' پر بلا مبالغہ

لاکھوں نہیں کروڑوں روپے چند دنوں میں خرچ کر دیے جاتے ہیں اور اگر دیگر اسلامی ملکوں کو بھی، جہاں یہ رسوماتِ بدعیہ اسی انداز سے ادا کی جاتی ہیں، شامل کر لیا جائے تو یہ رقم کروڑوں سے تجاوز کر کے اربوں تک پہنچ جاتی ہے۔

اسے عوام کی نظروں میں ایک کارِ خیر اور باعثِ اجر وثواب کام باور کرا دیا گیا ہے، تب ہی تو عوام اپنے خون پسینے کی کمائی اس طرح اس پر صرف کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، وہ اپنے پیغمبر کا اسوۂ حسنہ تو اپنانے اور اپنی زندگی کو اس سانچے میں ڈھالنے کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن جب وارثانِ منبرِ رسول کی طرف سے ان کے ذہنوں میں یہ راسخ کر دیا جائے کہ محبتِ رسول کا یہ طریقہ ہی نجات کے لیے کافی ہے تو پھر ان کے لیے کیا ضروری ہے کہ وہ اسوۂ حسنہ کو اپنا کر اپنے کاروبار کو صحیح کریں؟ اپنے اخلاق و کردار کی اصلاح کریں؟ اپنے معاملات اور معمولات کو درست کریں، اپنی زندگی کے رہن سہن اور طور اطوار کو صحیح کریں؟ کیا ان کے لیے یہ ''نعم البدل'' صحیح نہیں کہ وہ ان ساری ''کھکھیڑوں'' کی بجائے ''میلاد'' کے موقع پر چراغاں کر لیں یا جلوسِ میلاد میں شرکت کر لیں یا کروڑوں اور اربوں کے اس اسراف میں اپنا حصہ ڈال دیں اور پھر سارا سال اسوۂ حسنہ سے بے نیاز رہ کر من مانیاں کرتے رہیں۔

چنانچہ عوام نے اپنے مذہبی رہنماؤں کی شہ پر یہی ''نعم البدل'' مستقل طور پر اختیار کر لیا ہے اور وہ ''میلاد'' کے موقع پر نہایت ذوق و شوق سے اور بڑی وارفتگی سے چراغاں کرتے ہیں اور اس بے فائدہ کام پر کروڑوں اور اربوں روپے ہر سال برباد کر دیتے ہیں۔

لیکن آیئے! ذرا دیکھیے! کہ ''چراغاں'' کا بڑھتا ہوا یہ سلسلہ ''کارِ خیر'' ہے یا ''کارِ غیر'' ہے؟ یہ فرزندانِ توحید کا کام ہے یا اہل شرک کا امتیاز ہے؟

اس سلسلے میں ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کا اقتباس پیش کرنا بہتر سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"بدعتیں: ہندوستان کے اکثر شہروں میں لوگوں نے یہ رواج کر لیا ہے کہ پندرھویں شعبان کی رات کو اپنے گھر کی دیواروں پر چراغ جلاتے اور فخریہ روشنی کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی اچھی روشنی کی ہے جو دوسروں سے اچھی ہے اور ہم اتنے بڑے آدمی ہیں جو روشنی کرتے ہیں۔ فرداً فرداً اور اجتماعی حیثیت سے اس رات میں آتش بازی چھوڑتے اور دیگر کھیل کود کرتے ہیں۔ یہ وہ امور ہیں جن کی اصلیت احادیث کی معتبر کتابوں میں موجود نہیں ہے، اس کے علاوہ کسی غیر معتبر کتاب میں بھی ان امور کے مسنون و سنت ہونے کی کوئی ضعیف یا موضوع حدیث پائی نہیں جاتی۔

ممالکِ عربیہ میں سے حرمین شریفین اور غیر عربی ممالک کے کئی دوسرے شہروں میں (ہندوستان کے سوا) ان امور کا کوئی رواج نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے، عین ممکن یہ ہے بلکہ یقین واثق ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے دیگر رسوم انجام دینے کی طرح ہندی مسلمانوں نے اس رسم کی پیروی کی، جیسے ہندو، دیوالی کے تہوار پر اپنے گھروں کی دیواروں اور طاقوں میں دیے جلاتے ہیں اور ہندوستان کے ہندوؤں میں کفر کی وجہ سے بدعتی امور بکثرت رائج ہیں۔ چونکہ مسلمانوں کے ہندوؤں سے بڑے اختلاط رہے ہیں، ہندوؤں نے اپنی عورتوں کے ساتھ مسلمانوں کی شادیاں کیں، اسی اختلاطِ عام اور رہن سہن کے طریقے اختیار کرنے کے سبب سے مسلمانوں نے بھی روشنی

کرنے کی رسم ڈال لی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم بھی کسی سیٹھ ساہوکار سے کم نہیں، جس طرح وہ روشنی کرتے ہیں ویسی ہی بلکہ اس سے اچھی ہم کرتے ہیں۔

بعض متأخرین علماء کا بیان ہے کہ مخصوص راتوں میں بکثرت روشنی کرنا، بدعتِ شنیعہ (نکمی بدعت) ہے، اس لیے کہ ضرورت سے زیادہ روشنی کرنے کے مستحب ہونے کا شریعت میں کوئی حکم نہیں ہے۔

علی بن ابراہیم کا بیان ہے کہ چراغاں اور روشنی کرنے کی ابتدا برمکیوں نے کی ہے جو نسلاً و اعتقاداً آتش پرست تھے اور ظاہری اسلام لانے کے بعد بھی انھوں نے اپنے وہمی و خیالی امور کو اسلام میں جاری رکھنے کی حتی الامکان کوششیں کیں کیونکہ اعتقادی طور پر ان کو قدیم رواج کے درست ہونے کا یقین تھا، نیز اسلام میں قدیم رواج و رسوم کو باقی رکھنے میں ان کی مصلحت یہ تھی کہ اسلام کے پردے میں چراغ جلا کر اس کو سجدہ کرتے ہوئے آتش پرستی کی روح کو باقی رکھیں۔ اور طرہ یہ ہے کہ جاہل ائمۂ مساجد نے چراغ و روشنی اور نمازِ رغائب کی آڑ میں لوگوں کو جمع کرنے کا طریقہ بنالیا ہے تاکہ اپنی قیادت و سرداری جتا کر دولت سمیٹ سکیں، ساتھ ہی قصہ خوان مجالس میں خوب قصے بیان کرسکیں اور غریبوں سے روپے لیتے رہیں۔ اور حقیقت امر یہ ہے کہ ان تمام منکرات کے بُطلان و اِبطال کے لیے اللہ نے ائمۂ ہدیٰ پیدا کیے کہ منکرات ناپید ہوجائیں۔ ان ائمۂ ہدیٰ میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے دوسری صدی ہجری میں ممالک عرب و شام کے اندر منکرات کو اچھی طرح ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔

''تذکرہ'' میں علامہ طرطوسی نے لکھا ہے کہ ختم قرآن کی شب میں اجتماع، منبروں کا قیام، عورتوں اور مردوں کا میل جول اور کھیل کود وغیرہ میں باہمی اختلاط اور زمانۂ حال کے اعمال و کردارِ ناگفتہ بہ، یہ سب کے سب کام کوئی اصلیت نہیں رکھتے اور ان کے

جواز کی کوئی صورت نہیں۔''[1]

تقریباً یہی بات ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ (المتوفّٰی 1014ھ) نے بھی لکھی ہے، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

«وَأَوَّلُ حُدُوثِ الْوَقِيدِ مِنَ الْبَرَامَكَةِ وَكَانُوا عَبَدَةَ النَّارِ، فَلَمَّا أَسْلَمُوا أَدْخَلُوا فِي الْإِسْلَامِ، مَا يُمَوِّهُونَ أَنَّهُ مِنْ سُنَنِ الدِّينِ وَمَقْصُودُهُمْ عِبَادَةُ النِّيرَانِ حَيْثُ رَكَعُوا وَسَجَدُوا مَعَ الْمُسْلِمِينَ إِلٰى تِلْكَ النِّيرَانِ، وَلَمْ يَأْتِ فِي الشَّرْعِ اسْتِحْبَابُ زِيَادَةِ الْوَقِيدِ عَلَى الْحَاجَةِ فِي مَوْضِعٍ»

''سب سے پہلے جنھوں نے چراغاں کیا، وہ برامکہ تھے، یہ آگ کے پجاری تھے، جب یہ مسلمان ہوگئے تو انھوں نے آتش پرستی کی کئی چیزوں کو اسلام میں داخل کر کے یہ باور کرایا کہ یہ بھی دین اسلام کے طریقے ہیں اور مقصد ان کا آگ کی پوجا تھا کیونکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ان چراغوں کی طرف رکوع و سجود کرتے تھے۔ اور شریعت میں کسی بھی جگہ، ضرورت سے زیادہ روشنی کرنے کا استحباب وارد نہیں ہے......۔''[2]

برامکہ، یہ ایک مجوسی خاندان تھا، یہ خاندان پڑھا لکھا اور علم و فضل کا مالک تھا، جس کی وجہ سے اس خاندان کے بہت سے لوگوں کو عباسی خلفاء، (ہارون الرشید اور مامون و معتصم وغیرہ) کے درباروں میں خاص مقام حاصل تھا بلکہ بعض تو ان خلفاء کے وزیرو

[1] ماثبت بالسنة في أيام السنة کا اردو ترجمہ ''مومن کے ماہ و سال'' صفحہ: 177,176، مطبوعہ دارالاشاعت، کراچی، 1966ء۔ [2] مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، باب قيام شهر رمضان: 198/3، طبع مکتبہ امدادیہ، ملتان۔

مشیر بھی رہے۔ مذکورہ تاریخی حوالوں سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ قبولِ اسلام کے باوجود آتش پرستی کے جراثیم ان کے اندر موجود رہے اور ظلِ الٰہی کے سایۂ عاطفت میں رہنے کی وجہ سے ان کو مسلمانوں کے اندر اپنے مشرکانہ خیالات پھیلانے کے مواقع بھی میسر آ گئے، جن میں ایک مشرکانہ اور آتش پرستانہ رسم چراغاں اور آتش بازی ہے۔

پہلے پہل شبِ برات کے موقع پر ہی چراغاں بھی ہوتا تھا اور آتش بازی بھی، پھر چراغاں کا دائرہ تو بہت پھیل گیا اور ہر اہم موقع پر چراغاں کا اہتمام نہایت ضروری قرار پایا حتی کہ اب یہ شادیوں کا بھی ایک لازمی حصہ بن گیا ہے۔ لیکن آتش بازی ابھی تک زیادہ تر شبِ برات ہی کے ساتھ خاص ہے۔ اس رات کو جس شدت اور تسلسل کے ساتھ آتش بازی کی جاتی ہے، وہ الامان والحفیظ کی مصداق ہے، پھر شادیوں پر حکومت کی طرف سے پابندی سے پہلے شادی کے موقع پر بھی اس شیطانی رسم کا سلسلہ بڑا عام ہو گیا تھا۔ جس میں پابندی کے باوجود کوئی کمی نہیں ہوئی۔ هَدَاهُمُ اللّٰهُ تعالٰی.

بہر حال مذکورہ تفصیل سے واضح ہے کہ خوشی اور مسرت کے موقع پر کسی بھی انداز سے چراغاں یا آتش بازی کا اہتمام کرنا، آتش پرستی کا ایک حصہ ہے، اس لیے کسی بھی موقع پر ان چیزوں کا اہتمام کرنا سراسر حرام اور ناجائز ہے، وہ ''عیدِ میلاد'' کا موقع ہو یا شادی بیاہ کا یا کسی اور تقریبِ مسرت کا، کسی بھی موقع پر چراغاں یا آتش بازی کا جواز نہیں ہے۔

ربیع الثانی
فضائل و اعمال اور رسومات

ربیع الثانی

ربیع الثانی، اسے ربیع الآخر بھی کہا جاتا ہے، آخر اور ثانی، دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، یعنی دوسرا۔ اسلامی سال کے اس چوتھے مہینے کو ربیع الثانی اور ربیع الآخر کہتے ہیں۔

وجہ تسمیہ

ربیع کے معنی ہیں، موسم بہار۔ ربیع الاوّل اور ربیع الثانی یہ دونوں مہینے گویا بہار کے ہیں، اس لیے دونوں کو ربیع (الاوّل و الثانی) کہا جاتا ہے۔ پہلا اور دوسرا۔

فضائل

اس مہینے کی کوئی فضیلت قرآن و حدیث میں وارد نہیں۔

مسنون اعمال

اس مہینے کا کوئی مخصوص مسنون عمل احادیث میں بیان نہیں کیا گیا اور عربوں کا کوئی تصور اور رواج بھی منقول نہیں۔

رسوم و بدعات

اس مہینے کی گیارہ اور سترہ تاریخ کو ''گیارھویں شریف'' منانا۔ گیارھویں کا جلوس

نکالنا یا اس میں شرکت کرنا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے ایصال ثواب کے لیے دیگیں پکوا کر تقسیم کرنا اور ان کے نام کی نذر و نیاز دینا۔ بغداد کی طرف منہ کر کے ''صلاۃ غوثیہ'' پڑھنا اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی شان میں مبالغہ آرائی سے کام لینا اور ان سے دستگیری چاہنا۔ وغیرہ ہیں۔

''گیارھویں شریف'' کی حقیقت

یہ ''گیارھویں شریف'' کیا ہے؟ یہ پیر عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے نام کی ''نیاز'' ہے جو ربیع الثانی کی گیارھویں یا سترھویں تاریخ کو دی جاتی ہے۔ گیارہ یا سترہ تاریخ (بہ اختلاف مؤرخین) حضرت پیر جیلانی کی تاریخ وفات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نیاز ان کے یوم وفات پر ان کے ایصال ثواب کے لیے دی جاتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے، یہ ایک ایسا عمل ہے جو مشرکانہ عقیدے سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل پہلو قابل غور ہیں:

اولاً: یومِ وفات پر ایصالِ ثواب کے لیے دیگیں وغیرہ پکوا کر تقسیم کرنے کا اسلام میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ایصالِ ثواب کی نیت سے بلاشبہ صدقہ خیرات کرنا جائز ہے لیکن اس کے لیے کسی دن کی تعیین و تخصیص کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ تعیین غیر مسلموں کی نقالی ہے، انھی کے ہاں اپنے اکابر کا یومِ وفات اور یومِ ولادت منانے کا رواج ہے، اسی کی ایک شکل یوم وفات پر ایصالِ ثواب کرنے کی بھی ہے۔

ثانیاً: گیارھویں یا سترھویں شریف، ایصالِ ثواب کی شکل نہیں ہے بلکہ یہ دراصل پیر جیلانی کے نام کی نذر ہے جو ان کی خوشنودی حاصل کرنے اور ان کی ناراضی سے بچنے کے لیے دی جاتی ہے۔ گیارھویں دینے والے کا عقیدہ ہوتا ہے کہ میرے اس فعل سے

پیر صاحب خوش ہوں گے جس سے میرے کاروبار میں ترقی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ گیارھویں نہ دینے کی صورت میں اسے یہ خوف اور اندیشہ ہوتا ہے کہ اسے کاروبار میں نقصان ہوگا، اس کی بھینسوں کا دودھ خشک اور وہ ابتلا و آزمائش سے دوچار ہوجائے گا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی بابت گیارھویں دینے والے کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدائی صفات سے (نعوذ باللّٰہ) متصف ہیں۔ وہ دور اور نزدیک سے ہر ایک کی فریاد سننے اوراس کی حاجت روائی کرنے پر قادر ہیں، وہ کائنات میں تصرف کرنے کا اور نفع نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتے ہیں، وہ ہمارے دلوں کے رازوں اور کیفیات سے آگاہ ہیں، جب ہی تو یہ لوگ ان سے اسی طرح امداد طلب کرتے ہیں جس طرح اللہ سے کی جاتی ہے، اسی طرح ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں جیسے اللہ کو پکارا جاتا ہے، اسی طرح ان کو نافع و ضارّ سمجھتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ ہے، چنانچہ وہ ان کے نام کی صلاۃِ غوثیہ (بغداد کی طرف منہ کر کے) پڑھتے ہیں، جو صریحاً غیر اللہ کی عبادت ہے، ان کے نام کا حسبِ ذیل وظیفہ پڑھتے ہیں:

[یا شیخ عبدالقادر! شیئًا للّٰہ] ''اے عبدالقادر! اللہ کے لیے کچھ دیجیے۔'' ان سے استمداد و استغاثہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے:

امداد کن امداد کن از بندِ غم آزاد کن

در دین و دنیا شاد کن یا شیخ عبدالقادرا!

''امداد کر، امداد کر، غم کی قید سے آزاد کر، دین و دنیا میں خوش کر، اے شیخ عبدالقادر!''

ان کی بابت ایسی ایسی کرامات بیان کی جاتی ہیں جن سے یہی باور کرایا جاتا ہے کہ وہ کائنات میں ہر قسم کا تصرف کر سکتے ہیں اور اپنی مجلسوں اور وعظوں میں ان کے اندر اللہ تعالیٰ والی صفات کا اثبات کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ نظم دیکھیے جو اس فرقے کے سب سے اہم اور مستند رسالے میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں مشرکانہ عقیدے کا نہایت واشگاف الفاظ میں اظہار ہے۔ ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر ملاحظہ فرمائیے!

شیخ جیلانی میں خدائی صفات کے اثبات پر مبنی مشرکانہ نظم

خدا کے فضل سے ہم پر ہے سایہ غوثِ اعظم کا
ہمیں دونوں جہاں میں ہے سہارا غوثِ اعظم کا

ہماری لاج کس کے ہاتھ ہے، بغداد والے کے
بلائیں ٹال دینا کام کس کا، غوثِ اعظم کا

جہازِ تاجراں گرداب سے فوراً نکل آیا
وظیفہ جب انھوں نے پڑھ لیا یا غوثِ اعظم کا

گئے اِک وقت میں ستر مریدوں کے یہاں آقا
سمجھ میں آ نہیں سکتا معمہ غوثِ اعظم کا

شفا پاتے ہیں صدہا جاں بلب امراضِ مہلک سے
عجب دارالشفا ہے آستانہ غوثِ اعظم کا

بلادُ اللہ ملکی تحت حکمی سے یہ ظاہر ہے
کہ عالم میں ہر ایک شے پر ہے قبضہ غوثِ اعظم کا

فحکمی نافذ فی کلِّ حال سے ہوا ظاہر
تصرُّف انس و جن سب پر ہے آقا غوثِ اعظم کا

ہوا موقوف فورًا ہی برسنا اہلِ محفل پر
جو پایا ابرِ باراں نے اشارہ غوثِ اعظم کا

جو حق چاہے وہ یہ چاہیں، جو یہ چاہیں وہ حق چاہے
تو مٹ سکتا ہے پھر کس طرح چاہا غوثِ اعظم کا

فقیہوں کے دلوں سے دھویا ان کے سوالوں کو
دِلوں پر ہے بنی آدم کے قبضہ غوثِ اعظم کا

وہ کہہ کر قُم بِاذنِ اللہ جلا دیتے تھے مُردوں کو
بہت مشہور ہے احیائے موتیٰ غوثِ اعظم کا

فرشتے مدرسے تک ساتھ پہنچانے کو جاتے تھے
یہ دربارِ الٰہی میں ہے رُتبہ غوثِ اعظم کا

لُعاب اپنا چٹایا احمد مختار نے ان کو
تو پھر کیسے نہ ہوتا بول بالا غوثِ اعظم کا

رسول اللہ نے خلعت پہنایا برسر مجلس
بجے کیونکر نہ پھر عالم میں ڈنکا غوثِ اعظم کا

ہمارا ظاہر و باطن ہے ان کے آگے آئینہ
کسی شے سے نہیں عالم میں پردہ غوثِ اعظم کا[1]

نظم کا ایک ایک شعر ملاحظہ فرمالیجیے کہ کس فراخ دلی سے تمام خدائی صفات کا اثبات ایک فوت شدہ بزرگ کے حق میں کیا گیا ہے۔ فنعوذ باللّٰہ من هذه العقیدة الفاسدة.

گیارھویں دراصل پیر جیلانی کے نام کی نذر ہے جو ان کی عبادت ہے

اس سے صاف واضح ہے کہ گیارھویں کا مقصد ایصالِ ثواب قطعاً نہیں بلکہ یہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام کی نذر و نیاز ہے جس سے مقصود، اللہ تعالیٰ کی طرح، ان کو راضی کرنا اوران کے عتاب وغضب سے بچنا ہے۔ ایک اللہ والا توحید کا پرستار یہ کام صرف اللہ کے لیے کرتا ہے اور وہ اللہ ہی کے نام پر نذر و نیاز دیتا ہے کیونکہ نذرو نیاز بھی، نماز و زکاۃ وغیرہ کی طرح عبادت ہے جو صرف اللہ ہی کے لیے ہوسکتی ہے، کسی اور کے لیے نہیں، خود فقہ حنفی میں بھی اس کی صراحت موجود ہے، یعنی اس بات کی کہ نذر و نیاز عبادت ہے، اس لیے یہ کسی مخلوق کے لیے جائز نہیں۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو یہ کفر ہوگا۔ لیجیے! ملاحظہ فرمائیے:

«وَاعْلَمْ أَنَّ النَّذْرَالَّذِي يَقَعُ لِلْأَمْوَاتِ مِنْ أَكْثَرِ الْعَوَامِّ وَمَا يُؤْخَذُ مِنَ الدَّرَاهِمِ وَالشَّمْعِ وَالزَّيْتِ وَنَحْوِهَا إِلٰى ضَرَائِحِ الْأَوْلِيَاءِ

[1] ماہنامہ ''رضائے مصطفیٰ'' گوجرانوالہ، جلد:15، شمارہ:6، مئی:1973ء۔

الْكِرَامِ تَقَرُّبًا إِلَيْهِمْ فَهُوَ بِالْإِجْمَاعِ بَاطِلٌ وَحَرَامٌ»

''معلوم ہونا چاہیے کہ اکثر عوام، مردوں کے نام پر جو نذریں و نیازیں دیتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھاتے ہیں، اولیائے کرام کا تقرب حاصل کرنے کے لیے مالی نذرانے پیش کرتے ہیں اور ان کی قبروں پر چراغ اور تیل جلاتے ہیں وغیرہ، یہ سب چیزیں بالاجماع باطل اور حرام ہیں۔''

دُرِّ مختار کی مشہور شرح ردّ المحتار (المعروف فتاویٰ شامی) میں اس کی شرح یوں کی گئی ہے:

«قَوْلُهُ بَاطِلٌ وَّحَرَامٌ لِوُجُوهٍ مِّنْهَا: أَنَّهُ نَذْرٌ لِمَخْلُوقٍ، وَالنَّذْرُ لِلْمَخْلُوقِ لَا يَجُوزُ لِأَنَّهُ عِبَادَةٌ، وَالْعِبَادَةُ لَا تَكُونُ لِمَخْلُوقٍ. وَّ مِنْهَا: أَنَّ الْمَنْذُورَ لَهُ مَيِّتٌ، وَّالْمَيِّتُ لَا يَمْلِكُ. وَ مِنْهَا: أَنَّهُ إِنْ ظَنَّ أَنَّ الْمَيِّتَ يَتَصَرَّفُ فِي الْأُمُورِ دُونَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَاعْتِقَادُهُ ذٰلِكَ كُفْرٌ»[1]

یعنی ''اس نذر غیر اللہ کے باطل اور حرام ہونے کی کئی وجوہ ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

- یہ قبروں کے چڑھاوے وغیرہ مخلوق کے نام کی نذریں ہیں اور مخلوق کے نام کی نذر جائز ہی نہیں، اس لیے کہ (نذر بھی) عبادت ہے اور عبادت کسی مخلوق کی جائز نہیں۔
- اور ایک وجہ یہ ہے کہ منذور لہ (جس کے نام کی نذر دی جاتی ہے) مردہ ہے اور مردہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔

[1] رد المحتار: 431/2، طبع مصر 1966ء۔

❁ اور ایک وجہ یہ ہے کہ نذر دینے والا شخص مردوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کائنات میں تصرُّف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں، حالانکہ مردوں کے متعلق ایسا عقیدہ رکھنا بھی کفر ہے۔"

غیر اللہ کے نام کی نذر، ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کی مصداق ہے

فقہ حنفی کی اس صراحت کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ فوت شدہ بزرگوں کے نام پر جو نذر و نیاز دی جاتی ہے، یہ ایصالِ ثواب نہیں بلکہ ان کی عبادت ہے۔

علاوہ ازیں یہ نذر نیازیں ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾[1] کی مصداق ہیں، اس لیے حرام ہیں کیونکہ ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کا مطلب ہے کہ وہ جانور یا کوئی اور چیز جسے غیر اللہ کے نام پر پکارا جائے۔ اس سے مراد وہ جانور ہیں جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے جائیں، جیسے مشرکینِ عرب لات و عزّیٰ اور مناۃ و ہبل وغیرہ بتوں کے ناموں پر ذبح کرتے تھے۔ یا آگ کے نام پر مجوسی کرتے تھے۔ اور اسی میں وہ جانور بھی آجاتے ہیں جو جاہل مسلمان فوت شدہ بزرگوں کی عقیدت و محبت، ان کی خوشنودی و تقرب حاصل کرنے کے لیے یا ان سے ڈرتے اور امید رکھتے ہوئے، قبروں اور آستانوں پر ذبح کرتے ہیں یا مجاورین کو بزرگوں کی نیاز کے نام پر دے آتے ہیں (جیسے بہت سے بزرگوں کی قبروں پر بورڈ لگے ہوئے ہیں، مثلاً: "داتا" صاحب کی نیاز کے بکرے یہاں جمع کرائے جائیں) ان جانوروں کو، چاہے ذبح کے وقت اللہ ہی کا نام لے کر ذبح کیا جائے، یہ حرام ہی ہوں گے کیونکہ اس سے مقصود، رضائے الٰہی نہیں، رضائے اہل قبور اور تعظیم لغیر اللہ یا خوف یا رَجا عن غیر اللہ (غیر اللہ سے مافوق الاسباب طریقے سے ڈر یا امید) ہے، جو شرک ہے۔

[1] البقرۃ 173:2.

اسی طریقے سے جانوروں کے علاوہ جو اشیاء بھی غیر اللہ کے نام پر نذرونیاز اور چڑھاوے کی ہوں گی، حرام ہوں گی، جیسے قبروں پر لے جاکر یا وہاں سے خرید کر، قبور کے اردگرد فقراء ومساکین پر دیگوں اور لنگروں کی یا مٹھائی اور پیسوں وغیرہ کی تقسیم یا وہاں صندوقچی میں نذر و نیاز کے پیسے ڈالنا یا عرس کے موقع پر وہاں دودھ پہنچانا، یہ سب کام حرام اور ناجائز ہیں کیونکہ یہ سب غیر اللہ کی نذر و نیاز کی صورتیں ہیں اور نذر بھی نماز، روزہ وغیرہ عبادات کی طرح ایک عبادت ہے اور عبادت کی ہر قسم صرف ایک اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ اسی لیے حدیث میں ہے:

«مَلْعُونٌ مَّنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ»

’’جس نے غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کیا وہ ملعون ہے۔‘‘ [1]

تفسیر رازی میں ہے:

«قَالَ الْعُلَمَاءُ: لَوْ أَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَ ذَبِيحَةً يُّرِيدُ بِذِبْحِهَا التَّقَرُّبَ إِلٰى غَيْرِ اللّٰهِ، صَارَ مُرْتَدًّا وَ ذَبِيحَتُهُ ذَبِيحَةُ مُرْتَدٍّ»

’’علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کوئی جانور غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے ذبح کیا تو وہ مرتد ہو جائے گا اور اس کا ذبیحہ ایک مرتد کا ذبیحہ ہوگا۔‘‘ [2]

ایک مغالطے یا شبہے کا ازالہ

بعض لوگ کہتے، مغالطے میں ڈالتے یا شبہے میں مبتلا کرتے ہیں کہ ہم تو، بسم اللہ

[1] مسند أحمد: 217/1 و 317، و صحيح الجامع الصغير: 1024/2، حديث: 5891. [2] تفسير الرازي: 12/5.

واللہ أکبر، ہی کہہ کر جانور کو ذبح کرتے ہیں نہ کہ بزرگ کا نام لے کر، پھر وہ حرام کس طرح ہوگیا؟ بات دراصل جو سمجھنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ جو جانور غیر اللہ کے لیے نامزد کردیا جائے، اس کی مختلف صورتیں ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ غیر اللہ کے تقرب اور اس کی خوشنودی کے لیے اسے ذبح کیا جائے اور ذبح کرتے وقت نام بھی اسی بت یا بزرگ کا لیا جائے، بزعم خویش جس کو راضی کرنا مقصود ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مقصود تو غیر اللہ کا تقرب ہی ہو لیکن ذبح اللہ کے نام پر ہی کیا جائے جس طرح کہ قبر پرستوں میں یہ سلسلہ عام ہے۔ وہ جانوروں کو بزرگوں کے لیے نامزد تو کرتے ہیں، مثلاً: یہ بکرا فلاں پیر کا ہے، یہ گائے فلاں پیر کی ہے، یہ جانور گیارھویں کے لیے، یعنی شیخ عبدالقادر جیلانی کے لیے ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اوران کو وہ بسم اللہ پڑھ کر ہی ذبح کرتے ہیں، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ پہلی صورت تو یقیناً حرام ہے لیکن یہ دوسری صورت حرام نہیں بلکہ جائز ہے کیونکہ یہ غیر اللہ کے نام پر ذبح نہیں کیا گیا ہے اور یوں شرک کا راستہ کھول دیا گیا ہے، حالانکہ فقہاء نے اس دوسری صورت کو بھی حرام قرار دیا ہے، اس لیے کہ وہ بھی ﴿مَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ میں داخل ہے، چنانچہ حاشیہ بیضاوی میں ہے:

''ہر وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے، حرام ہے، اگرچہ ذبح کے وقت اس پر اللہ ہی کا نام لیا جائے، اس لیے کہ علماء کا اتفاق ہے کہ کوئی مسلمان اگر غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی غرض سے جانور ذبح کرے گا تو وہ مرتد ہوجائے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ ہوگا۔''

اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

”کسی حاکم اوراسی طرح کسی بڑے کی آمد پر (حسن خلق یا شرعی ضیافت کی نیت سے نہیں بلکہ اس کی رضامندی اوراس کی تعظیم کے طور پر) جانور ذبح کیا جائے تو وہ حرام ہوگا، اس لیے کہ وہ ﴿مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ میں داخل ہے اگرچہ اس پر اللہ ہی کا نام لیا گیا ہواور علامہ شامی نے اس کی تائید کی ہے۔“ [1]

البتہ بعض فقہاء اس دوسری صورت کو ﴿مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ کا مدلول اوراس میں داخل نہیں سمجھتے اور اشتراک علت (تقرب لغیر اللّٰہ) کی وجہ سے اسے حرام سمجھتے ہیں۔ گویا حرمت میں کوئی اختلاف نہیں۔ صرف استدلال واحتجاج کے طریقے میں اختلاف ہے۔

علاوہ ازیں یہ دوسری صورت ﴿مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ (جو بتوں کے پاس یا تھانوں پر ذبح کیے جائیں) میں بھی داخل ہے، جسے سورۂ مائدہ میں محرمات میں ذکر کیا گیا ہے اور احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آستانوں، درباروں اور تھانوں پر ذبح کیے گئے جانور حرام ہیں، اس لیے کہ وہاں ذبح کرنے کا یا وہاں لے جا کر تقسیم کرنے کا مقصد تقرب لغیر اللہ، اللہ کے سوا دوسروں کی رضا اور تقرب حاصل کرنا ہی ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے: ایک شخص نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ میں نے نذر مانی ہے کہ میں بوانہ جگہ میں اونٹ ذبح کروں گا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”کیا وہاں زمانۂ جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت تھا جس کی پرستش کی جاتی تھی؟“ لوگوں نے بتلایا: نہیں، پھر آپ نے پوچھا: ”وہاں ان کی عیدوں میں سے کوئی عید تو نہیں منائی جاتی تھی؟“ لوگوں نے اس کی بھی نفی کی تو آپ نے سائل کو نذر پوری کرنے کا حکم دیا۔“ [2]

[1] كتاب الذبائح، طبع قديم1277ھ، ص: 277، وفتاویٰ شامي: 203/5، مطبع ميمنية، مصر.
[2] سنن أبي داود، الأيمان والنذور، باب مايؤمر به من وفاء النذر، حديث: 3313.

اس سے معلوم ہوا کہ بتوں کے ہٹائے جانے کے بعد بھی غیر آباد آستانوں پر جا کر جانور ذبح کرنا جائز نہیں ہے چہ جائیکہ ان آستانوں اور درباروں پر جا کر ذبح کیے جائیں جو پرستش اور نذر و نیاز کے لیے مرجع عوام ہیں۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ.

بہر حال گیارھویں کے نام پر دیگیں پکائی جائیں یا جانور ذبح کیا جائے یا کچھ اور تقسیم کیا جائے، اس کا نام کچھ بھی رکھ لیا جائے، وہ ایصالِ ثواب ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ دراصل پیر صاحب کے نام کی نذر و نیاز ہے جس سے مقصود انھیں راضی کرنا اور ان کے عتاب و غضب سے بچنا ہے۔ اس اعتبار سے انھیں خدائی صفات کا (نعوذ باللہ) حامل سمجھا جاتا ہے اور نذر و نیاز کے ذریعے سے اور ان سے استمداد و استغاثہ کر کے غیر شعوری طور پر ان کی عبادت کی جاتی ہے جو شرک، یعنی ناقابل معافی گناہ ہے۔

گیارھویں کا جلوس

پاکستان میں چند سالوں سے اس مہینے میں گیارھویں کا جلوس بھی نکالا جا رہا ہے۔ یہ جلوس، چاہے وفات کے موقع پر ہو یا ولادت کے موقع پر، شریعتِ اسلامیہ میں تو اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ یہ سراسر ایجادِ بندہ اور غیر مسلموں کی نقالی پر مبنی رسم ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے تا کہ وہ تمام بدعات و خرافات سے بچ سکیں۔

ایک اور قابل غور نکتہ

شیخ عبدالقادر جیلانی کی ولادت 471ھ میں اور وفات 1 ربیع الثانی 561ھ کو ہوئی۔ گویا آپ چھٹی صدی ہجری میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ اس سے قبل آپ کے نام کی

طرف منسوب گیارھویں کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ اسی طرح آپ کی وفات کے بعد بھی کئی صدیوں تک اس کا نام ونشان نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں پاک و ہند کے علاوہ کسی بھی علاقے میں گیارھویں کا کوئی تصور نہیں ہے۔ سوچنے والی بات ہے کہ پاک و ہند میں گیارھویں کو جو حیثیت و اہمیت حاصل ہے، آخر اس کی بنیاد کیا ہے؟ کیا صدیوں بعد کی ایجاد بندہ قسم کی چیزیں دین کا حصہ بن سکتی ہیں؟ اجر وثواب کا باعث ہوسکتی ہیں؟ وہ واجب یا مستحب ہوسکتی ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے تو قرآن کریم میں نبی ﷺ کی زندگی میں اعلان فرما دیا تھا:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ﴾

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کردیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کردی۔''[1]

اب تکمیلِ دین کے بعد گیارھویں کا وجوب یا استحباب کہاں سے آگیا؟ صحابہ و تابعین اور ائمۂ محدثین کے دور میں جس کا وجود نہیں تھا، اب اس کی دینی حیثیت کیا ہوسکتی ہے؟ بہرحال جو شخص بھی اس نکتے پر غور کرے گا اور اس کو فکر ونظر کا موضوع بنائے گا، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے حق وصواب کا راستہ واضح فرما دے گا۔

بقول علامہ اقبال:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھائیں کسے، راہروِ منزل ہی نہیں

اور

[1] المآئدۃ 3:5.

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

چند من گھڑت کرامات

حضرت پیر صاحب کو ''سب کچھ کرنے والا'' ثابت کرنے کے لیے لوگوں نے متعدد من گھڑت ''کرامات'' بھی مشہور کر رکھی ہیں۔ ان میں سے چند ''کرامات'' بطور مثال پیش خدمت ہیں:

1 شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ کی، جو سلسلۂ سہروردیہ کے امام ہیں، والدہ ماجدہ حضور غوث الثقلین کے والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں اور عرض کرتی ہیں کہ حضور دعا فرمائیں میرے ہاں لڑکا پیدا ہو۔ آپ نے لوحِ محفوظ میں دیکھا اور اس میں لڑکی مرقوم تھی۔ آپ نے فرمادیا کہ تیری تقدیر میں لڑکی ہے۔ وہ بی بی یہ سن کر واپس ہوئیں۔ راستہ میں حضور غوثِ اعظم ملے۔ آپ کے استفسار پر انھوں نے سارا ماجرا بیان کیا۔ حضور نے ارشاد فرمایا: جا تیرے ہاں لڑکا ہوگا مگر وضع حمل کے وقت لڑکی پیدا ہوئی۔ وہ بی بی بارگاہِ غوثیت میں اس مولود کو لے کر آئیں اور کہنے لگیں: حضور لڑکا مانگوں اور لڑکی ملے؟ فرمایا: یہاں تو لاؤ اور کپڑا ہٹا کر ارشاد فرمایا: یہ دیکھو تو، یہ لڑکا ہے یا لڑکی؟ دیکھا تو لڑکا تھا اور وہ یہی شہاب الدین سہروردی تھے۔ آپ کے حلیہ مبارک میں ہے کہ آپ کی پستان مثل عورتوں کے تھیں۔''[1]

اسی واقعہ کے اوپر شیخ جیلانی کے بارے میں یہ شعر لکھا ہے:

[1] باغِ فردوس معروف بہ گلزارِ رضوی، صفحہ: 26، نیز دیکھیے: کراماتِ غوث اعظم، صفحہ: 81.

لوحِ محفوظ میں تثبیت کا حق ہے حاصل

مرد عورت سے بنا دیتے ہیں غوث الاغواث

2 ایک روز ایک عورت حضرت محبوب سبحانی غوث صمدانی شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ النورانی کی بارگاہِ غوثیت کی پناہ میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگی کہ حضور دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اولاد عطا فرمائے۔ آپ نے مراقبہ فرما کر لوحِ محفوظ کا مشاہدہ فرمایا تو پتہ چلا کہ اس عورت کی قسمت میں اولاد نہیں لکھی ہوئی تھی، پھر آپ نے بارگاہِ الٰہی میں دو بیٹوں کے لیے دعا کی۔ بارگاہ سے ندا آئی کہ اس کے لیے تو لوحِ محفوظ میں ایک بھی بیٹا نہیں لکھا ہوا، آپ نے دو بیٹوں کا سوال کر دیا۔ پھر آپ نے تین بیٹوں کے لیے سوال کیا تو پہلے جیسا جواب ملا، پھر آپ نے سات بیٹوں کا سوال کیا تو ندا آئی: اے غوث! اتنا ہی کافی ہے، یہ بھی بشارت ملی کہ اللہ تعالیٰ اس عورت کو سات لڑکے عطا فرمائے گا۔“ [1]

3 حضرت محبوبِ سبحانی قطب ربانی غوث صمدانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ النورانی کا ایک خادم انتقال کر گیا۔ اس کی بیوی آہ وزاری کرتی ہوئی آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگی کہ حضور میرا خاوند زندہ ہونا چاہیے۔ آپ نے مراقبہ فرمایا اور علم باطن سے دیکھا کہ عزرائیل اس دن کی تمام ارواح قبضہ میں لے کر آسمان کی طرف جا رہا ہے تو آپ نے عزرائیل علیہ السلام سے کہا ٹھہر جائیں اور مجھے میرے فلاں خادم کی روح واپس کر دیں تو عزرائیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں ارواح کو حکم الٰہی سے قبض کر کے اس کی بارگاہِ الٰہیہ میں پیش کرتا ہوں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس شخص کی روح تجھے

[1] کراماتِ غوث اعظم از محمد شریف نقشبندی، صفحہ: 81،80.

دے دوں جس کو بحکم الٰہی قبض کر چکا ہوں۔ آپ نے اصرار کیا مگر ملک الموت نہ مانے۔ ان کے ایک ہاتھ میں ٹوکری تھی جس میں اس دن کی ارواح مقبوضہ تھیں۔ پس قوتِ محبوبیت سے ٹوکری ان کے ہاتھ سے چھین لی تو ارواح متفرق ہوکر اپنے اپنے بدنوں میں چلی گئیں۔ عزرائیل علیہ السلام نے اپنے رب سے مناجات کی اور عرض کیا: الٰہی تو جانتا ہے جو میرے اور تیرے محبوب کے درمیان گزری، اس نے مجھ سے آج کی تمام مقبوضہ ارواح چھین لی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہوا: اے عزرائیل! بے شک غوثِ اعظم میرا محبوب و مطلوب ہے تو نے اس کے خادم کی روح واپس کیوں نہ دے دی۔ اگر ایک روح واپس دے دیتا تو اتنی روحیں ایک روح کے سبب کیوں واپس جاتیں۔'' [1]

مقامِ غور

سوچنے والی بات یہ ہے کہ جس ہستی کا وہ مقام ہے جو اس نظم اور من گھڑت ''کرامات'' میں بیان کیا گیا ہے، کیا وہ کسی کے ایصالِ ثواب کی محتاج ہوسکتی ہے؟ بقول تمھارے وہ تو قاضی الحاجات ہے، مشکل کشا ہے، وہ دونوں جہانوں میں لوگوں کا سہارا ہے، تمام انس و جن پر اس کا تصرُّف ہے، اسی طرح کی دیگر خدائی صفات کی وہ مالک ہے، کیا وہ اس بات کی محتاج ہے کہ ہم اس کے لیے ایصالِ ثواب کریں؟ ایصالِ ثواب تو مغفرت یا رفع درجات کے لیے کیا جاتا ہے تو جس کا درجہ اتنا بلند ہو کہ اس کا حکم ہر حال میں نافذ ہونے والا ہے، یعنی اسے کوئی ٹال نہیں سکتا، اس کا چاہا اور اللہ کا چاہا ایک ہے، یعنی اللہ سے وہ جدا نہیں، کائنات کی کسی چیز کا اس سے پردہ نہیں، یعنی وہ عالم الغیب والشھادۃ ہے۔ ایسی ہستی کے لیے ایصالِ ثواب کیا معنی؟

[1] کراماتِ غوث اعظم از محمد شریف نقشبندی، صفحہ: 93,92.

فضائل واعمال اور رسومات

جمادی الاولی اور جمادی الثانیہ

اسلامی سال کا پانچواں اور چھٹا مہینہ جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخریٰ ہیں۔

وجہ تسمیہ

جُمادیٰ، بروزنِ مُنادیٰ، جمود سے ہے جس کے معنی جمنے کے ہیں۔ جس زمانے میں، ان مہینوں کے یہ نام پڑے، اس زمانے میں ان مہینوں میں سردی کی شدت کی وجہ سے پانی جم جاتا تھا، اس لیے ان دونوں مہینوں کا نام جُمادیٰ قرار پا گیا اور انھیں اَلْأُولٰی اور اَلْأُخْرٰی یا اَلثَّانِیَة کے ساتھ ایک دوسرے سے ممتاز کر دیا گیا۔

جُمادیٰ، مؤنث ہے، اس لیے دونوں کی صفت اَلْأُولٰی اور اَلْأُخْرٰی یا اَلثَّانِیَة ہوگی۔ اَلْأُخْرٰی اور اَلثَّانِیَة، دونوں کے معنی ہیں: دوسرا، اس لیے جمادی الاخریٰ یا جمادی الثانیہ، دونوں طرح صحیح ہے، اس لیے کہ دونوں ہم معنی ہیں۔

انھیں اہل اردو جمادی الاول اور جمادی الثانی لکھتے اور بولتے ہیں جو غلط ہے کیونکہ یہ عربی قواعد کے خلاف ہے، یہ موصوف صفت ہیں، ان میں مطابقت ضروری ہے۔ بنا بریں اس غلطی کی تصحیح ضروری ہے۔ اور وہ تصحیح یہی ہے کہ انھیں جُمادَی الْأُولٰی اور جُمادَی الْأُخْرٰی یا جُمادَی الثانیة لکھا اور بولا جائے۔

فضائل

ان دونوں مہینوں کی کوئی فضیلت احادیث میں وارد نہیں ہوئی۔

مسنون اعمال

قرآن و حدیث میں ان دونوں مہینوں میں کسی عمل کی کوئی خاص فضیلت بیان نہیں کی گئی، لہٰذا جو مسنون اعمال دیگر ایام میں کیے جاتے ہیں، وہ ان مہینوں میں بھی کیے جائیں۔

رسوم و بدعات

ان مہینوں میں ہمارے ہاں کوئی خاص رسم اور بدعت بھی رائج نہیں ہے، یعنی یہ مہینے غیر شرعی رسومات وخرافات سے پاک ہیں۔
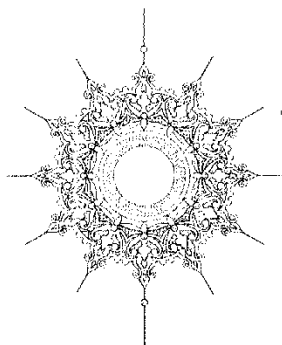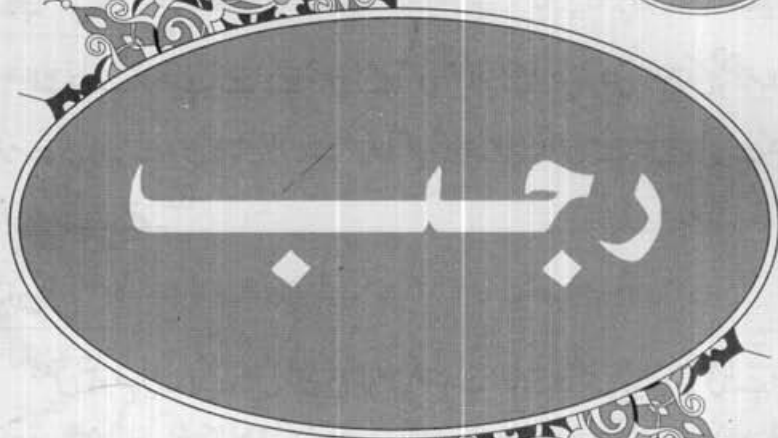
7
رجب
فضائل واعمال اور رسومات

ماہِ رجب اور اس کی بدعات

اسلامی سال کا ساتواں مہینہ رجب ہے۔

وجہ تسمیہ

لفظ رجب ترجیب سے ہے جس کے معنی تعظیم کے ہیں، اس مہینے کی تعظیم اور حرمت کی وجہ سے اس کا نام ''رجب'' رکھا گیا کیونکہ عرب اس مہینے میں لڑائی سے کلیتاً گریز کرتے تھے۔[1]

فضائل

بعض ماہ مبارک ایسے ہیں جن کی خاص فضیلت احادیث میں بیان کی گئی ہے اور ان میں بعض امور خیر کی ترغیب و تلقین کی گئی ہے، جیسے شعبان، رمضان اور ذوالحجہ وغیرہ ہیں۔ لیکن رجب کا مہینہ ایسا ہے جس کی کوئی امتیازی فضیلت کسی صحیح حدیث میں وارد نہیں۔ سوائے اس فضیلت کے کہ ماہِ رجب چار حرمت والے مہینوں میں سے ایک ہے۔ رجب کے علاوہ ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم (متواتر تینوں مہینے) حرمت والے ہیں۔ ان چار مہینوں میں اسلام سے قبل بھی اہل عرب جنگ و جدال کو ناپسند کرتے تھے اور قرآن کریم کی رو سے تو یہ چاروں مہینے ابتدائے آفرینش ہی سے قابلِ احترام ہیں

[1] القاموس المحيط: 74/1، ولسان العرب: 411/1، 412 مادة: رجب.

اور اس وقت ہی سے ان میں جنگ و جدال حرام اور ممنوع ہے۔ اس اعتبار سے اسلام میں ماہ رجب کی صرف یہ فضیلت ثابت ہے کہ یہ چار حرمت والے مہینوں میں سے ایک حرمت والا مہینہ ہے۔

مسنون اعمال

اس مہینے میں کسی نیک عمل کو فضیلت کے ساتھ خاص نہیں کیا گیا۔ جن بعض اعمال کو فضیلت کے ساتھ بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے، وہ محض فرضی قصے اور ضعیف و موضوع روایات پر مبنی داستانیں ہیں، لہٰذا جو اعمال کتاب و سنت سے ثابت ہیں، ان پر عمل کیا جائے۔

رسومات و بدعات

مسلمان اس ماہِ رجب میں کئی کام ایسے کرتے ہیں جو بدعات کے دائرے میں آتے ہیں اور یہ بدعات ان کی جڑوں میں اس طرح راسخ ہوگئی ہیں کہ ان کا اہتمام ان کے نزدیک فرائض سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اور اس کی وجہ وہ من گھڑت فضیلتیں ہیں جو اہل بدعت بیان کرتے ہیں، جیسے ماہِ رجب کے جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کے تین روزے رکھنا، نیز جمعے کی رات مغرب سے عشاء تک مخصوص انداز میں 12 رکعت نماز پڑھنا۔ رجب کے پہلے جمعے کی شب کو ''صلاۃ الرغائب'' پڑھنا۔ کثرت سے نفلی روزوں کا اہتمام کرنا اور اجر و ثواب کی زیادتی کی نیت سے اسی ماہ میں زکاۃ دینا۔ 22 رجب کو کونڈوں کی رسم ادا کرنا۔ رجب کی 27 ویں شب کو ''شب معراج'' کی وجہ سے خصوصی عبادت کرنا، مساجد پر چراغاں کرنا اور تقریبات و محافل کا انعقاد کرنا۔ 27 ویں کو یومِ معراج کے طور پر منانا اور اس دن کا روزہ رکھنا، جلسے وجلوس کا اہتمام

کرنا، آتش بازی، چراغاں اور اس جیسی دیگر خرافات پر عمل کرنا۔

❶ کونڈوں کی رسم

رجب کی بدعات میں سے ایک کونڈوں کی رسم بھی ہے جسے بہت ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے۔

ایک من گھڑت داستانِ عجیب

اس کی بنیاد قرآن کے کسی حکم یا رسول اللہ ﷺ کے کسی فرمان یا فقہ کے کسی مسئلے پر نہیں ہے بلکہ ایک من گھڑت داستان پر ہے جسے "داستانِ عجیب" کہا جاتا ہے۔ جس کی کوئی سند نہیں ہے، نہ وہ کسی مستند کتاب ہی میں موجود ہے۔ جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

ایک لکڑ ہارا مدینے میں نہایت تنگ دستی اور فقر و فاقہ کی زندگی گزار رہا تھا، پھر وہ تلاشِ معاش میں مدینے سے نکل کھڑا ہوتا ہے اور بارہ سال دَر دَر کی ٹھوکریں کھاتا ہے لیکن دولت کا طائر بلند بام اس کے ہاتھ نہیں آتا۔

ادھر اس کی بیوی وزیر کے گھر نوکری کر لیتی ہے، ایک دن حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کا اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے گزر ہوتا ہے، حضرت جعفر محل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ساتھیوں سے پوچھتے ہیں: آج کون سی تاریخ ہے؟ عرض کیا جاتا ہے کہ رَجب کی بائیسویں تاریخ ہے۔ فرمایا کہ آج کے دن جو شخص نئے کونڈے لے کر، ان میں پوریاں وغیرہ بھر کر میری فاتحہ پڑھے گا اور میرے وسیلے سے دعا کرے گا، اس کی ہر حاجت پوری اور ہر مشکل دور ہو جائے گی، اگر ایسا نہ ہو تو وہ قیامت کے روز میرا دامن پکڑ سکتا ہے۔

یہ سن کر لکڑ ہارے کی بیوی نے حضرت جعفر صادق کے کونڈے بھرے، جس کے نتیجے میں اس کی خواہش کے مطابق 12 سال کے بعد اس کا خاوند مال و زر کے انبار لے کر گھر لوٹ آیا۔ آنے کے بعد اس نے وزیر کے محل کے سامنے ایک شاندار محل تعمیر کروایا، وزیر کی بیوی نے جب یہ نوتعمیر محل دیکھا تو پوچھا کہ یہ کس کا محل ہے؟ بتلایا گیا کہ اسی نوکرانی کا ہے جو آپ کے گھر جھاڑو دیا کرتی تھی۔

اس نے اسے بلا کر اس کی مال داری کا راز پوچھا تو اس نے کونڈے بھرنے کا ذکر کیا لیکن اسے یقین نہیں آیا اور کونڈوں کی اس کرامت کا انکار کر دیا، جس کے نتیجے میں وزیر اور اس کی بیوی کو ذلت و خواری کے بدنصیب دن دیکھنے پڑے۔ اور اس کی صورت یہ بنی کہ بادشاہ نے اپنے اس وزیر کو نہ صرف وزارت سے معزول کر دیا بلکہ اسے جلا وطن ہونے کا حکم دے دیا، چنانچہ وہ اپنی بیوی کو لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے ایک خربوزہ خرید کر رومال میں باندھ لیا تاکہ راستے میں کھا لیں گے۔ اتفاق سے اسی روز بادشاہ کا بیٹا شکار کھیلنے کے لیے گیا تو وقت پر واپس نہ آیا، اس کے درباریوں نے کہا: بادشاہ سلامت! کہیں اس معزول وزیر نے آپ کے شہزادے کو قتل نہ کروا دیا ہو۔ بادشاہ نے اس وزیر کے پیچھے اپنے آدمی بھیج کر اسے منگوایا اور اس سے پوچھا تو اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ بادشاہ نے پوچھا: اس رومال میں کیا ہے؟ اس نے کہا: خربوزہ ہے۔ لیکن اسے کھول کر دیکھا گیا تو اس میں شہزادے کا خون آلود سر تھا، چنانچہ بادشاہ نے ان دونوں کو جیل بھیج کر ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ رات کو جیل میں وزیر کی بیوی نے اپنے خاوند سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے 22 رجب کے کونڈوں کی فضیلت کا جو انکار کیا تھا، یہ ساری افتاد اس کی وجہ سے آئی ہے، چنانچہ انھوں نے عہد کیا کہ اگر ہمیں نجات مل گئی تو آئندہ کونڈے بھرا کریں گے۔ ان کا یہ

عزم کرتے ہی، اللہ کا کرنا ہوا کہ رات کو شہزادہ گھر آ گیا۔ بادشاہ اسے دیکھ کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ اس نے دونوں میاں بیوی کو جیل سے بلا کر پوچھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ انھوں نے بتلایا کہ اس طرح کونڈوں کی فضیلت کا ہم نے انکار کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں ہمیں یہ آزمائش پیش آئی اور جوں ہی ہم نے اس کی فضیلت تسلیم کی تو آپ کا شہزادہ بخیریت گھر آ گیا، چنانچہ بادشاہ نے بھی پوری مملکت میں کونڈے بھرنے کا حکم دے دیا۔ (ملخص)

کونڈوں کی صورت یہ ہے کہ 21 رجب کی شب کو ایک خاص قسم کی میٹھی چیز تیار کر کے مٹی کے کورے کونڈوں میں بھر لی جاتی ہے، اس پر حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کے نام کا ختم پڑھا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ کا ہمیں علم نہیں، یہ کونڈے پھر عزیز و اقارب کے ساتھ بڑے اہتمام اور خاص آداب کے ساتھ کھائے اور کھلائے جاتے ہیں۔ اس رسم بدعی کے جواز کے لیے کہا جاتا ہے کہ 22 رجب کو حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کا سانحۂ انتقال پیش آیا تھا۔

اولاً: تو ان کی تاریخِ وفات یہ نہیں بلکہ 15 شوال 148ھ ہے، یہ بھی نہیں کہ ان کی تاریخ مختلف فیہ ہو بلکہ 15 شوال باتفاق مؤرخین ہے گویا یہ ''دلیل''

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

کی مصداق ہے۔

ثانیاً: اگر ان کی تاریخ وفات 22 رجب ہی مان لی جائے تب بھی اس تاریخ سے کونڈوں کا کیا تعلق۔ اور وفات کے سانحۂ دلدوز پر حلوہ خوری میں کیا تُک ہے؟

ثالثاً: 22 رجب ان کی ولادت کا دن بھی نہیں، کیونکہ ان کی ولادت 17 ربیع الاول 83ھ کو ہوئی ہے۔

رابعاً: حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ جیسے اور سیکڑوں بزرگ ہماری تاریخ میں گزرے ہیں، ان کے یوم وفات پر ایسا کیوں نہیں کیا جاتا؟ جعفر صادق رحمہ اللہ کی وفات والے دن ہی ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟ اس تخصیص کی بنیاد اور دلیل کیا ہے؟

خامساً: دین کی تکمیل تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ہو چکی ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ ﴾ [1]

اب تکمیل شریعت کے بعد کسی کو دین میں اضافہ کرنے کی اجازت کب ہے؟

بہر حال جس لحاظ سے بھی اس رسمِ بدعی کا جائزہ لیا جائے، اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں، اس لیے بلا امتیاز ہر طبقہ کے محقق علماء نے اس کی بے اصلیت ظاہر کر دی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کونڈے دراصل اسی طرح حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کے نام کی نیاز ہیں، جس طرح دوسرے کئی بزرگوں کے ناموں کی نیاز دی جاتی ہے۔ تب بھی یہ بہت بڑا گناہ ہے بلکہ شرک ہے کیونکہ نذر و نیاز بھی عبادت ہی کی ایک قسم ہے اور عبادت صرف اللہ ہی کا حق ہے، اس کے سوا کسی کی بھی عبادت جائز نہیں بلکہ اگر کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرے گا (کسی اور کے نام کی نذر و نیاز دے گا) تو وہ مشرک قرار پائے گا جیسا کہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب دُرِّ مختار کی حسب ذیل عبارت پہلے بھی گزر چکی ہے:

«وَاعْلَمْ أَنَّ النَّذْرَ الَّذِي يَقَعُ لِلْأَمْوَاتِ مِنْ أَكْثَرِ الْعَوَامِّ وَمَا يُؤْخَذُ مِنَ الدَّرَاهِمِ وَالشَّمْعِ وَالزَّيْتِ وَنَحْوِهَا إِلٰى ضَرَائِحِ الْأَوْلِيَاءِ

[1] المآئدة 5:3.

الْكِرَامِ تَقَرُّبًا إِلَيْهِمْ فَهُوَ بِالْإِجْمَاعِ بَاطِلٌ وَحَرَامٌ» [1]

علمائے فرنگی محل (لکھنؤ) کا متفقہ فتویٰ

چنانچہ علمائے اہل حدیث و دیوبند کے علمائے فرنگی محل (لکھنؤ) نے بھی ان کے بے اصل ہونے کا متفقہ فتویٰ دیا ہے جو آج سے پون صدی (75 سال) قبل شائع ہوا تھا۔ ان سے سوال کیا گیا:

سوال ''اس جوار میں طریقۂ اہل تشیع کے موافق کونڈوں کا بڑا رواج ہوگیا ہے، یعنی 22 رجب کو نمازِ فجر کے بعد پوریاں کونڈوں میں رکھ کر فاتحہ ہوتا ہے اور طریقۂ فاتحہ کے ضمن میں ایک تصنیف ہے، وہ پڑھی جاتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ شیعوں کے امام جناب جعفر صادق رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''22 رجب کو کونڈے کرو اور میرے توسل سے مراد طلب کرو اور جو مراد پوری نہ ہو تو قیامت میں تمھارا ہاتھ میرا دامن ہوگا۔''

ایسی فاتحہ دلانا اس میں شریک ہونا جائز ہے یا نہیں؟ امید ہے کہ شرع شریف کے موافق اس کی اصلیت یا تشریح سے آگاہ کر کے ماجور ہوں گے۔ (ملخصاً)

جواب ایصالِ ثواب بہتر ہے لیکن کونڈوں کی تعیین اور دیگر لوازم مذکورہ سوال کی تخصیص بالکل بے اصل ہے۔ اس کو ایصالِ ثواب میں ضروری سمجھنا سراسر غلطی ہے۔ روایت مذکورہ کسی معتبر کتاب میں نظر سے نہیں گزری۔ اس طریقۂ خاص کو باتباعِ اغیار اختیار کرنا اہل اسلام کے شایانِ شان نہیں بلکہ مزخرفاتِ اغیار کو ترقی دینا ہے، لہٰذا اس بدعت کو مٹانے کی کوشش کرنا اہل اسلام کا فرض ہے جس میں امکانی دریغ سے گنہگار ہوں گے۔ [2]

[1] الدرالمختار، آخر كتاب الصوم، صفحه: 134، طبع مير ٹھ. [2] حرره الراجي عند ربه الوحيد أبو الحامد محمد عبدالوحيد غفرالله ذنوبه.

جواب 2: امور مذکورۃ السوال کی شرعاً کوئی اصل نہیں۔ یہ امور لغویات میں سے ہیں۔ ایک مسلمان کی شان اس سے اعلیٰ وارفع ہے کہ وہ اس قسم کے توہمات میں مبتلا ہو۔ جناب جعفر صادق رحمہ اللہ کی طرف کثرت سے جھوٹی باتیں منسوب کر دی گئی ہیں، بائیسویں رجب کے متعلق کوئی خاص شرعی حکم نہیں ہے۔ اس تاریخ کو کوئی خاص عمل کرنے کی ہدایت نہیں کی گئی ہے لوگوں نے اپنی طرف سے بہت سی باتیں گھڑ لی ہیں۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ حتی الامکان اس قسم کی لغویات سے مسلمانوں کو باز رکھے اور بآسانی و نرمی ان فضولیات کی لغویت ذہن نشین کرائے۔ اس قسم کے طریقوں سے مرادیں حاصل کرنا درست نہیں ہے۔ مرادیں حاصل ہو جانا ان طریقوں کی صحت کی دلیل نہیں۔ مشرکین بتوں کے ذریعے سے بھی مرادیں مانگتے ہیں۔ بہر حال ان امور میں اپنے روپیہ کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم۔ (ملخص) [1]

تائیدات

- محمد عنایت اللہ عفی عنہ، رجب 1346 ھ۔ فرنگی محل لکھنؤ۔
- محمد ایوب غفرلہ فرنگی محل لکھنؤ۔
- ابو القاسم محمد عتیق صانہ سبحانہ عما لا یلیق، بن حضرت مولانا المعی العلام الفرنجی محل لکھنوی 5 رجب 1346 ھ۔
- الجواب صحیح والرأی نجیح۔ ابو طاہر احمد البہاری الرسول فوری کان اللہ لہ۔ مدرس اول مدرسہ عالیہ قدیمہ بروز شنبہ، 9 رجب المرجب 1346 ھ۔
- الجواب صحیح۔ حکیم عبدالستار خاں مدرس مدرسہ عالیہ قدیمہ بقلم خود۔
- صح الجواب واللہ اعلم بالصواب، حررہ عبداللہ۔

[1] کتبہ محمد شفیع حجۃ اللہ الأنصاري، فرنگی محل لکھنؤ۔

❁ الجواب صحیح واللہ اعلم بالصواب، محمد فضل خان عفی عنہ مدرسہ عالیہ قدیمہ۔

تائید حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمہ اللہ

واقعی یہ بدعت قبیحہ روافض کی احداث کی ہوئی ہے اوران کے مذہب باطل کی ترویج کا ذریعہ ہے۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے بھائیوں سے اس کے ترک کرنے کی سعی بلیغ کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ، احقر العباد محمد عبدالشکور عافاہ مولاہ

لکھنؤ، 16 رجب 1346ھ

22 رجب دراصل دشمنانِ صحابہ کی خوشی کا دن ہے

اصل حقیقت یہ ہے کہ 22 رجب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کا دن ہے اور دشمنانِ صحابہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خوشی میں اس دن کونڈوں وغیرہ کے ذریعے سے اظہارِ فرحت ومسرت کے طور پر کھانے پینے کا اہتمام کرتے ہیں جیسا کہ ایک شیعہ کیلنڈر میں ''مرگِ معاویہ'' کے عنوان سے 22 رجب کو خوشی کا دن بتلایا گیا ہے۔

یہ کیلنڈر جامعہ ''المنتظر'' ماڈل ٹاؤن لاہور سے ہر سال شائع ہوتا ہے، یہ جامعہ شیعوں کی مرکزی درس گاہ ہے۔

ہماری نظر سے جو کیلنڈر گزرا ہے، شیعہ کی ایک دکان سیٹھ برادرز شاہ عالم مارکیٹ لاہور کا پتہ بھی اس کیلنڈر پر لکھا ہوا ہے۔ یہ کیلنڈر دورنگا ہے۔ خوشی کے ایام کو سرخ اور دیگر ایام کو سیاہ رنگ سے چھاپا گیا ہے تاکہ دونوں ایک دوسرے سے ممتاز رہیں، چنانچہ 22 رجب کو ''مرگِ معاویہ'' قرار دے کر اسے سرخ رنگ سے ممتاز کیا گیا ہے۔

2 صلاۃ الرغائب

اس مہینے کی ایک اور رسم، جو مشہور تو کافی ہے لیکن اس پر عمل غالباً زیادہ تر صوفیاء اور مشائخ کے حلقوں ہی میں کیا جاتا ہے، صلاۃ الرغائب ہے۔ یہ رجب کے پہلے جمعے کی رات کو ہوتی ہے جسے لیلۃ الرغائب کہا جاتا ہے۔ یہ بدعت کافی پرانی معلوم ہوتی ہے۔ کئی اکابر علماء نے اس کے رد میں خاص کتابیں لکھی ہیں۔ بعض تصوف زدہ اور خانقاہی مزاج رکھنے والے بزرگ بھی اس کے ''استحسان'' کے وہم میں مبتلا رہے ہیں، جیسے امام غزالی رحمہ اللہ، شیخ عبدالحق دہلوی رحمہ اللہ وغیرہ ہیں۔ اس کا ایک خاص طریقہ بھی ذکر کیا گیا ہے:

''رجب کی پہلی جمعرات دن کو روزہ رکھے، پھر جمعہ کی رات، مغرب وعشاء کے درمیان بارہ رکعتیں پڑھے، ہر دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دے، ہر رکعت میں سورۃ القدر 3 مرتبہ، سورۃ الاخلاص 12 مرتبہ پڑھے۔ نماز سے فارغ ہوکر یہ درود پڑھے: «اَللّٰهُمَّ! صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَسَلِّمْ» 70 دفعہ، بعد میں سجدہ کرے جس میں 70 دفعہ «سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ» کہے، سجدے سے سر اٹھا کر 70 دفعہ یہ دعا پڑھے: «رَبِّ! اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْأَعْظَمُ۔ أَوْ أَنْتَ الْأَعَزُّ الْأَكْرَمُ» پھر دوسرا سجدہ کرے اور اس میں وہی دعا پڑھے جو پہلے سجدے میں پڑھی تھی، پھر جو چاہے اللہ سے اپنی ضرورت طلب کرے، اس کی ضرورت پوری ہوگی۔''[1]

[1] ملاحظہ ہو إحياء العلوم:302/1، وغنية الطالبين، ص:433، طبع:1309ھ۔

اس نماز کی ان صوفیاء و مشائخ نے بہت سی خانہ ساز فضیلتیں بیان کی ہیں لیکن شریعت میں ان کی کوئی اصل نہیں، اس لیے اس پر عمل سراسر گناہ اور حرام ہے۔

''صلاۃ الرغائب'' کی فضیلت میں بیان کی جانے والی روایت موضوع اور من گھڑت ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صلاۃ الرغائب کی کوئی اصل نہیں بلکہ یہ ایک نئی چیز، یعنی بدعت ہے، لہٰذا یہ نماز نہ انفرادی جائز ہے اور نہ جماعت کے ساتھ کیونکہ صحیح مسلم میں نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے جمعے کی رات کو قیام سے اور دن کو روزے سے خاص کرنے سے منع فرمایا ہے۔ [1]

مزید فرمایا کہ یہ نماز رسول اللہ ﷺ نے پڑھی نہ صحابہ، تابعین اور ائمۂ مسلمین نے پڑھی اور نہ اس کی ترغیب دلائی۔ [2]

امام نووی رحمہ اللہ نے بھی صلاۃ الرغائب اور ''صلاۃ نصف شعبان'' پندرھویں شعبان کی نماز کے بارے میں فرمایا: انھیں نہ نبی ﷺ نے پڑھا نہ صحابہ اور ائمۂ اربعہ میں سے کسی نے اسے پڑھا ہے نہ انھوں نے اس کی کوئی فضیلت بتائی اور نہ ان کے متبعین نے اسے پڑھا ہے، لہٰذا یہ بہت ہی بری بدعت ہے، اس سے بچنا نہایت ضروری ہے، ملخصًا۔ [3]

اور امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رجب کے پہلے جمعے کی رات ''صلاۃ الرغائب'' کے متعلق جتنی احادیث بیان کی جاتی ہیں سب جھوٹ ہیں۔ دیکھیے (المنار المنیف، ص: 95، حدیث: 167)

[1] صحيح مسلم، الصيام، باب كراهة إفراد يوم الجمعة......، حديث: 1144. [2] مجموع الفتاوٰی:23/132-135. [3] فتاوى النووي، ص:40.

❸ شب معراج

اسی رجب کی ستائیسویں شب کو ''شب معراج'' کے نام سے منایا جاتا ہے دراں حالیکہ

اولاً: تو نہ صرف اس تاریخِ معراج میں شدید اختلاف ہے بلکہ مہینے تک میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔

ثانیاً: اگر اسی مہینے اور اسی تاریخ کو وجہ ترجیح کی بنا پر زیادہ قرینِ قیاس سمجھ لیا جائے تب بھی اسے روایتی رسم و رواج کے طور پر منانا اسلام کے منشا کے خلاف ہے، کیا کسی صحابی نے یومِ معراج کی خوشی میں جلسے اور جلوس کا اہتمام کیا تھا؟ آتش بازی، چراغاں اور اسی قبیل کی دوسری خرافات پر روپیہ بہایا تھا؟ جب قرونِ خیر میں صدیوں تک ہمیں ان چیزوں کا کوئی نشان نہیں ملتا تو انھیں کس طرح جائز اور اجر و ثواب کا باعث سمجھا جا سکتا ہے؟

معراج کی دیومالائی تفصیلات

پھر اس رات کو ''واعظانِ شیریں مقال'' اور ''خطیبانِ خوش بیان'' واقعۂ معراج کو جس دیومالائی انداز سے بیان کرتے ہیں اور فرضی قصوں سے جس طرح نبی ﷺ کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں، وہ اس درجہ غُلُوّ آمیز اور گمراہ کن ہوتا ہے کہ اس سے عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان تمیز بالکل اٹھ جاتی ہے بلکہ بعض ستم ظریف یہ شعر تک پڑھ دیتے ہیں:

من تُو شُدم تُومَن شُدی، مَن تَن شُدم تُو جاں شُدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اسی طرح کا ایک قطعہ ایک شیعی ترجمان ہفت روزہ ''رضا کار'' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں افراط وغُلُوّ کا اظہار کیا گیا۔ یہ قطعہ حسب ذیل ہے جو الوہیتِ علی (علی رضی اللہ عنہ کے خدا ہونے) کے عقیدے کا غماز ہے:

اسریٰ کی رات جب گئے عرشِ عظیم پر
دیکھا رسول نے پسِ منظر علی
پردے کے پیچھے دستِ ید اللہ کو دیکھ کر
بولے رسولِ خالقِ اکبر علی علی [1]

نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْخُرَافَاتِ وَالْأَكَاذِيبِ وَالْهَفَوَاتِ.

حالانکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے بارے میں بھی اس قسم کے مبالغے اور غلو سے سختی سے روک دیا تھا، چہ جائیکہ کسی امتی کے بارے میں اس قسم کا غُلُوّ کیا جائے۔ آپ نے فرمایا تھا:

«لَا تُطْرُونِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ فَقُولُوا: عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُولُهُ»

''مجھے اس طرح حد سے نہ بڑھانا جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ ابن مریم کو بڑھایا (کہ انھیں خدائی صفات واختیارات سے متصف قرار دے ڈالا) میں تو اللہ کریم کا بندہ ہوں اور مجھے صرف اللہ کا بندہ اور اس کا رسول (فرستادہ) ہی کہو'' [2]

[1] ''رضا کار'' صفحہ اول، مؤرخہ 24 فروری 1985ء۔ [2] صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ...... أَهْلِهَا﴾ ......، حديث:3445.

واقعہ صرف اتنا ہے کہ نبی ﷺ کو مقامِ بلند اور اعزاز برتر سے سرفراز کرنے کے لیے بیت المقدس کے بعد آسمانوں کی سیر کرائی گئی، بعض عجائب قدرت کا مشاہدہ کرایا گیا جس میں آپ ایک ایک آسمان سے ہوتے ہوئے سدرۃ المنتہیٰ تک تشریف لے گئے، اس سے آگے آپ کے جانے کا ثبوت نہیں، چہ جائیکہ عرش معلّٰی پر۔ (معاذ اللہ) آپ ﷺ کا اللہ سے بغل گیر ہونا، راز و نیاز کی باتیں کرنا اور اسی انداز کی دوسری باتیں، ایسی سب باتیں بالکل بے اصل ہیں، چنانچہ ایک حنفی عالم مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«وُصُولُهُ إِلٰى ذَرْوَةِ الْعَرْشِ لَمْ يَثْبُتْ فِي خَبَرٍ صَحِيحٍ وَلَا حَسَنٍ وَلَا ثَابِتٌ أَصْلًا وَإِنَّمَا صَحَّ فِي الْأَخْبَارِ انْتِهَائُهُ، إِلٰى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى فَحَسْبُ»

''عرش کی بلندی تک آپ کا پہنچنا کسی حدیث صحیح و حسن سے ثابت نہیں۔ صرف سدرۃ المنتہیٰ تک آپ ﷺ کی رسائی ثابت ہے، اس سے آگے نہیں۔''

اسی طرح بعض اور بے اصل باتیں لکھ کر وہ کہتے ہیں کہ ان کا کوئی ثبوت نہیں:

«وَمَا لَمْ يَثْبُتْ لَا يَجُوزُ لَنَا أَنْ نَّجْتَرِئَ عَلٰى ذِكْرِهٖ بَلْ يَجِبُ عَلَيْنَا أَنْ لَّا نَذْكُرَهٗ (غَايَةُ الْمَقَالِ فِيمَا يَتَعَلَّقُ بِالنِّعَالِ)»

''اور جن چیزوں کا ثبوت نہ ہو، انھیں بیان کرنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے بلکہ ان کے ذکر سے احتراز ضروری ہے۔''[1]

امام ابن قیم کہتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: مسلمانوں میں سے کسی کے

[1] مجموعة ثمانية رسائل، ص: 150، طبع لکھنؤ۔

ہاں بھی شب معراج کو کسی دوسری رات کے مقابلے میں کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے چہ جائیکہ لیلۃ القدر کے مقابلے میں۔ اور نہ صحابہ اور تابعین ہی کے ہاں شب معراج کے ساتھ کسی عمل کی خصوصی فضیلت کا ذکر ملتا ہے، اسی لیے یہ رات متعین نہیں کہ یہ کون سی رات ہے۔ اگرچہ اسراء نبی ﷺ کے عظیم فضائل میں سے ہے، لیکن اس کے باوجود کسی شرعی عبادت کے ساتھ اس کے وقت یا جگہ کو خاص کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ غار حراء جس میں نزول وحی کی ابتدا ہوئی اور جہاں قبل از نبوت بھی نبی ﷺ صراط مستقیم کے لیے غور و فکر کیا کرتے تھے، اس جگہ کو بھی نبی ﷺ اور صحابہ نے بعد از نبوت مکی دور میں اور نہ اس کے بعد کسی شرعی عبادت کے لیے خاص کیا اور نہ نزول وحی ہی کے دن میں کسی خاص عبادت کا اہتمام کیا۔

درحقیقت جو اس طرح مقامات و اوقات کو عبادات کے ساتھ خاص کرتا ہے وہ عیسائیوں کی پیروی اور مشابہت کرتا ہے کیونکہ انھوں نے ہی عیسیٰ علیہ السلام کے میلاد وغیرہ منانے کا اہتمام کیا، جبکہ ہمارے اسلاف کا تو یہ حال تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو ایک جگہ نماز پڑھنے کے لیے ہجوم لگائے ہوئے دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: یہ وہ جگہ ہے جہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی تو آپ نے فرمایا: کیا تم انبیاء کے آثار کو مسجدیں بنانا چاہتے ہو؟ اسی وجہ سے تم سے پہلے لوگ ہلاک ہوئے، جسے اس جگہ نماز کا وقت ملے وہ پڑھ لے ورنہ یہاں نماز پڑھے بغیر گزر جائے (اور جہاں نماز کا وقت ہو پڑھ لے)۔[1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: عبادت کے مقررہ شرعی اوقات کے علاوہ کوئی وقت مقرر کرنا، جیسے ربیع الاول کی بعض راتوں میں عید میلاد منانا اور رجب کی

[1] المصنف لابن أبي شيبة: 2/377,376، اس کی سند صحیح ہے۔

بعض راتوں کو خاص کرنا یا 18 ذوالحجہ یا رجب کا پہلا جمعہ یا آٹھ شوال کو عیدالأبرار منانا وغیرہ۔ یہ سب کچھ بدعات ہیں جو اسلاف کے ہاں مشروع نہیں تھیں۔ [1]

شیخ محمد بن ابراہیم آل الشیخ رحمہ اللہ نے شب اسراء و معراج کی محافل و بدعات کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ محافل و محدثات قرآن و حدیث کی رو سے تو بدعات ہیں ہی لیکن مصالح مرسلہ یا استحسان یا قیاس اور اجتہاد کے ذریعے سے بھی یہ مشروع قرار نہیں پاسکتیں کیونکہ عقائد و عبادات کا تعلق نقل سے ہے اور یہ نقلی طور پر ثابت نہیں کہ نبی ﷺ، صحابہ اور تابعین نے انھیں جائز قرار دیا ہو۔

شیخ رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: یہ رسوم و رواج عقلی طور پر بھی مشروع قرار نہیں پاسکتے۔ کیونکہ اگر یہ مشروع ہوتے تو سب سے پہلے نبی ﷺ اس پر عمل کرتے، پھر ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اس پر عمل پیرا ہوتے، پھر صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمۂ دین اسے عملی زینہ بناتے لیکن ان میں سے کسی کے ہاں بھی شب اسراء و معراج کی عبادات، محافل اور بدعات کا ذکر تک نہیں ملتا، لہٰذا جو چیز ان کی کامیابی کے لیے کافی تھی وہی ہماری کامیابی کے لیے بھی کافی ہے۔ [2]

مذکورہ ائمہ و فقہاء کے اقوال اور قرآن و حدیث کے دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں ''شب اسراء و معراج'' میں مروجہ عبادات، محافل اور خود ساختہ فضائل و اعمال سب بدعات ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے واقعۂ معراج کی جو تفصیل احادیث صحیحہ میں ملتی ہے صرف وہی بیان کرنی چاہیے۔ یہ اعجازی واقعہ بجائے خود بڑی اہمیت کا حامل اور نبیٔ کریم ﷺ کے خاص شرف و امتیاز کو بیان کرنے والا ہے۔ ہمیں از خود اس میں نئے نئے اضافے کرکے اس کو چیستاں بنانے کی

[1] مجموع الفتاوٰی لابن تیمیة: 298/2. [2] فتاوٰی ورسائل الشیخ محمد بن إبراهیم: 3/97-100.

ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بدعات سے محفوظ رکھے اور خالص بے آمیز اور سادہ اسلام پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ جہاں تک واقعۂ معراج کی تفصیلات کا تعلق ہے، اس کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب ''واقعۂ معراج اور اس کے مشاہدات۔''

رجب کے فضائل میں من گھڑت روایات

ماہ رجب اور اس میں کی جانے والی رسومات و بدعات کے من گھڑت فضائل جو سادہ لوح عوام الناس کے سامنے بیان کیے جاتے ہیں ہم انھیں بطور ثبوت ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں تاکہ وہ ان حضرات کی جسارت ملاحظہ فرمائیں کہ کس بے باکی سے وہ پیغمبر اسلام کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتے ہیں۔ یہ چار مضمون ہیں۔ انھیں ترتیب وار ملاحظہ فرمائیں:

1 رجب المرجب کی (من گھڑت) فضیلت

رجب توبہ کا مہینہ ہے، شعبان ریاضت کا مہینہ ہے اور رمضان تقرب کا مہینہ ہے۔ رجب عبادت کا، شعبان زہد کا اور رمضان زیارت کا مہینہ ہے۔ رجب میں اللہ تعالیٰ نیکیاں دگنی فرما دیتا ہے، شعبان میں برائیاں مٹا دیتا ہے اور رمضان میں بزرگیوں کا انتظام کیا جاتا ہے اور رجب نیکیوں میں سبقت کرنے والوں کا، شعبان درمیانے مومنوں کا اور رمضان گنہگاروں کا مہینہ ہے۔

ماہ رجب بڑی فضیلت کا حامل ہے۔ رجب لفظ ترجیب سے نکلا ہے جس کے معنی تعظیم کے ہیں۔ اس کے دیگر معانی بھی ملاحظہ فرمائیں:

❀ الاصب (سب سے تیز بہاؤ) اس ماہ میں توبہ بڑی جلدی قبول ہوتی ہے اور عصیاں

کے صحرا دریائے رحمت و مغفرت کے تیز بہاؤ سے سیراب ہوجاتے ہیں۔ عبادت گزار انوارِ قبولیت سے فیض پاتے ہیں۔

❁ الاصم (سب سے زیادہ بہرہ) زمانۂ قبل از اسلام میں اس ماہ میں جنگ و جدل کی آواز قطعاً سنائی نہیں دیتی تھی۔ جنگ اس ماہ میں حرام ہے۔

❁ رجب جنت کی ایک نہر کا نام ہے جو اس ماہ کے روزے داروں کو نصیب ہوگی۔

❁ مطہر (پاک کرنے والا) رجب کو پاک کرنے والا اس لیے کہتے ہیں کہ یہ روزے داروں کے گناہوں اور تمام برائیوں کو پاک و صاف کر دیتا ہے۔ اس ماہ میں دعائیں خوب قبول ہوتی ہیں۔

27 رجب میں شب معراج کا واقعہ

ماہ رجب کی فضیلت اس لحاظ سے بھی ہے کہ پہلی بار حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر نبیٔ اکرم ﷺ پر نازل ہوئے تھے۔ اس ماہ تاریخ اسلام میں شب معراج کا واقعہ پیش آیا جو بہت اہمیت اور عظمت کا حامل ہے۔ یہ واقعہ 27 رجب کو پیش آیا۔ اس ماہ میں تکمیل عبودیت ہوئی تھی۔ یہ معجزہ ایک ایسا اعزاز ہے جو کسی اور نبی کو نہیں ملا۔

امام غزالی رحمہ اللہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف مکاشفة القلوب میں رقمطراز ہیں:

نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''رجب اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے، شعبان میرا مہینہ ہے اور رمضان میری امت کا مہینہ ہے۔''[1]

[1] مکاشفة القلوب، ص: 678-680، یہ روایت موضوع ہے۔ ابن جہضم کذاب نے اسے وضع کیا ہے۔ دیکھیے: الموضوعات لابن الجوزي: 125/2۔ اس علت کو حنفی عالم دین ملا علی قاری نے بھی تسلیم کیا ہے۔ دیکھیے: الموضوعات الکبریٰ للقاري: 460,459۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ستائیس رجب کو روزہ رکھا، اس کے لیے ساٹھ ماہ کے روزوں کا ثواب لکھا جائے گا۔''[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یاد رکھو! رجب اللہ کا مہینہ ہے جس نے رجب میں ایک دن روزہ رکھا، ایمان کے ساتھ اور محاسبہ کرتے ہوئے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی رضوان اکبر (سب سے بڑی رضامندی) لازم ہوگئی۔''[2]

900 برس عبادت کا ثواب

رجب کی پہلی جمعرات کا تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو ہر فرشتہ رجب کے روزے رکھنے والے کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ماہ حرام میں تین روزے رکھے، اس کے لیے 900 برس کی عبادت کا ثواب لکھ دیا گیا۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہو تو میرے کان بہرے ہو جائیں۔[3]

[1] فضائل شهر رجب للإمام أبي محمد الحسن الخلال، حديث: 18، و تبيين العجب لابن حجر، 120,119، مطبوع إدارة العلوم الاثرية، منٹگمری بازار، فیصل آباد. یہ اثر حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے۔ مرفوع حدیث نہیں۔ امام ابن الجوزی اور مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ نے اس اثر کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: تحقیق فضائل شہر رجب، ص: 59. [2] تبيين العجب لابن حجر، ص: 94. مصنف فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے، ابوالبرکات السقطي نے اسے گھڑا ہے۔

[3] العلل المتناهية لابن الجوزي: 64,63/2، حديث: 911. اس کی سند بھی ضعیف ہے کیونکہ مسلمہ بن راشد مضطرب الحدیث ہے اور راشد ابو محمد مجہول ہے۔ امام ابن الجوزی کے علاوہ بھی متعدد محدثین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، نیز حدیث کے الفاظ میں بھی اختلاف ہے کہ 900 برس کے گناہ معاف ہوتے ہیں یا 700 برس یا اس سے کم کے۔ اس تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تحقيق فضائل شهر رجب للخلال از مولانا ارشاد الحق أثري، ص: 52-54.

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پانچ راتوں میں دعا رد نہیں ہوتی، رجب کی پہلی رات، شعبان کی پندرھویں رات، جمعہ کی رات، عید الفطر کی رات اور قربانی کی رات۔''[1]

رجب کے مہینے میں زکاۃ کی فضیلت

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ اپنی تصنیف غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں کہ ایک بار رجب کا ہلال دیکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن منبر پر چڑھ کر فرمایا: ''کان کھول کر سن لو، یہ اللہ کا مہینہ اور زکاۃ کا مہینہ ہے۔ اگر کسی پر قرض ہو تو اپنا قرض ادا کر دے اور جو کچھ مال باقی ہے، اس کی زکاۃ ادا کر دے۔''[2]

رجب کے روزوں کی فضیلت

اگر کوئی رجب میں ایک دن کا روزہ رکھے اور اس کی نیت اللہ تعالیٰ سے ثواب کی ہو اور خلوص سے اللہ کی رضا کا طلب گار ہو تو اس کا ایک دن کا روزہ اللہ تعالیٰ کے غصے کو بجھا دے گا اور آگ کا ایک دروازہ بند کر دے گا اور اگر اسے تمام زمین بھر کا سونا دیا جائے تو اس ایک روزے کا پورا ثواب نہ مل سکے گا اور دنیا کی کسی چیز کی قیمت سے اس

[1] تاریخ دمشق: 408/10، ابراہیم بن ابی یحییٰ اور بندار بن عمر دونوں کذاب راوی ہیں، لہٰذا یہ روایت من گھڑت ہے۔ محدث البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے موضوع قرار دیا ہے۔ دیکھیے: السلسلة الضعيفة: 649/3، حديث: 1452۔ [2] غنية الطالبين للشيخ عبد القادر جيلاني: 175/1. مؤطا امام مالک میں یہ روایت بغیر کسی ماہ کی تعیین کے موجود ہے۔ دیکھیے: المؤطا: 243/2، حدیث: 645. اس کی سند موقوفاً صحیح ہے۔ کتاب الأموال لابن زنجويه، ص: 450، اثر: 1372 میں ابراہیم بن سعد راوی حدیث کا بیان ہے کہ حضرت عثمان نے یہ فرمان رمضان المبارک میں ارشاد فرمایا ہے، لہٰذا غنیۃ الطالبین میں ماہِ رجب کی تصریح درست معلوم نہیں ہوتی۔

کا اجر پورا نہ ہوگا۔ اگر یہ اجر پورا ہوگا تو جزا کے دن ہی حق تعالیٰ پورا فرمائے گا۔ اس روزے دار کی شام کے وقت افطار سے پہلے دس دعائیں قبول ہوں گی۔ اگر وہ دنیا کی کسی چیز کے لیے دعا مانگے گا تو حق تعالیٰ اسے عطا فرمائے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے بعد کسی ماہ کے اکثر روزے نہیں رکھے بجز رجب اور شعبان کے۔''[1] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کسی حرمت والے مہینے کے جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کے تین روزے رکھ لے، حق تعالیٰ شانہ اس کے لیے 900 سال کی عبادت لکھ لے گا۔[2]

سال کی مثال ایک درخت کی ہے۔ رجب اس درخت میں پتے پھوٹنے کا زمانہ ہے، شعبان اس میں پھل آنے کا موسم اور رمضان پھل پکنے کا وقت ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا: ''جو رجب کا ایک روزہ رکھ لے، گویا اس نے ایک ہزار سال کے روزے رکھے اور گویا اس نے ایک ہزار غلام آزاد کیے اور جو اس میں خیرات کرے گویا اس نے ایک ہزار دینار خیرات کیے اور اللہ تعالیٰ اس کے بدن کے ہر بال کے عوض ایک ہزار نیکیاں لکھتا ہے۔ ایک ہزار درجے بلند فرماتا ہے اور ایک ہزار برائیاں مٹا دیتا ہے اور اس کے لیے رجب کے ہر روزے کے عوض اور ہر صدقے کے عوض ایک ہزار حج اور ایک ہزار عمرے لکھ لیتا ہے۔''[3]

حضرت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ''جس نے ستائیسویں (27)

[1] المعجم الأوسط للطبراني: 192/10، حديث: 9418. اس کی سند میں یوسف بن عطیہ الصفار متروک ہے۔ امام ہیثمی نے بھی اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ دیکھیے: مجمع الزوائد: 191/3.

[2] یہ حدیث ابھی گزری ہے۔ [3] لم أجده.

کا روزہ رکھا، اس کے لیے یہ روزہ تمام عمر بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا اور اگر اس سال مرجائے گا تو شہید ہوگا۔" حدیث پاک میں ہے: ''جس نے رجب کے مہینے میں ایک بار سورۂ اخلاص پڑھی، اللہ تعالیٰ اس کے پچاس سال کے گناہ بخش دے گا۔''[1]

رجب کی خصوصی نماز

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی رجب کی جمعرات کا روزہ رکھے گا، پھر جمعہ کی رات میں مغرب سے لے کر عشاء تک بارہ رکعت نماز پڑھ لے اور ہر رکعت میں ایک بار سورۂ فاتحہ، تین بار سورۂ قدر اور بارہ بار سورۂ اخلاص پڑھ لے اور ہر دو رکعت پر سلام پھیر دے اور سلام پھیر کر 70 بار یہ درود پڑھ لے:

«اَللّٰهُمَّ! صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَسَلَّمَ»

پھر سجدہ کرے جس میں 70 دفعہ:

«سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّنَا وَ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ»

کہے، پھر سجدے سے سر اٹھا کر 70 بار یہ دعا پڑھے:

«رَبِّ! اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْأَعْظَمُ (أَوْ أَنْتَ الْأَعَزُّ الْأَكْرَمُ)»

پھر دوسرے سجدے میں جا کر پہلے سجدے والی دعائیں پڑھے تو مرادیں پوری ہوں گی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جو بندہ اور جو کنیز یہ نماز پڑھ لے گی یقیناً حق تعالیٰ اس کے تمام گناہ بخش دے گا اگرچہ وہ

[1] لم أجده.

سمندر کی جھاگ اور اس کی ریت کے ذرات کے، پہاڑوں کے وزن کے، بارش کے قطروں کے اور درختوں کے پتوں کے برابر کیوں نہ ہوں اور قیامت کے دن اس کی شفاعت اس کے خاندان کے ساٹھ آدمیوں کے حق میں قبول کر لی جائے گی اور قبر کی پہلی ہی شب میں اس کے پاس اس نماز کا ثواب کھلے ہوئے چہرے کے اور جاری زبان کے ساتھ آئے گا۔''[1]

تاجدارِ انبیاء حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ رجب میں ایک دن اور ایک رات ایسی آتی ہے کہ اگر کوئی اس میں روزہ رکھ لے اور اس رات عبادت کرے تو اسے سو سال کے روزوں کا اور سو سال کی راتوں کا ثواب ملتا ہے۔ یہ دن رات رجب کی 27 ویں تاریخ ہے۔ اسی دن رسول اللہ ﷺ مبعوث فرمائے گئے۔[2]

ماہ رجب کی عبادات

قرآن و حدیث کی روشنی میں ماہ رجب کی فضیلت بیان کی گئی۔ اس فضیلت کے پیشِ نظر ماہ رجب کی عبادات حسب ذیل ہیں:

- 27 رجب کو چونکہ معراج شریف ہے، لہٰذا اس دن روزہ رکھا جائے۔
- اس ماہ میں تین روزے بروز جمعرات، جمعہ اور ہفتہ ضرور رکھے جائیں کیونکہ ان تین روزوں کا ثواب 900 سال کی عبادت کا ہے۔
- اس ماہ میں زکاۃ دی جائے۔
- کسی کا قرض ادا کرنا ہو تو اس ماہ میں وہ قرض ادا کیا جائے۔

(روز نامہ ''جنگ'' لاہور، 19 ستمبر 2003ء)

[1] الموضوعات لابن الجوزي: 125,124/2. یہ روایت موضوع ہے۔ ابن جہضم کذاب نے اسے گھڑا ہے۔ حافظ ابن الجوزی نے بھی اسے خودساختہ قرار دیا ہے۔ [2] لم أجده.

رجب المرجب کی (من گھڑت) فضیلت کے مضمون کا ایک ایک حرف اور حدیث رسول کے نام سے جتنی حدیثیں اور جو فضیلتیں اس میں بیان کی گئی ہیں، سب من گھڑت ہیں۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ.

2 ایک اور مضمون اور اس کی حقیقت

اسی طرح کا ایک اور مضمون ''شب معراج کے فضائل'' کے عنوان سے روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور (25 جولائی 2008ء) میں چھپا ہے، مضمون نگار ہیں، مولانا محمد الیاس عطار قادری، یہ مضمون بھی ملاحظہ فرمائیں، اس میں بعض حوالے درج ہیں لیکن یہ حوالے کیسے ہیں اور ان حوالوں کی رو سے بیان کردہ فضائل کی کیا حیثیت ہے؟ اس پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے، پہلے آپ یہ ''فضائل'' پڑھ لیں:

امام اہلسنت مجدد دین و ملت، پروانۂ شمع رسالت امام احمد رضا خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فوائد الفوائد میں حضرت سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ستائیس رجب کو مجھے نبوت عطا ہوئی جو اس دن کا روزہ رکھے اور افطار کے وقت دعا کرے دس برس کے گناہوں کا کفارہ ہو۔'' فتاوی رضویہ، ص: 658 مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی۔[1]

حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو رجب کی ستائیسویں کا روزہ رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے ساٹھ مہینوں (پانچ سال) کے روزوں کا ثواب لکھے گا اور یہ وہ

[1] فوائد هناد النسفي میں یہ حدیث موجود ہے۔ حافظ ابن حجر نے اسی کتاب سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اس کی سند منکر (ضعیف) ہے۔ تبيين العجب لابن حجر، ص: 119.
حافظ ابن عراق نے حافظ ابن حجر کی موافقت کی ہے۔ تنزيه الشريعة لابن عراق: 116/2، حديث: 41.

دن ہے جس میں جبرئیل علیہ السلام محمد عربی ﷺ کے لیے پیغمبری لے کر نازل ہوئے۔ [1]

حضرت سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اللہ تعالیٰ کے محبوب، دانائے غیوب، منزہ عن العیوب ﷺ کا فرمان عالی شان ہے: ''رجب میں ایک دن اور رات ہے جو اس دن روزہ رکھے اور رات کو قیام (عبادت) کرے تو گویا اس نے سو سال کے روزے رکھے اور یہ رجب کی ستائیس تاریخ ہے۔ اسی دن محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا۔'' (شعب الایمان، جلد 3، ص: 374، رقم الحدیث: 3811) [2]

حضرت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیوں کے سالار، بے کسوں کے مدد گار، شفیع روز شمار ﷺ کا فرمان مشکبار ہے: ''رجب میں ایک رات ہے کہ اس میں نیک عمل کرنے والے کو سو برس کی نیکیوں کا ثواب ہے اور وہ رجب کی ستائیسویں

[1] فضائل شهر رجب للخلال، حدیث: 18. اس کی سند میں شہر بن حوشب صدوق راوی ہے مگر کثیر الإرسال و الأوهام ہے۔ مطر بن طهمان صدوق کثیر الخطاء ہے۔ یہی اثر إحياء علوم الدين للغزالي: (217/1) اور اس کی شرح أتحاف السادة المتقين للعلامة مرتضى زبيدي: (207/5) میں مرفوعاً مروی ہے۔ علامہ زبیدی حافظ عراقی کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ اس حدیث کو ابو موسیٰ المدینی نے کتاب فضائل الليالي والأيام میں بیان کیا ہے۔ جب تک اس کی سند سامنے نہیں آجاتی تب تک یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ اسے مرفوع بیان کرنا کسی راوی کی غلطی ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس حدیث کو موقوفاً ذکر کیا ہے۔ دیکھیے: تبيين العجب، ص: 119. ان سے حافظ ابن عراق نے اسی طرح نقل کیا ہے۔ دیکھیے: تنزيه الشريعة: 161/2۔ بہر حال اگر یہ موقوف بھی ہو تو تب بھی ضعیف ہے۔

[2] خالد بن ہیاج اور اس کا باپ ہیاج بن بسطام دونوں ضعیف راوی ہیں۔ ہیاج کو امام احمد نے متروک الحدیث اور امام ابوداود نے تركوا حديثه (محدثین نے اس سے احادیث لینا چھوڑ دیں) کے ساتھ جرح کی ہے۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے بھی اسے منکر قرار دیا ہے۔ تبيين العجب لابن حجر، ص: 53. حافظ ابن عراق حافظ ابن حجر کے مؤید ہیں۔ تنزيه الشريعة: 161/2، حديث: 41.

شب ہے۔ جو اس میں بارہ رکعت پڑھے۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورت اور ہر رکعت میں التحیات اور آخر میں سلام پھیرنے کے بعد سو بار:

«سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ»

سو بار استغفار اور سو بار درود پاک پڑھے اور اپنی دنیا اور آخرت سے جس چیز کی چاہے، دعا مانگے اور صبح کو روزہ رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کی سب دعائیں قبول فرمائے گا سوائے اس دعا کے جو گناہ کے لیے ہو۔'' (شعب الایمان، ج: 3، ص: 374، رقم الحدیث: 3812)[1]

3 رجب اور معراج کے (من گھڑت) فضائل و برکات

نوٹ: گزشتہ صفحات میں واضح کیا جاچکا ہے کہ رجب اور شب معراج کی کوئی فضیلت کسی صحیح حدیث میں بیان نہیں ہوئی، جتنے بھی فضائل ان کے بیان کیے جاتے ہیں، وہ سب من گھڑت ہیں۔ انھی من گھڑت فضائل پر یہ تیسرا مضمون بھی ہے جو محمد سرفراز خاں کا تحریر کردہ ہے، یہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ماہ رجب نہایت رحمتوں، برکتوں، بخششوں اور عظمتوں کا مہینہ ہے۔ رجب کو رب کائنات کا مہینہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ رحمت دو عالم نور مجسم ﷺ کا فرمان عالی شان ہے کہ رجب اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے اور رمضان المبارک میری امت کا مہینہ ہے جو شخص ماہ رجب میں روزہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو جنت میں ایک دریا ہے جس کو رجب کہا جاتا ہے اس کا پانی دودھ سے بھی زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے، کا

[1] اس کی سند میں محمد بن الفضل بن عطیہ کذاب راوی ہے۔ امام بیہقی نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو مظلم قرار دیا ہے۔ تبیین العجب لابن حجر، ص: 118.

پانی پلائے گا۔

رجب کا مہینہ اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے جس بندے یا بندی نے اس کا احترام کیا اللہ تعالیٰ اس کا احترام فرمائے گا۔ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب رجب کی پہلی شب آتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرا مہینہ ہے اور بندے بھی میرے ہیں اور رحمت بھی میری ہے جو کوئی مجھ کو پکارے گا میں اس کی پکار سنوں گا اور جو کچھ مانگے گا میں اس کو عطا فرماؤں گا اور جو مغفرت چاہے گا اس کی مغفرت فرما دوں گا، رحمت میری وسیع ہے اور میں ارحم الراحمین ہوں۔'' نیز فرمایا: ''پورے ماہ میں کسی شخص نے ایک روزہ صدق دل سے رکھا تو گویا اس شخص نے ہزار برس کے روزے رکھے۔'' حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جنت میں ایک محل ہے جس میں رجب کے روزہ داروں کے علاوہ کوئی نہیں جائے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول مبارک ہے کہ غم خوار امت ﷺ نے رمضان المبارک کے روزوں کے بعد سوائے رجب اور شعبان کے کسی مہینہ کے روزے پورے نہیں رکھے۔

پیغمبرِ خدا ایک دفعہ ایک شخص کی قبر پر پہنچے تو اس مردے نے چیخنا شروع کر دیا: یا رسول اللہ! مجھ کو دوزخ کی آگ جلائے ڈالتی ہے اور میرا کفن آگ کا ہوگیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اگر رجب میں تو ایک روزہ بھی رکھ لیتا تو ہرگز یہ آگ تیرے پاس نہ آتی نہ یہ عذاب ہوتا۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس نے رجب میں توبہ کی تو اس کے لیے جنت کا مژدہ ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا فرمان عالی شان ہے: ''جس نے رجب کے سات روزے رکھے اس بندہ پر دوزخ کے سات دروازے بند ہوگئے جس نے آٹھ روزے رکھے'' اللہ تعالیٰ'' اس کے لیے آٹھوں دروازے جنت کے کھول دے گا۔ جس نے نو روزے رکھے تو

جب وہ قبر سے اٹھے گا تو کلمہ پڑھتا ہوا اٹھے گا۔ جس نے دس روزے رکھے اللہ تعالیٰ اس کے دو سبز بازو بنائے گا جس پر یاقوت اور موتی جڑے ہوں گے۔ ان بازوؤں کے ذریعے سے وہ پل صراط سے ایسا اڑے گا جیسے بجلی گزر جاتی ہے۔ جس نے گیارہ روزے رکھے تو روز قیامت اس شخص سے افضل کوئی نہ ہوگا۔ جو شخص رجب کے تمام روزے رکھے گا اور اسی سال فوت ہوا تو شہید ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔''

27 رجب کی شب مبارک ہے جس میں رب کائنات نے اپنے لاڈلے محبوب کو مسجد اقصیٰ تک سیر کروائی۔ اس سفر مبارک کو جدید سائنس نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس سفرِ عظیم کو تسلیم نہ کرنے والے عقل کے اندھے ہیں۔ جس سواری کو حضور پرنور کے لیے منتخب کیا اسے براق کہتے ہیں جس کے معنی بجلی کے ہیں۔ بجلی کی رفتار 2 لاکھ 86 ہزار میل فی سیکنڈ ہے جس بجلی کی رفتار اتنی زیادہ ہے اور جس کو انسان نے ایجاد کیا ہے مگر وہ براق جسے رب کائنات نے بنایا اور اپنے لاڈلے نبی کی سواری کے لیے منتخب کیا اس کی تیز رفتاری سے انکار کیسے کیا جاسکتا ہے۔

شب معراج کی خصوصی عبادات

جو شخص اس شب مبارکہ میں عبادت الٰہی میں مشغول رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے دل کو مردہ نہیں کرے گا اور اس دن مرے گا جس دن خوف قیامت سے لوگوں کے دل مردہ ہوجائیں گے، جو کوئی 27 ویں رجب کو شب بیداری کرے گا اس کی قبر فراخ ہوگی 70 دروازے جنت کے اس کے لیے کھول دیے جائیں گے۔
حضرت سلمان فارسی کا قول مبارک ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس

شب عبادت کرے گا اور اگلے دن روزہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے نامۂ اعمال میں 100 برس کی عبادت اور سو برس کے روزوں کا ثواب لکھے گا۔

بارہ رکعت نماز نفل پڑھیں دو دو یا چار چار کر کے پڑھیں کسی خاص سورت کی قید نہیں اور بارہ رکعات پڑھنے کے بعد 100 مرتبہ «أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّي مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ» اور 100 مرتبہ درود شریف پڑھے اور روزہ رکھے جو شخص یہ کرے گا جو چاہے وہ پائے گا۔ اس کے نامۂ اعمال میں ہر رکعت کے بدلے حج اور عمرے کا ثواب لکھا جائے گا اور اس کے بارہ برس کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور جنت پائے گا۔

نور مجسم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس رات چھ رکعات نماز نفل ادا کرے۔ ہر رکعت میں بعد از سورۂ فاتحہ سورۂ اخلاص سات سات مرتبہ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو بخش دے گا اور ہر رکعت کے بدلے 27 برس کی عبادت کا ثواب ملے گا اور وہ جنت میں جائے گا۔

جب سرور کائنات ﷺ معراج پر تشریف لے کر گئے تو تمام انبیاء نے آپ ﷺ کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ آپ ﷺ نے امامت میں دو رکعت نماز نفل ادا کی۔ پہلی رکعت میں سورۂ فیل اور دوسری رکعت میں سورۂ قریش پڑھی، پس جو شخص یہ دو رکعت نماز نفل اس طریقہ سے ادا کرے گا اسے انبیاء کے گروہ کی موافقت کا ثواب عطا فرمائے گا۔

اس شب مبارکہ میں قرآن پاک کی تلاوت، درود شریف کی کثرت اور اپنے گناہوں پر آنسو بہانا چاہیے۔ اس شب صلاۃ التسبیح پڑھنا بھی نہایت مستحسن ہے۔ رب کعبہ سے دلی دعا ہے کہ وہ ہمیں اس شب مبارکہ کی خصوصی برکات سے سرفراز فرمائے۔'' [1]

[1] ''نوائے وقت'' لاہور، 10 اگست 2008ء۔

ملحوظہ: اس مضمون میں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے جتنے بھی فضائل بیان کیے گئے ہیں، کسی بھی صحیح حدیث میں وہ بیان نہیں ہوئے ہیں، اس لیے یہ سب فضائل خود ساختہ اور بے بنیاد ہیں۔

4 عباداتِ شبِ معراج

نوٹ: یہ چوتھا مضمون بھی گزشتہ مضامین کی طرح من گھڑت روایات پر مبنی ہے جو خالدہ جمیل کا تحریر کردہ ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''27 رجب کی رات اور دن کی فضیلت اور مسنون عبادات، 27 رجب کی رات کو حضور اکرم ﷺ کو معراج ہوا اس رات کی فضیلت کے متعلق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے 27 رجب کا روزہ رکھا اس کو ساٹھ مہینوں کے روزوں کا ثواب ملے گا۔ بروایت ابو مسلم حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ماہ رجب میں ایک دن اور ایک رات ایسی ہے کہ اگر اس دن کا کوئی روزہ رکھے اور اس رات کو عبادت کرے تو اس کو ایک سو برس روزے رکھنے والے اور سو سال رات کی عبادت کرنے والے کے برابر اجر ملے گا۔ یہ رات وہ ہے جس کے بعد رجب کی تین راتیں رہ جاتی ہیں (یعنی ستائیسویں شب) اور یہ وہ دن ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے رسول مقبول ﷺ کو رسالت عطا فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا معمول تھا کہ جب ستائیسویں رجب آتی تو وہ اعتکاف میں بیٹھے ہوتے تھے اور بعد نماز ظہر نفل پڑھنے میں مشغول ہوجاتے اس کے بعد وہ چار رکعتیں پڑھتے اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ ایک مرتبہ، سورۃ القدر تین بار اور سورۂ اخلاص پچاس مرتبہ پڑھتے تھے، پھر عصر تک دعاؤں میں مشغول رہتے۔ انھوں

نے فرمایا: سرور کونین ﷺ کا یہی معمول تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص رجب کی ستائیسویں کو بارہ رکعت نفل کی نیت اس ترکیب سے پڑھے کہ سورۂ فاتحہ کے بعد تین مرتبہ سورۃ القدر اور بارہ دفعہ سورۂ اخلاص اور اس کے بعد نوافل سے فارغ ہو کر ایک بار درود شریف اور تین مرتبہ «سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ» ایک سو بار درود شریف اور سو بار «أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّي مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَخَطِيئَةٍ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ» اور سو بار تسبیح، یعنی تیسرا کلمہ شریف پڑھے اور اپنے لیے، اپنے ماں باپ کے لیے اور تمام مسلمان مرد وزن کے لیے دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے پانچ نعمتیں عطا فرماتا ہے، یعنی مخلوق کا عمر بھر محتاج نہ ہوگا، ایمان پر خاتمہ ہوگا، اس کی قبر کشادہ کردی جائے گی، جنت کی ہوائیں اسے ملتی رہیں گی، اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوگا۔''[1]

دوبارہ وضاحت

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہے کہ مذکورہ چاروں مضامین روزنامہ اخبارات سے نقل کیے گئے جن کے حوالے بھی ساتھ دے دیے گئے ہیں۔ ان کو نقل کرنے سے مقصود اس بات کی وضاحت ہے کہ ایک مذہبی طبقہ من گھڑت فضائل بیان کرنے میں بڑا دلیر ہے حالانکہ یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس پر جہنم تک کی وعید بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح اخبارات کے مدیران و مالکان بھی دین سے بے خبر عوام کو خوش کرنے اور دنیا کا مال کمانے کے لیے ان بے بنیاد مضامین کو شائع کر دیتے ہیں۔ مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ وضاحتی مضمون شائع کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ نتیجہ اس ملی بھگت کا یہ نکل رہا

[1] روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور، 10 اگست 2007ء۔

ہے کہ عوام انھی من گھڑت چیزوں کو، جو قرآن واحادیث صحیحہ میں نہیں ہیں، دین سمجھ رہے ہیں اور اصل دین سے بے خبر ہیں بلکہ اصل دین پر عمل کرنے والوں کو (نعوذ باللہ) بے دین سمجھ رہے ہیں، فَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى.
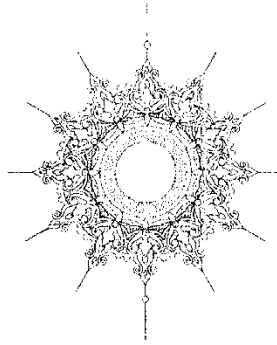
٨
شعبان
فضائل و اعمال اور رسومات

شعبان

شعبان اسلامی سال کا آٹھواں مہینہ ہے، جو رجب کے بعد اور رمضان المبارک سے پہلے آتا ہے۔

وجہ تسمیہ

اس کا مادہ شَعب ہے جس کے معنی جدا جدا ہونے کے ہیں۔ عرب اس مہینے میں پانی کی تلاش میں متفرق طور پر پھیل جاتے تھے، اس لیے اس مہینے کا نام شعبان پڑ گیا۔

«سُمِّيَ بِذٰلِكَ لِتَشَعُّبِ الْعَرَبِ فِيهِ أَيْ تَفَرُّقِهِمْ فِي طَلَبِ الْمِيَاهِ»

(المنجد)

فضیلت ماہِ شعبان

شعبان وہ مبارک مہینہ ہے جس میں نبی کریم ﷺ رمضان کے علاوہ تقریباً پورے مہینے کے روزے رکھتے تھے۔ صرف آخر میں دو ایک روزے ترک فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں متعدد حدیثیں آتی ہیں جن میں صوم شعبان کی فضیلت اور نبی کریم ﷺ کے بالخصوص اس ماہ میں بکثرت روزے رکھنے کا بیان ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ روزے رکھتے تھے یہاں تک کہ ہم کہتے کہ آپ روزے نہیں چھوڑتے، پھر روزے چھوڑتے یہاں تک کہ ہم کہتے کہ

آپ روزے نہیں رکھتے۔ اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی کسی مہینے کے مکمل روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا سوائے رمضان المبارک کے اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو شعبان سے زیادہ کسی مہینے میں روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ [1]

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«كَانَ أَحَبَّ الشُّهُورِ إِلٰى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يَّصُومَهُ شَعْبَانُ ثُمَّ يَصِلُهُ بِرَمَضَانَ»

"رسول اللہ ﷺ کو (نفلی) روزوں کے لیے سب سے محبوب مہینہ شعبان تھا، پھر آپ اسے گویا رمضان ہی سے ملا دیا کرتے تھے۔" [2]

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

«مَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَصُومُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ إِلَّا شَعْبَانَ وَ رَمَضَانَ»

"میں نے نبی کریم ﷺ کو دو مہینے مسلسل روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا سوائے شعبان اور رمضان کے۔" [3]

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«مَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي شَهْرٍ أَكْثَرَ صِيَامًا مِنْهُ فِي شَعْبَانَ، كَانَ يَصُومُهُ إِلَّا قَلِيلًا، بَلْ كَانَ يَصُومُهُ كُلَّهُ»

[1] صحيح البخاري، الصوم، باب صوم شعبان، حديث: 1969، وصحيح مسلم، الصيام، باب صيام النبي ﷺ في غير رمضان......، حديث: 1156. [2] سنن أبي داود، الصيام، باب في صوم شعبان، حديث: 2431. [3] جامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء في وصال شعبان برمضان، حديث: 736.

''میں نے نبیِ کریم ﷺ کو شعبان سے زیادہ کسی مہینے میں روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا، بلکہ آپ سارے شعبان کے روزے رکھتے تھے۔''[1]

شعبان میں کثرت سے روزے رکھنے کی حکمت

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے ایک روز سوال کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ماہ شعبان میں جس قدر (نفلی) روزے رکھتے ہیں، کسی اور مہینے میں اتنے روزے نہیں رکھتے؟ (یہ کیا بات ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا:

«ذٰلِكَ شَهْرٌ يَغْفُلُ النَّاسُ عَنْهُ بَيْنَ رَجَبٍ وَرَمَضَانَ، وَهُوَ شَهْرٌ تُرْفَعُ فِيهِ الْأَعْمَالُ إِلٰى رَبِّ الْعَالَمِينَ فَأُحِبُّ أَنْ يُّرْفَعَ عَمَلِي وَأَنَا صَائِمٌ»

''یہ مہینہ رجب اور رمضان کے درمیان ہے، لوگ اس سے غفلت برتتے ہیں۔ اس مہینے میں (لوگوں کے) عمل رب العالمین کے حضور پیش کیے جاتے ہیں اور میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میرے عمل جب اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوں تو اس وقت میں روزے سے ہوں (اس لیے شعبان میں روزے کثرت سے رکھتا ہوں۔)''[2]

اس حدیث سے شعبان میں نبیِ اکرم ﷺ کے بکثرت روزہ رکھنے کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ اس مہینے میں بالخصوص اعمال اللہ کی بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں۔ احادیث کے تَتَبُّع سے معلوم ہوتا ہے کہ عملوں کی ایک پیشی تو روزانہ صبح و شام (نمازِ عصر اور نمازِ

[1] جامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء في وصال شعبان برمضان، حديث: 736. [2] سنن النسائي، الصيام، باب صوم النبي ﷺ بأبي هو وَ أمي......، حديث: 2359.

فجر کے وقت) ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرشتوں سے جو فجر وعصر کی نماز میں حاضر رہتے ہیں، جب آسمان پر جاتے ہیں تو پوچھتا ہے:

«كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِي؟ فَيَقُولُونَ: تَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّونَ، وَأَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّونَ»

''تم میرے بندوں کو کس حالت میں چھوڑ کر آئے ہو؟ فرشتے کہتے ہیں: یا اللہ! جب ہم انھیں چھوڑ کر آرہے تھے، تب بھی وہ نماز میں مشغول تھے اور جب ہم ان کے پاس پہنچے، تب بھی نماز پڑھ رہے تھے۔''[1]

دوسری پیشی ہفتے میں دو دن کی ہے، یعنی ہر پیر اور جمعرات کو اللہ کی بارگاہ میں اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تُعْرَضُ الْأَعْمَالُ يَوْمَ الِاثْنَيْنِ وَالْخَمِيسِ فَأُحِبُّ أَنْ يُّعْرَضَ عَمَلِي وَأَنَا صَائِمٌ»[2]

اور تیسری پیشی، جو گویا سالانہ پیشی ہے، ماہِ شعبان میں ہوتی ہے جیسا کہ مذکور الصدر حدیث سے معلوم ہوا۔ اور جس کی وجہ ہی سے نبی اکرم ﷺ اس ماہ میں کثرت سے روزے رکھتے تھے۔

کثرت سے روزے رکھنے میں احتیاط کی ضرورت

گزشتہ تفصیل سے واضح ہے کہ شعبان میں نفلی روزے کثرت سے رکھنا نبی ﷺ کا

[1] صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب فضل صلاة العصر، حديث: 555، وصحيح مسلم، المساجد، باب فضل صلاتي الصبح والعصر......، حديث: 632. [2] جامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء في صوم......، حديث: 747.

معمول تھا، تاہم آپ نے اپنی امت کے لوگوں کو نصف شعبان کے بعد روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے:

«إِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلَا تَصُومُوا» [1]

اس ممانعت سے مقصود یہ ہے کہ طاقت، توانائی بحال رہے تاکہ رمضان کے فرضی روزے رکھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

اسی طرح آپ نے رمضان سے ایک دو دن پہلے روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے تاکہ استقبالِ رمضان کے نام پر لوگ جشن کی سی کیفیت نہ بنالیں، آپ نے فرمایا:

«لَا تَقَدَّمُوا صَوْمَ رَمَضَانَ بِيَوْمٍ وَّلَا يَوْمَيْنِ إِلَّا أَنْ يَّكُونَ صَوْمٌ يَصُومُهُ رَجُلٌ فَلْيَصُمْ ذٰلِكَ الصَّوْمَ»

''رمضان سے ایک دو دن پہلے روزے مت رکھو، مگر جو شخص کسی دن کا روزہ رکھتا رہا ہو تو وہ رکھ لے۔'' [2]

یعنی کسی کا معمول ہے کہ وہ ہر پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتا ہے یا صومِ داؤدی رکھتا ہے تو یہ روزے اگر رمضان سے دو تین دن قبل واقع ہوں، تو وہ یہ روزے رکھ سکتا ہے کیونکہ اس سے مقصود استقبالِ رمضان نہیں ہے بلکہ روز مرہ کے معمولات کو پورا کرنا ہے، اس لیے یہ ممانعت کے حکم میں نہیں آئیں گے۔

سَرَرِ شعبان کا روزہ اور اس کا مطلب

یہی مطلب اس حدیث کا ہے جس میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص سے

[1] سنن أبي داود، الصيام، باب في كراهية ذلك، حديث: 2337. [2] سنن أبي داود، الصيام، باب فيمن يَصِلُ شعبان برمضان، حديث: 2335.

پوچھا: «هَلْ صُمْتَ مِنْ سَرَرِ هٰذَا الشَّهْرِ شَيْئًا؟» ''کیا تو نے اس (شعبان کے) مہینے کے آخری دنوں کے کچھ روزے رکھے ہیں؟'' اس نے کہا: نہیں تو آپ نے اس سے فرمایا: ''رمضان کے بعد تو اس کے بدلے میں ایک یا دو روزے رکھ لینا۔''[1]

یہ شخص بھی مہینے کے آخر میں روزے رکھنے کا عادی تھا یا اس نے نذر کے روزے رکھنے تھے لیکن اس نے اس اندیشے کے پیش نظر نہیں رکھے کہ کہیں میرا یہ عمل استقبال رمضان کا مظہر نہ بن جائے جس سے روکا گیا ہے۔ لیکن نبی ﷺ نے وضاحت فرما دی کہ یہ ممانعت ان لوگوں کے لیے ہے جو عادی نہ ہوں یا جن کی طاقت اور توانائی میں کمی آنے کا خطرہ ہو یا محض شک کی وجہ سے روزہ رکھتے ہوں مبادا رمضان شروع ہو گیا ہو۔ ایسے تمام لوگوں کے لیے شعبان کے آخر میں روزے رکھنے ممنوع ہیں تاکہ رمضان کے روزے رکھے جا سکیں۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے ان روزوں کا جواز ہے۔

ملحوظہ: سَرَر کا لفظ مہینے کے آخری ایام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اِسْتِسْرار (چھپ جانا) سے ہے۔ مہینے کے آخری دنوں میں چونکہ چاند چھپ جاتا ہے، اس لیے مہینے کے آخری دنوں کو سَرَر سے تعبیر کر لیا جاتا ہے۔

شب برات، یعنی شعبان کی پندرھویں رات

شعبان کی پندرھویں رات کی بابت متعدد روایات آتی ہیں، جن میں اس رات کی بعض فضیلتوں کا ذکر ہے لیکن یہ روایات، ایک آدھ روایت کے علاوہ، سب ضعیف ہیں۔ لیکن چونکہ یہ کثرتِ طُرق سے مروی ہیں، اس لیے بعض علماء اس بات کے قائل

[1] صحیح مسلم، الصیام، باب صوم سرر شعبان، حدیث: 1161.

ہیں کہ اس رات کی کچھ نہ کچھ اصل ہے، بنا بریں اس رات کی کچھ نہ کچھ فضیلت ضرور ہے۔ اور دوسرے علماء کی رائے میں ضعیف روایات قابل عمل نہیں، چاہے وہ تعداد میں کتنی ہی ہوں۔ ان علماء کے نزدیک اس رات کی کوئی خاص اصل نہیں۔

چنانچہ علامہ البانی رحمہ اللہ اور شعیب ارناؤوط رحمہ اللہ وغیرہ نے کثرت طرق کی بنا پر اس ایک روایت کو صحیح قرار دیا ہے جبکہ باقی سب روایات ضعیف یا موضوع ہیں، وہ ارشاد گرامی درج ذیل ہے:

«يَطَّلِعُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى إِلٰى خَلْقِهٖ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ، فَيَغْفِرُ لِجَمِيعِ خَلْقِهٖ، إِلَّا لِمُشْرِكٍ أَوْمُشَاحِنٍ»

”اللہ تعالیٰ شعبان کی پندرھویں رات کو اپنی پوری مخلوق کی طرف (نظر رحمت سے) دیکھتا ہے، پھر مشرک اور کینہ پرور کے سوا باقی ساری مخلوق کی بخشش کر دیتا ہے۔“[1]

جبکہ ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کے طریق سے اسی روایت کے الفاظ درج ذیل ہیں:

«إِنَّ اللّٰهَ يَطَّلِعُ عَلٰى عِبَادِهٖ فِي لَيْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ، فَيَغْفِرُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَيُمْلِي لِلْكَافِرِينَ، وَيَدَعُ أَهْلَ الْحِقْدِ بِحِقْدِهِمْ حَتّٰى يَدَعُوهُ»

”بے شک اللہ تعالیٰ شعبان کی پندرھویں رات کو اپنے بندوں پر رحمت کی نظر ڈالتا ہے، پھر مومنوں کو معاف کر دیتا اور کافروں کو ڈھیل دے دیتا ہے۔ اور کینہ پرور

[1] صحيح ابن حبان، حديث: 1980، وشعب الإيمان للبيهقي: 288/2، والسلسلة الصحيحة، حديث: 1144.

لوگوں کو چھوڑ دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے دلوں کو کینہ سے پاک کر لیں۔“[1]

یہی وہ حدیث ہے جو شعبان کی پندرھویں رات کی فضیلت میں بقول شیخ البانی مسند ہے، اس کے علاوہ جتنی احادیث عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جنھیں اخبارات اور محفلوں کی زینت بنایا جاتا ہے وہ سب کی سب سنداً انتہائی کمزور بلکہ من گھڑت ہیں۔

اور صحیح الجامع الصغیر کی حدیث سے بھی صرف اس رات کی فضیلت ثابت ہوتی ہے لیکن اس میں بھی اس رات کو عبادت کرنے کی کوئی ترغیب یا فضیلت نہیں ہے اور کسی فضیلت سے اس رات کا خصوصی عبادت والی رات ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس کے لیے الگ نص کی ضرورت ہے جو موجود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں شیخ البانی کے علاوہ دوسرے محققین کے نزدیک یہ روایت بھی ضعیف ہے۔

ضعیف اور موضوع روایات

شب برات کی نسبت سے جو کمزور اور من گھڑت حدیثیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

1. ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «شَعْبَانُ شَهْرِي، وَرَمَضَانُ شَهْرُ اللّٰهِ» یہ روایت موضوع ہے۔[2]

2. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر موجود نہ پا

[1] المعجم الکبیر للطبرانی: 109,108/20، حدیث: 215. [2] حافظ سخاوی وغیرہ نے اسے مسند الفردوس کی طرف منسوب کیا ہے۔ دیکھیے: المقاصد الحسنۃ، حدیث: 595. محدث البانی نے اس کا حوالہ یوں (234,233/2) ذکر کیا ہے۔ مگر تلاش کے بعد مسند الفردوس میں یہ روایت مل نہیں سکی۔ واللہ أعلم۔ اس کی سند حسن بن یحییٰ الخشنی کی وجہ سے سخت ضعیف ہے۔ محدث البانی کا بھی یہی فیصلہ ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: السلسلۃ الضعیفۃ: 222/8، حدیث: 3746.

کر میں باہر نکلی تو اچانک دیکھا کہ آپ بقیع قبرستان میں تھے، آپ نے مجھے دیکھ کر فرمایا: ''کیا تمھیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ تم پر ظلم کریں گے؟'' میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے یہ شک ہوا تھا کہ شاید آپ کسی اور بیوی کے پاس چلے گئے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَنْزِلُ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا، فَيَغْفِرُ لِأَكْثَرَ مِنْ عَدَدِ شَعْرِ غَنَمِ كَلْبٍ»

''بے شک اللہ تعالیٰ شعبان کی پندرھویں رات کو آسمان دنیا پر آتا ہے، پھر اتنے لوگوں کی مغفرت کرتا ہے جتنے بنو کلب کی بکریوں کے بال ہیں۔''[1]

دیگر ائمہ کے علاوہ خود امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے اور اس روایت کی تضعیف امام بخاری رحمہ اللہ سے بھی نقل کی ہے۔ یہ روایت نقل کرنے کے بعد اس کے ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد محمد بن اسماعیل بخاری سے سنا، وہ فرماتے تھے: یہ روایت ضعیف ہے۔ اس روایت کو حجاج بن ارطاۃ نے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کیا، حالانکہ حجاج کا یحییٰ سے سماع ثابت نہیں بلکہ زندگی میں ان سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ پھر یحییٰ اس روایت کو عروہ سے نقل کر رہے ہیں جبکہ یحییٰ کا سماع عروہ سے ثابت نہیں۔ اس طرح یہ روایت دو جگہ سے منقطع ہے۔ دو جگہ سے منقطع روایت محدثین کی اصطلاح میں شدید درجہ کی ضعیف روایت ہے۔[2]

[1] جامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء في ليلة النصف من شعبان، حديث: 739، وسنن ابن ماجه، الصلوات، باب ماجاء في ليلة النصف مِن شعبان، حديث: 1389، ضعفه الألباني.

[2] مستزاد یہ کہ حجاج اور یحییٰ دونوں مدلس راوی ہیں۔ امام حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت کو یحییٰ بن ابی کثیر کی مرسل روایت کی بنا پر منکر اور غیر محفوظ قرار دیا ہے۔

یاد رہے کہ قصۂ عائشہ رضی اللہ عنہا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بقیع میں جانے اور اہلِ بقیع کے لیے دعا کرنے کے متعلق ہے وہ صحیح ہے اور صحیح مسلم وغیرہ میں تفصیلاً موجود ہے لیکن اس میں شعبان کی پندرھویں رات کا کوئی ذکر نہیں، مکمل واقعہ کے لیے دیکھیے: صحيح مسلم، الجنائز، باب مايقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، حديث: 974.

3 حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا كَانَتْ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ، فَقُومُوا لَيْلَتَهَا وَصُومُوا يَوْمَهَا، فَإِنَّ اللّٰهَ يَنْزِلُ فِيهَا لِغُرُوبِ الشَّمْسِ إِلٰى سَمَاءِ الدُّنْيَا، فَيَقُولُ: أَلَا مُسْتَغْفِرٌ فَأَغْفِرَ لَهٗ؟ أَلَا مُسْتَرْزِقٌ فَأَرْزُقَهٗ؟ أَلَا مُبْتَلًى فَأُعَافِيَهٗ؟ أَلَا سَائِلٌ فَأُعْطِيَهٗ؟ أَلَا كَذَا أَلَا كَذَا؟ حَتّٰى يَطْلُعَ الْفَجْرُ»

''جب شعبان کی پندرھویں رات آئے تو اس میں قیام کیا کرو اور اس کے دن کا روزہ رکھا کرو کیونکہ اس رات کی شام سے ہی اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر آکر فرماتا ہے: کیا کوئی مغفرت طلب کرنے والا ہے کہ میں اس کو معاف کر دوں؟ کیا کوئی رزق طلب کرنے والا ہے کہ میں اس کو رزق دوں؟ کیا کوئی بیمار ہے کہ میں اسے عافیت دوں؟ کیا کوئی سوال کرنے والا ہے کہ میں اسے دوں؟ کیا کوئی ...... کیا کوئی ...... یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔''[1]

یہ حدیث بھی موضوع اور من گھڑت ہے۔ اس کے بجائے بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے:

[1] سنن ابن ماجه، الصلوات، باب ماجاء في ليلة النصف من شعبان، حديث: 1388، وضعيف الجامع الصغير للألباني، حديث: 652، واللفظ له. علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے، دیکھیے: السلسلة الضعيفة: 154/5، حديث: 2132.

«يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالٰى كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا حِينَ يَبْقٰى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْآخِرُ، فَيَقُولُ: مَنْ يَّدْعُونِي فَأَسْتَجِيبَ لَهٗ؟ مَنْ يَّسْأَلُنِي فَأُعْطِيَهٗ؟ مَنْ يَّسْتَغْفِرُنِي فَأَغْفِرَلَهٗ» وَفِي رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ: «فَلَا يَزَالُ كَذٰلِكَ حَتّٰى يُضِيءَ الْفَجْرُ»

''ہمارا بابرکت اور بلند و بالا رب ہر رات کا جب آخری تہائی حصہ باقی ہوتا ہے تو وہ آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے، پھر کہتا ہے: کون ہے جو مجھ سے دعا مانگے تو میں اس کی دعا کو قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے سوال کرے تو میں اسے عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے معافی طلب کرے تو میں اسے معاف کر دوں؟'' مسلم کی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ ''پھر وہ بدستور اسی طرح رہتا ہے یہاں تک کہ فجر روشن ہو جاتی ہے۔''[1]

اس صحیح حدیث کے مطابق یہ فضیلت ہر رات نصیب ہو سکتی ہے، لہٰذا اسے شعبان کی پندرھویں رات کے ساتھ خاص کرنا یقیناً غلط ہے۔

4 حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شعبان کی پندرھویں رات کو دیکھا آپ کھڑے ہوئے اور چودہ رکعات نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص سورۂ فلق اور سورۂ ناس چودہ چودہ مرتبہ پڑھیں اور آیت الکرسی ایک مرتبہ پڑھی، جب آپ فارغ ہوئے تو میں نے آپ سے مذکورہ نماز کے بارے میں سوال کیا، تو آپ نے فرمایا:

«مَنْ صَنَعَ مِثْلَ الَّذِي رَأَيْتَ كَانَ لَهٗ كَعِشْرِينَ حَجَّةً مَّبْرُورَةً

[1] صحيح البخاري، التهجد، باب الدعاء و الصلاة مِن آخر الليل، حديث: 1145، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في الدعاء والذكر في آخر الليل......، حديث: 758.

وَكَصِيَامِ عِشْرِينَ سَنَةً مَّقْبُولَةً، فَإِنْ أَصْبَحَ فِي ذٰلِكَ الْيَوْمِ صَائِمًا كَانَ كَصِيَامِ سِتِّينَ سَنَةً مَا ضِيَةً وَ سَنَةً مُسْتَقْبَلَةً»

''جس نے ایسے کیا جیسے تو نے مجھے کرتے ہوئے دیکھا ہے تو اسے بیس مقبول حجوں کا ثواب اور بیس سال کے مقبول روزوں کا ثواب ہوگا اور اگر اس نے اس دن کا روزہ رکھا تو ساٹھ سالہ گزشتہ روزوں اور ایک سال آئندہ روزوں کا ثواب ہوگا۔''[1]

ابن جوزی نے اس حدیث کو ''الموضوعات'' میں روایت کرنے کے بعد لکھا ہے: یہ حدیث بھی من گھڑت ہے اور اس کی سند نہایت تاریک ہے۔

امام سیوطی کہتے ہیں کہ اس حدیث کو بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں روایت کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ عین ممکن ہے کہ یہ موضوع (من گھڑت) ہو۔[2]

5 حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے شعبان کی پندرھویں رات میں بارہ رکعات نماز ادا کی اور ہر رکعت میں تیس 30 مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھی تو وہ جنت میں اپنی جگہ دیکھ لیتا ہے اور اپنے اہل میں سے دس جہنمیوں کے بارے میں اس کی سفارش قبول کی جاتی ہے۔''[3]

امام ابن جوزی نے اس روایت کو ''الموضوعات'' میں ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ روایت موضوع (من گھڑت) ہے۔

6 الصلاة الألفية، یعنی وہ نماز جس کے بارے میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا: ''جو شخص اس رات میں سو رکعات نماز اس طرح پڑھے کہ ہر

[1] الموضوعات لابن الجوزي:52/2. [2] تنزيه الشريعة عن الأحاديث الموضوعة لابن عراق: 94/2. [3] الموضوعات لابن الجوزي:52,51/2.

رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ اخلاص گیارہ بار پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کی ہر حاجت پوری کر دیتا ہے، اگر وہ لوح محفوظ میں بدبخت لکھا گیا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے مٹا کر اسے خوش نصیب لکھ دیتا ہے ...... اور اس کے آئندہ ایک سال کے گناہ نہیں لکھے جاتے۔'' [1]

''الموضوعات'' میں ابن الجوزی اس حدیث کے مختلف طرق ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: اس حدیث کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں۔

یہ اور اس قسم کی دیگر احادیث جن میں شعبان کی پندرھویں رات کی عبادت کی فضیلت بیان کی گئی ہے بالاتفاق ضعیف اور من گھڑت ہیں۔ ائمۂ کرام، مثلاً: امام شوکانی، ابن الجوزی، ابن حبان، قرطبی اور سیوطی وغیرہم نے ان روایات کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: الفوائد المجموعة، الموضوعات الكبرىٰ، تفسير القرطبي، اللآلي المصنوعة، وغیرہ۔

شب برات میں کیا کرنا چاہیے؟

اب سوال یہ ہے کہ شعبان کی پندرھویں رات کی فضیلت کے متعلق جس حدیث کو بعض محققین نے صحیح قرار دیا ہے کہ (اللہ تعالیٰ شعبان کی پندرھویں رات کو اپنی پوری مخلوق کی طرف (بنظر رحمت) دیکھتا ہے، پھر مشرک اور کینہ پرور کے سوا باقی ساری مخلوق کی بخشش کر دیتا ہے۔)

آیا اس روایت کی روشنی میں ہمیں خوشی کا یا خصوصی عبادت کا اہتمام کرنا چاہیے؟ لیکن کیا اس میں کسی محفل کے جمانے کا ذکر ہے یا کسی خاص عبادت، چراغاں یا

[1] الموضوعات لابن الجوزي:51,50/2.

آتش بازی کا ذکر کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہر وہ شخص دے سکتا ہے جو خرافات اور من گھڑت روایات پر اعتماد کرنے کے بجائے رسول اللہ ﷺ کی صاف ستھری شریعت پر ایمان رکھتا ہو۔ اس حدیث کا اگر بنظر انصاف مطالعہ کیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں کسی محفل جمانے، عبادت کرنے، چراغاں اور آتش بازی وغیرہ کا ذکر نہیں، بلکہ جس چیز کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہے اللہ تعالیٰ کی عام مغفرت کا جس کا مستحق ہر وہ شخص ہے جو شرک اور کینہ پروری سے محفوظ ہے، لہٰذا اس رات کو عام بخشش کا مستحق بننے کے لیے ہر انسان کو چاہیے کہ اپنا عقیدہ شرک سے پاک کرے، اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے متعلق اپنا دل صاف رکھے اور کسی سے حسد، بغض اور کینہ نہ رکھے، یہ چیزیں انسان کی نجات کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔

نہایت افسوس کی بات ہے کہ شعبان کی پندرھویں رات کی جو فضیلت رسول اللہ ﷺ نے بیان کی کہ مشرک اور کینہ پرور کے علاوہ ہر مسلمان کی بخشش ہوتی ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے آپ کو ان گناہوں سے بچایا جاتا لیکن آج کا جاہل مسلمان الٹا اپنے آپ کو اس رات میں ان دونوں گناہوں میں ملوث کرتا ہے ایک طرف محافل کا انعقاد کر کے ان میں جھوٹی اور من گھڑت احادیث بیان کرنے کے علاوہ نعت خوان اور مقررین رسول اکرم ﷺ سے استغاثہ کرتے ہیں اور آپ کو مدد کے لیے پکارتے ہیں، یعنی دوسرے لفظوں میں کھلم کھلا شرک کرتے ہیں اور اللہ سے مغفرت کی بھی امید رکھتے ہیں اور دوسری طرف آتش بازی کے ذریعے سے اپنے ہی بھائیوں کو پریشان کر کے انسان دشمنی کا بھی ثبوت دیا جاتا ہے جس سے اس حدیث کی رو سے بچنا نہایت ضروری ہے، کیسی ستم ظریفی ہے کہ بخشش الٰہی سے محروم ہو جانے والے کام بھی کیے جائیں اور جہنم سے آزادی کے پروانے کی بھی امید رکھی جائے۔

شب براءت میں عبادت؟

یہ بھی سوال ہوسکتا ہے کہ اگر اس رات میں مغفرت کا ثبوت ملتا ہے تو پھر اس میں خصوصی عبادت میں کیا حرج ہے؟

اس کے دو جواب ہیں:

اولاً: اللہ تعالیٰ کی خصوصی بخشش کا ثبوت صرف پندرھویں شعبان کی رات کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہی خصوصی بخشش سوموار اور جمعرات کے دن بھی ہوتی ہے، جیسے پیچھے صحیح حدیث ذکر کی جاچکی ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کو بخشنے کے لیے ہر رات پہلے آسمان پر نزول فرما کر ندا لگاتا ہے، اس لیے ایک مسلمان کو تو ہر رات ہی اللہ کی عبادت کے لیے اہتمام کرنا چاہیے، نہ کہ خصوصی طور پر صرف شعبان کی پندرھویں رات کو جس کا کوئی ثبوت بھی نہیں۔

ثانیاً: شعبان کی پندرھویں رات میں نبی ﷺ سے کوئی خصوصی عبادت ثابت نہیں ہے اور جو روایات نبی ﷺ کی طرف منسوب کرکے بیان کی جاتی ہیں، وہ سب من گھڑت اور موضوع ہیں جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے، لہٰذا اپنی طرف سے کسی دن یا رات یا کسی بھی وقت کو عبادت کے ساتھ خاص کرنے سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَخْتَصُّوا لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ بِقِيَامٍ مِّنْ بَيْنِ اللَّيَالِي وَلَا تَخُصُّوا يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِيَامٍ مِّنْ بَيْنِ الْأَيَّامِ إِلَّا أَنْ يَّكُونَ فِي صَوْمٍ يَصُومُهُ أَحَدُكُمْ»

”راتوں میں سے صرف جمعے کی رات کو قیام کے لیے اور دنوں میں سے صرف

جمعے کے دن کو روزہ کے لیے خاص نہ کرو۔ ہاں اگر جمعے کا دن ان دنوں میں آجائے جن میں تم میں سے کوئی روزہ رکھنے کا عادی ہو تو اس کا روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔''[1]

اگر کسی رات کو عبادت کے ساتھ خاص کیا جاسکتا ہوتا تو جمعہ کی رات ہفتے کے دنوں میں سے افضل ترین تھی، لہٰذا اسے خاص کیا جاتا لیکن نبی ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے اور نبی ﷺ کی سیرت ہی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے، آپ نے اگر کسی دن یا رات کو عبادت کے لیے خاص کیا ہے تو اس کا حکم بھی دیا ہے اور اہتمام بھی فرمایا ہے، جیسے صحیح احادیث میں رمضان کی راتوں اور لیلۃ القدر کے بارے میں ہے کہ آپ نے قیام کیا اور اس کی فضیلت بیان کر کے لوگوں کو ترغیب بھی دلائی، لہٰذا اگر شعبان کی پندرھویں رات میں محافل جمانے، عبادت کرنے اور دوسرے افعال کرنے کی کوئی فضیلت ہوتی تو آپ اپنی امت کو ضرور مطلع فرماتے اور خود بھی اہتمام فرماتے کیونکہ آپ کا تو منصب ہی یہی تھا، آپ امت سے کوئی چیز چھپا نہیں سکتے تھے، ورنہ آپ ﴿ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ ﴾[2] کے مصداق ٹھہرتے، کہ آپ نے اپنی امت کو شریعت کے مکمل احکام نہیں پہنچائے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ ان بدعات و خرافات پر عمل کرتے ہیں نعوذ باللہ وہ نبی ﷺ کو گویا خائن ثابت کرتے ہیں، لہٰذا نبی ﷺ سے اس رات میں محافل اور عبادت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور نہ صحابہ و تابعین ہی کا عمل ملتا ہے تو پھر اس رات کو خصوصی عبادت والی رات کس طرح سمجھا جاسکتا ہے؟

[1] صحیح مسلم، الصیام، باب کراھة إفراد یوم الجمعة بصوم......، حدیث: 1144. [2] المآئدة 67:5.

کیا شب برات فیصلوں کی رات ہے؟

شب برات منانے والوں کا نظریہ ہے کہ یہ رات فیصلوں کی رات ہے۔ اور دلیل میں سورۂ دخان کی درج ذیل آیات مبارکہ پیش کرتے ہیں:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ○ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ○ ﴾

''یقیناً ہم نے اسے بابرکت رات میں اتارا ہے۔ بے شک ہم ڈرانے والے ہیں۔ اس رات میں ہر مضبوط کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ''بابرکت رات'' کا ذکر آیا ہے جس میں قرآن مجید کو اتارا گیا اور جس میں سال بھر میں ہونے والے واقعات کا فیصلہ کیا جاتا ہے، یہ حضرات اس ''بابرکت رات'' سے مراد شعبان کی پندرھویں رات لیتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا واقعتاً ''بابرکت رات'' سے مراد شعبان کی پندرھویں رات ہے یا کوئی اور رات مراد ہے۔

اگر ہم اس آیت کی تفسیر اپنی رائے اور منشاء کے مطابق کرنے کے بجائے خود قرآن مجید ہی سے تلاش کریں تو اس سوال کا جواب ہمیں مل جاتا ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے نزول کے متعلق صراحت سے فرمایا ہے:

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ﴾

''رمضان کے مہینے میں قرآن نازل کیا گیا۔''[2]

اور جس رات میں نازل کیا گیا اس کی صراحت بھی فرما دی کہ

[1] الدخان 44:3،4۔ [2] البقرة 2:185۔

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ﴾

''بے شک ہم نے اسے لیلۃ القدر میں نازل کیا۔''[1]

جو کہ رمضان المبارک کے آخری عشرے کی ایک رات ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے نزول قرآن کا مہینہ اور اس مہینے کی خاص رات جس میں نبی ﷺ پر قرآن کا نزول شروع ہوا یا لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر بیت العزت میں اتارا گیا، اس کی بھی صراحت فرما دی ہے، جسے دوسری جگہ لیلۂ مبارکہ بھی کہا گیا ہے، لیلۂ مبارکہ کی قرآنی تفسیر سے پتا چلتا ہے کہ یہ لیلۃ القدر ہی ہے جس میں قرآن اتارا گیا اور اسی میں سال بھر کے حادثات و وقائع کا فیصلہ بھی کیا جاتا ہے، جمہور مفسرین کا یہی موقف ہے۔ نص قرآنی کے مقابلے میں ضعیف روایات سے لیلۂ مبارکہ کی تفسیر پندرھویں شعبان کی رات سے کرنا جائز نہیں بلکہ باطل ہے، لہٰذا شعبان کی پندرھویں رات کو فیصلوں کی رات قرار دینا یکسر غلط ہے۔

پندرہ شعبان کا روزہ ثابت نہیں

سنن ابن ماجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت آتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

«إِذَا كَانَتْ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ، فَقُومُوا لَيْلَهَا وَصُومُوا نَهَارَهَا ...... الحديث»

''شعبان کی پندرھویں رات کو قیام، یعنی عبادت کرو اور دن میں روزہ رکھو......''[2]

[1] القدر 1:97. [2] سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب ما جاء في ليلة النصف......، حديث: 1388. محدث البانی نے بھی اسے موضوع قرار دیا ہے۔ دیکھیے: السلسلة الضعيفة للألباني: 154/5، حديث: 2132.

اس روایت کی بنا پر بہت سے لوگ شعبان کی پندرہ تاریخ کو روزہ رکھتے ہیں لیکن محدثین کے نزدیک یہ روایت پایۂ اعتبار سے بالکل ساقط ہے، اس میں ایک راوی ابوبکر بن ابی بسرہ ہے جو متہم بالکذب ہے، وہ موضوع حدیثیں بنایا کرتا تھا، اس لیے یہ روایت قطعاً قابل حجت نہیں، لہٰذا پندرہ شعبان کا روزہ بھی ثابت نہیں۔

البتہ صحیح حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ نبی ﷺ ہر مہینے کے ایام بیض (13، 14، 15 تاریخ) کے روزے رکھتے تھے۔ اس حدیث کی رو سے اگر کوئی شخص شعبان کے مہینے میں یہ تین روزے رکھ لے تو یہ سنت کے مطابق کام ہوگا، اس لیے روزہ رکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ صرف 15 شعبان کا ایک روزہ نہ رکھیں بلکہ تین روزے رکھیں، 13، 14، 15 شعبان کا۔ اور ان روزوں کو بھی شعبان کے ساتھ خاص نہ کیا جائے۔

حلوے مانڈے، آتش بازی اور غلط عقیدے

شعبان کی پندرھویں رات کو اور بھی بعض کام ایسے کیے جاتے ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں، جیسے حلوے مانڈوں کا خصوصی اہتمام۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس روز مُردوں کی روحیں آتی ہیں، حالانکہ یہ عقیدہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کیونکہ اگر دنیا سے جانے والے اللہ کے نافرمان ہیں تو وہ اللہ کے ہاں قیدی ہیں، وہ اللہ کی قید سے نکل کر آہی نہیں سکتے۔ اور اگر وہ نیک تھے تو وہ اللہ کے ہاں مہمان ہیں اور اللہ نے ان کے لیے جنت میں بہترین نعمتیں تیار کر رکھی ہیں، وہ جنت کی اعلیٰ اور لذیذ ترین نعمتیں چھوڑ کر دنیا میں کس طرح آئیں گے؟ یعنی کسی لحاظ سے بھی روحیں دنیا میں نہیں آسکتیں۔

اسی طرح اس رات کو چراغاں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے اور خوب آتش بازی کی جاتی ہے، حالانکہ یہ بھی مشرک قوموں کا شعار ہے۔ مجوسیوں (آتش پرستوں) میں یہ

طریقہ رہا ہے کہ وہ خوشی کے موقع پر آتش بازی اور چراغاں کرتے ہیں۔ ان کا یہ طریقہ ہندوؤں نے اپنایا اور ان کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اس بے ہودہ رسم کو اختیار کرلیا جیسا کہ اس سے پہلے ''چراغاں اور آتش بازی کا رواج اور اس کی حقیقت'' والے مضمون میں اس پر روشنی ڈالی جاچکی ہے۔

بہر حال اس رات آتش بازی اور حلوہ پوری وغیرہ پکا کر ایصالِ ثواب کرنا، یہ سب ایجادِ بندہ چیزیں ہیں جن کا کوئی ثبوت شریعتِ مطہرہ میں نہیں ہے۔ ہر مسلمان کو ان چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے اور اپنے متعلقین کو بھی سمجھانا چاہیے تاکہ ان کے ذہنوں میں سنت اور بدعت کا فرق واضح ہو، ایک شاعر نے سچ کہا ہے:

یہ امت روایات میں کھو گئی
حقیقت خرافات میں کھو گئی

شعر میں روایات سے مراد آباء و اجداد سے ورثے میں ملنے والی روایات یا وہ رسوم و رواج ہیں جن پر ایک روایتی طریقے سے عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔ ان رسوم و رواج کی روایات نے حقیقت پر پردہ ڈال رکھا ہے اور خرافات ہی کو دین سمجھ لیا گیا ہے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا. آمین!
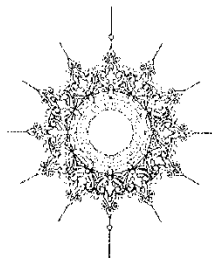
۹
رمضان
فضائل و اعمال اور رسومات

رمضان المبارک

اسلامی سال کا نواں مہینہ ہے۔

وجہ تسمیہ

رَمَضَان، رَمَض سے ہے جس کے معنی ہیں، جلانا، زمین کی تپش سے پاؤں کا جلنا، یہ مہینہ گناہوں کو جلا کر نیست و نابود کر دیتا ہے۔ یا اس مہینے میں تشنگی (پیاس) کی شدت بہت تکلیف دیتی ہے۔ یا اس وجہ سے کہ نام رکھنے کے وقت یہ مہینہ شدت گرما میں واقع ہوا تھا، رمضان نام رکھا گیا۔ (نور اللغات)

رمضان المبارک کی فضیلت، احادیث صحیحہ کی روشنی میں

رمضان المبارک کا مہینہ بڑی فضیلت و اہمیت کا حامل ہے اس کی فضیلت متعدد حیثیتوں سے ثابت ہے، مثلاً:

1. رمضان کے روزے رکھنا، اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک رکن ہے۔
2. اسی مہینے میں قرآن مجید کا نزول ہوا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ [1] جس کا ایک مطلب تو بعض علماء اور مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ سب سے پہلی وحی جو غار حرا میں بصورت (اقْرأ) جبریل امین لے کر آئے، وہ رمضان المبارک کا

[1] البقرة 2:185.

واقعہ ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآن مجید پورا کا پورا لیلۃ القدر میں لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر اتار دیا گیا اور لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہوتی ہے۔

3 اسی ماہ مبارک میں لیلۃ القدر ہوتی ہے، جس کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ﴾ ''شب قدر، ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔''[1] ہزار مہینے کے 83 سال 4 مہینے بنتے ہیں۔ عام طور پر انسانوں کی عمریں بھی اس سے کم ہوتی ہیں۔ لیکن اس امت پر اللہ تعالیٰ کی یہ کتنی مہربانی ہے کہ وہ سال میں ایک مرتبہ اسے لیلۃ القدر سے نواز دیتا ہے، جس میں وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے 83 سال کی عبادت سے بھی زیادہ اجر وثواب حاصل کر سکتے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«أَنَّهُ سَمِعَ مَنْ يَّثِقُ بِهِ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ يَقُولُ: إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أُرِيَ أَعْمَارَ النَّاسِ قَبْلَهُ، أَوْ مَا شَاءَ اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ، فَكَأَنَّهُ تَقَاصَرَ أَعْمَارَ أُمَّتِهِ أَنْ لَّا يَبْلُغُوا مِنَ الْعَمَلِ مِثْلَ الَّذِي بَلَغَ غَيْرُهُمْ فِي طُولِ الْعُمْرِ، فَأَعْطَاهُ اللّٰهُ لَيْلَةَ الْقَدْرِ، خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ»

''انھوں نے بعض معتمد علماء سے یہ بات سنی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو آپ سے پہلے لوگوں کی عمریں دکھلائی گئیں، تو آپ کو ایسا محسوس ہوا کہ آپ کی امت کی عمریں ان سے کم ہیں اور اس وجہ سے وہ ان لوگوں سے عمل میں پیچھے رہ جائے گی جن کو لمبی عمریں دی گئیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے (اس کا ازالہ اس طرح فرما دیا کہ) امت محمدیہ کے لیے لیلۃ القدر عطا فرما دی جو ہزار

[1] القدر 3:97.

مہینوں سے بہتر ہے۔“ [1]

4 اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور روزہ رکھنا بھی نماز، زکاۃ اور حج وعمرہ کی طرح ایک نہایت اہم عبادت ہے۔

5 رمضان المبارک کے لیے اللہ تعالیٰ خصوصی اہتمام فرماتا ہے، جیسے نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِّحَتْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ، وَغُلِّقَتْ أَبْوَابُ جَهَنَّمَ، وَسُلْسِلَتِ الشَّيَاطِينُ»

”جب رمضان آتا ہے تو آسمان (اور ایک روایت میں ہے جنت) کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں اور (بڑے بڑے) شیطانوں کو جکڑ دیا جاتا ہے۔“ [2]

نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا كَانَ أَوَّلُ لَيْلَةٍ مِّنْ شَهْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّيَاطِينُ وَمَرَدَةُ الْجِنِّ وَغُلِّقَتْ أَبْوَابُ النَّارِ فَلَمْ يُفْتَحْ مِنْهَا بَابٌ، وَفُتِّحَتْ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ فَلَمْ يُغْلَقْ مِنْهَا بَابٌ، وَيُنَادِي مُنَادٍ: يَا بَاغِيَ الْخَيْرِ! أَقْبِلْ، وَيَا بَاغِيَ الشَّرِّ! أَقْصِرْ، وَلِلّٰهِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ وَذٰلِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ»

”جب ماہ رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین اور سرکش جنوں کو جکڑ دیا جاتا ہے، جہنم کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی دروازہ

[1] الموطأ للإمام مالك، الاعتكاف، باب ما جاء في ليلة القدر: 321/1، طبع مصر. [2] صحيح البخاري، الصوم، باب هل يقال رمضان، أوشهر رمضان ......، حديث: 1899,1898، وصحيح مسلم، الصيام، باب فضل شهر رمضان، حديث: 1079.

کھلا نہیں رہنے دیا جاتا۔ اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہنے دیا جاتا۔ اور ایک پکارنے والا پکار کر کہتا ہے: اے نیکیوں کے طالب! خوب پیش قدمی کر! اور اے برائیوں کے طالب! باز آ جا۔ اور اللہ کے لیے جہنم سے آزاد کردہ لوگ ہوتے ہیں اور ہر رات کو ایسا ہوتا ہے (رمضان کی ہر رات کو اللہ جہنم سے لوگوں کو آزاد فرماتا ہے۔)‘‘ [1]

اس روایت میں کچھ ضعف ہے، بقول البانی رحمہ اللہ جو درج ذیل حدیث سے دور ہوجاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَتَاكُمْ رَمَضَانُ، شَهْرٌ مُّبَارَكٌ، فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ صِيَامَهٗ، تُفْتَحُ فِيهِ أَبْوَابُ السَّمَاءِ، وَتُغْلَقُ فِيهِ أَبْوَابُ الْجَحِيمِ، وَتُغَلُّ فِيهِ مَرَدَةُ الشَّيَاطِينِ، لِلّٰهِ فِيهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ، مَنْ حُرِمَ خَيْرَهَا فَقَدْ حُرِمَ»

’’تمھارے پاس رمضان آیا ہے، یہ برکتوں والا مہینہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے تم پر فرض کیے ہیں، اس میں آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور سرکش شیطانوں کو جکڑ دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس میں ایک رات ہوتی ہے جو ہزار مہینے سے بہتر ہے، جو اس کی بھلائی سے محروم رہا، وہ بڑا ہی حرماں

[1] جامع الترمذي، الصوم، باب ما جاء في فضل شهر رمضان، حديث: 682، وسنن ابن ماجه، الصيام، باب ماجاء في فضل شهر رمضان، حديث: 1642، واللفظ له. وقال الترمذي: هذا حديث غريب، وقال الألباني: وهو كما قال: لكن وله شاهد في (المسند) يتقوى به وهو الذي بعده. مشكاة للألباني: 611/1.

نصیب ہے۔"[1]

ایک اور روایت میں ہے، رمضان کے شروع ہونے پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ هٰذَا الشَّهْرَ قَدْ حَضَرَكُمْ، وَفِيهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ، مَنْ حُرِمَهَا فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهُ وَلَا يُحْرَمُ خَيْرَهَا إِلَّا مَحْرُومٌ»

"یہ ماہ مبارک تمھارے پاس آ گیا ہے، اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینے سے بہتر ہے، جو اس سے محروم رہا، وہ ہر طرح کی خیر سے محروم رہا اور اس کی خیر سے بالکل محروم القسمت شخص ہی محروم رہتا ہے۔"[2]

ان احادیث سے واضح ہے کہ رمضان کا مہینہ نہایت عظمت و سعادت کا مہینہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کی خصوصی عظمت کی وجہ سے اس ماہ مبارک میں وہ وہ اقدامات فرماتا ہے جو مذکورہ حدیثوں میں بیان ہوئے۔ جن سے اس مہینے کی خصوصی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

رمضان کی فضیلت میں بعض ضعیف روایات

اس ماہ مبارک کی فضیلت میں بعض روایات بہت مشہور ہیں، لیکن وہ سند کے لحاظ سے کمزور ہیں، اس لیے ان کو بیان کرنے سے گریز کرنا چاہیے، ہم تنبیہ کے طور پر انھیں بھی یہاں درج کرتے ہیں تاکہ ضعیف روایات بھی لوگوں کے علم میں آجائیں، جنھیں خطیبان خوش بیان اور واعظان شیریں مقال اپنے مواعظ و خطبات میں اکثر بیان کرتے ہیں، جیسے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس کے الفاظ

[1] مسند أحمد: 230/2، وسنن النسائي، الصيام، ذكر الاختلاف على معمر فيه، حديث: 2108، وقال الألباني: وهو حديث جيد لشواهده، مشكاة: 612/1. [2] سنن ابن ماجه، الصيام، باب ما جاء في فضل شهر رمضان، حديث: 1644، وقال الألباني: إسناده حسن، مشكاة: 612/1.

حسب ذیل ہیں:

1 «خَطَبَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي آخِرِ يَوْمٍ مِّنْ شَعْبَانَ، فَقَالَ: أَيُّهَا النَّاسُ! قَدْ أَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيمٌ، شَهْرٌ مُّبَارَكٌ، شَهْرٌ فِيهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ، جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهُ فَرِيضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهِ تَطَوُّعًا، مَنْ تَقَرَّبَ فِيهِ بِخَصْلَةٍ مِّنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ أَدّٰى فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ، وَمَنْ أَدّٰى فَرِيضَةً فِيهِ كَانَ كَمَنْ أَدّٰى سَبْعِينَ فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ، وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ، وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ، وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ وَشَهْرٌ يُّزَادُ فِيهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ، مَنْ فَطَّرَ فِيهِ صَائِمًا كَانَ لَهُ مَغْفِرَةً لِذُنُوبِهٖ وَعِتْقَ رَقَبَتِهٖ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِهٖ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَّنْتَقِصَ مِنْ أَجْرِهٖ شَيْءٌ، قُلْنَا: يَارَسُولَ اللّٰهِ! لَيْسَ كُلُّنَا نَجِدُ مَا نُفَطِّرُ بِهِ الصَّائِمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: يُعْطِي اللّٰهُ هٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰى مَذْقَةِ لَبَنٍ أَوْ تَمْرَةٍ أَوْ شَرْبَةٍ مِّنْ مَّاءٍ وَ مَنْ أَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِي شَرْبَةً لَّا يَظْمَأُ أَبَدًا حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ، وَهُوَ شَهْرٌ أَوَّلُهُ رَحْمَةٌ وَأَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ وَآخِرُهُ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ، وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَّمْلُوكِهٖ فِيهِ غَفَرَاللّٰهُ لَهُ وَأَعْتَقَهُ مِنَ النَّارِ»[1]

2 «مَنْ أَفْطَرَ يَوْمًا مِّنْ رَمَضَانَ مِنْ غَيْرِ عِلَّةٍ وَلَا مَرَضٍ لَمْ يَقْضِهٖ صِيَامُ الدَّهْرِ وَ إِنْ صَامَهُ»

[1] شعب الإيمان للبيهقي:3/305، حديث:3608. امام ابوحاتم اور محدث البانی وغیرہ نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ السلسلة الضعيفة للألباني:2/266، حديث:871.

”جس نے بغیر کسی عذر اور بیماری کے رمضان کا ایک روزہ چھوڑ دیا، وہ ساری زندگی بھی اس کی قضا دیتا رہے تو اس کی قضا ادا نہیں ہوگی۔“[1]

یہ روایت امام بخاری نے تعلیقاً روایت کی ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ اس روایت میں تین علتیں ہیں، ایک اضطراب، دوسری ابوالمطوس راوی کی جہالت اور تیسری یہ شک کہ ابوالمطوس کے باپ کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت ہے یا نہیں۔[2]

شیخ البانی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہ روایت ضعیف ہے، چنانچہ انھوں نے اسے ضعیف ابی داود، ضعیف ترمذی، ضعیف ابن ماجہ اور ضعیف الجامع ہی میں نقل کیا ہے۔

3 مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں رمضان کے روزے رکھنا، دوسری جگہوں کے مقابلے میں ہزار رمضان سے افضل ہیں۔ یہ دو روایات ہیں جو مجمع الزوائد میں ہیں اور دونوں ضعیف ہیں۔[3]

4 نبی ﷺ کے زمانے میں دو عورتوں نے روزہ رکھا، پیاس کی شدت سے وہ سخت نڈھال ہوگئیں، نبی ﷺ کو بتلایا گیا تو آپ خاموش رہے، پھر دوپہر کو دوبارہ آپ سے عرض کیا گیا کہ وہ مرنے لگی ہیں۔ آپ نے ان دونوں عورتوں کو بلوایا اور ایک بڑا پیالہ منگوایا اور باری باری دونوں سے کہا: ”اس پیالے میں قے کرو“ تو دونوں نے خون اور پیپ کی قے کی، دونوں کی قے سے پیالہ بھر گیا۔ آپ نے فرمایا: ”انھوں نے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں (کھانے پینے) سے تو روزہ رکھا اور اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے روزہ کھولتی رہیں۔ یہ آپس میں بیٹھی ہوئی لوگوں کا گوشت کھاتی،

[1] ذكره البخاري تعليقًا، الصوم، باب إذا جامع في رمضان، وأخرجه الأربعة. [2] تفصیل کے لیے دیکھیے فتح الباري، باب مذکور۔ اور كتاب العلل لابن أبي حاتم، حديث:776,750,720,674، والعلل للدارقطني:8/266-274. [3] مجمع الزوائد، طبع جديد، بتحقيق عبدالله محمد الدرويش:3/349,348.

یعنی غیبت کرتی رہیں۔'' [1]

روزے میں غیبت وغیرہ سے تو ضرور پرہیز کرنا چاہیے۔لیکن یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے۔
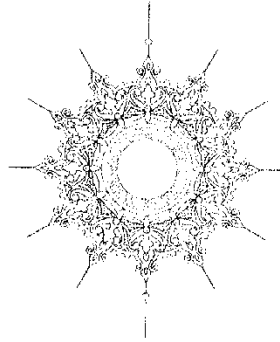
[1] مجمع الزوائد:3/399.

رمضان المبارک میں فضیلت والے اعمال

1 رمضان اور روزہ

رسول اللہ ﷺ سے روزے کی فضیلت متعدد احادیث سے ثابت ہے، آپ نے فرمایا: «اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ يَسْتَجِنُّ بِهَا الْعَبْدُ مِنَ النَّارِ» ''روزہ ایک ڈھال ہے جس کے ذریعے سے بندہ جہنم کی آگ سے بچتا ہے۔''[1] اور ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا: «مَنْ صَامَ يَوْمًا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بَعَّدَ اللّٰهُ وَجْهَهُ عَنِ النَّارِ سَبْعِينَ خَرِيفًا» ''جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں ایک دن روزہ رکھا تو اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو جہنم سے ستر سال (کی مسافت کے برابر) دور کر دیتا ہے۔''[2] علاوہ ازیں دیگر احادیث سے بھی روزوں کی فضیلت واضح ہوتی ہے جن کی تفصیل ہماری کتاب ''رمضان المبارک فضائل، فوائد وثمرات، احکام و مسائل اور کرنے والے کام'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جب نفلی روزوں کا اجر وثواب اس قدر ہے تو رمضان کے روزوں کا جو اجر و صلہ ملنا ہے، اس کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ اسی لیے نبیٔ اکرم ﷺ نے رمضان المبارک کے روزوں کی بابت فرمایا:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»

''جس نے رمضان کے روزے رکھے، ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت

[1] مسند أحمد: 396/3. [2] صحيح البخاري، الجهاد والسير، حديث: 2840.

سے (دکھلاوے اور ریاکاری کے لیے نہیں) تو اس کے گزشتہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔"[1]

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ، وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ، وَرَمَضَانُ إِلٰى رَمَضَانَ، مُكَفِّرَاتُ مَا بَيْنَهُنَّ، إِذَا اجْتَنَبَ الْكَبَائِرَ»

"پانچوں نمازیں، جمعہ دوسرے جمعے تک اور رمضان دوسرے رمضان تک، ان گناہوں کا کفارہ ہیں جو ان کے درمیان ہوں، بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔"[2]

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ»

"جس نے رمضان کے (فرضی) روزے رکھے اور اس کے بعد شوال میں چھ (نفلی) روزے رکھے، وہ شخص ایسے ہے جیسے وہ ہمیشہ روزے رکھنے والا ہے۔"[3]

اس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کے روزے اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا کے تحت تین سو (300) اور چھ روزے ساٹھ روزوں کے برابر شمار ہوں گے اور قمری سال کے تین سو ساٹھ (360) دن ہی ہوتے ہیں۔ یوں گویا ایک مسلمان صائم الدہر (ہمیشہ روزہ رکھنے والا) شمار ہوگا۔ اس اعتبار سے شوال کے یہ چھ روزے، جن کو "شش عیدی" کہا جاتا

[1] صحيح البخاري، الصوم، باب من صام رمضان إيمانا واحتسابا ونية، حديث: 1901، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان وهو التراويح، حديث: 760.

[2] صحيح مسلم، الطهارة، باب الصلوات الخمس والجمعة إلى الجمعة......، حديث: 233.

[3] صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صوم ستة أيام من شوال ......، حديث: 1164.

ہے، نفلی ہونے کے باوجود نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ہر مسلمان کو رمضان المبارک کے روزوں کے ساتھ یہ چھ روزے بھی رکھ لینے چاہئیں، تاکہ وہ اللہ کے ہاں صائم الدہر شمار ہو۔

2 قیام رمضان

رمضان المبارک کے مہینے میں ایک بہت بڑی فضیلت والا عمل قیام رمضان ہے، احادیث مبارکہ میں نبی ﷺ نے قیام رمضان کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

«مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»

''جس نے ایمان کی حالت میں، طلب ثواب کی نیت سے رمضان کا قیام کیا اس کے پہلے سارے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''[1]

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کو قیام رمضان کی ترغیب بایں طور دلاتے تھے کہ انھیں تاکیدی حکم نہیں دیتے تھے۔ ویسے قیام کی ترغیب دلاتے تھے۔[2]

لہٰذا ہر مسلمان کو قیام رمضان کے لیے بھرپور سعی کرنی چاہیے۔

3 رمضان اور قرآن مجید

رمضان المبارک کے مہینے سے قرآن مجید کا خصوصی تعلق ہے، اسی مہینے میں قرآن مجید کا نزول ہوا، جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے، اسی لیے شاید نبی کریم ﷺ

[1] صحيح البخاري، الإيمان، باب تطوع قيام رمضان من الإيمان، حديث: 37، و صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان وهو التراويح، حديث: 759. [2] صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان وهو التراويح، حديث: 759.

دوسرے مہینوں کی بہ نسبت اس مہینے میں قرآن کریم کی تلاوت زیادہ کیا کرتے تھے۔ صحیح احادیث میں ہے کہ نبی ﷺ رمضان میں جبریل امین کو قرآن سنایا کرتے تھے اور جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال دو مرتبہ جبریل امین سے رمضان میں قرآن کا دورہ کیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«كَانَ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَلْقَاهُ كُلَّ لَيْلَةٍ فِي رَمَضَانَ حَتّٰى يَنْسَلِخَ، يَعْرِضُ عَلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ اَلْقُرْآنَ»

''جبریل علیہ السلام رمضان المبارک کی ہر رات آخر ماہ تک نبی کریم ﷺ سے ملاقات کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ انھیں قرآن مجید سناتے تھے۔''[1]

اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَ يَعْرِضُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ اَلْقُرْآنَ كُلَّ عَامٍ مَرَّةً، فَعَرَضَ عَلَيْهِ مَرَّتَيْنِ فِي الْعَامِ الَّذِي قُبِضَ فِيهِ»

''جبریل علیہ السلام نبی ﷺ پر ہر سال ایک مرتبہ قرآن حکیم پڑھتے تھے۔ جس سال آپ ﷺ فوت ہوئے تو انھوں نے دو مرتبہ آپ پر قرآن حکیم پڑھا۔''[2]

دیگر احادیث میں ہے کہ قرآن اور رمضان سفارش کریں گے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

[1] صحيح البخاري، الصوم، باب أجود ما كان النبي ﷺ......، حديث: 1902، وصحيح مسلم، الفضائل، باب جوده ﷺ، حديث: 2308. [2] صحيح البخاري، فضائل القرآن، باب كان جبريل يعرض القرآن......، حديث: 4998.

''روزہ اور قرآن قیامت کے دن بندے کے لیے سفارش کریں گے۔''[1]

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان اور قرآن کا آپس میں انتہائی گہرا تعلق ہے، لہٰذا ہر مسلمان کو رمضان المبارک میں قرآن کریم کی تلاوت بکثرت کرنی چاہیے اور اس کے مطالب و مفاہیم کو سمجھنا چاہیے۔ اَللّٰھُمَّ! وَفِّقْنَا لِتِلَاوَۃِ الْقُرْآنِ الْکَرِیمِ.

4 کثرتِ دعا

قرآن مجید میں اللہ نے رمضان المبارک کے احکام و مسائل کے درمیان دعا کی ترغیب بیان فرمائی ہے:

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ۝ ﴾

''اور (اے نبی!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں دعا کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہوں، جب بھی وہ مجھ سے دعا کریں، پس چاہیے کہ وہ بھی میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پائیں۔''[2]

اس سے علماء اور مفسرین نے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا اس انداز بیان سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ رمضان المبارک میں دعاؤں کا بھی خصوصی اہتمام کیا جائے، اس لیے اس مہینے میں دعائیں بھی خوب کی جائیں، خصوصاً افطاری کے وقت اور رات کے آخری پہر میں۔

ملحوظہ: رمضان المبارک اور روزوں سے متعلقہ دیگر احکام و مسائل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب ''رمضان المبارک فضائل، فوائد و ثمرات، احکام و مسائل اور کرنے

[1] مسند أحمد:2/174. [2] البقرة2:186.

والے کام'' مطبوعہ دارالسلام۔

5 رمضان المبارک اور عمرہ

عمرہ کرنے کی سعادت سال کے بارہ مہینوں میں حاصل کی جا سکتی ہے لیکن حج صرف ذوالحجہ کے مہینے ہی میں ادا کیا جا سکتا ہے، اس لیے آدمی جب چاہے عمرہ کر سکتا ہے لیکن رمضان المبارک میں عمرے کی سعادت حاصل کرنا حج کے اجر و ثواب کے برابر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری عورت سے فرمایا:

«مَا مَنَعَكِ أَنْ تَحُجِّي مَعَنَا؟ قَالَتْ: كَانَ لَنَا نَاضِحٌ فَرَكِبَهُ أَبُو فُلَانٍ وَابْنُهُ، لِزَوْجِهَا وَابْنِهَا وَتَرَكَ نَاضِحًا نَنْضَحُ عَلَيْهِ، قَالَ: فَإِذَا كَانَ رَمَضَانُ اعْتَمِرِي فِيهِ، فَإِنَّ عُمْرَةً فِي رَمَضَانَ حَجَّةٌ»

''ہمارے ساتھ حج کرنے سے تجھے کون سی چیز مانع ہے؟'' اس نے کہا: ہمارے پاس پانی لانے والا ایک اونٹ تھا، اس پر فلاں کا باپ اور اس کا بیٹا، یعنی میرا خاوند اور بیٹا حج کرنے چلے گئے ہیں اور ایک اونٹ چھوڑ گئے ہیں جس پر ہم پانی لاد کر لاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب رمضان المبارک ہو تو عمرہ کر لینا اس لیے کہ رمضان میں عمرہ کرنا (ثواب کے اعتبار سے) حج کے برابر ہے۔''[1]

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«فَإِنَّ عُمْرَةً فِي رَمَضَانَ تَقْضِي حَجَّةً أَوْ حَجَّةً مَعِي»

[1] صحيح البخاري، العمرة، باب عمرة في رمضان، حديث: 1782.

”بلاشبہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنا حج کے یا میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔“ [1]

لہٰذا انسان کو رمضان المبارک میں دوسری نیکیوں میں رغبت کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔

6 رمضان المبارک اور صدقہ وخیرات

رمضان نیکیوں کا موسم بہار ہے، لہٰذا اس مہینے میں انسان کو ہر قسم کی نیکیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی کوشش کرنی چاہیے اور خاص طور پر دوسروں پر خرچ کرنے میں سبقت کرنی چاہیے، اس مبارک مہینے میں نبیٔ اکرم ﷺ کا یہ عمل بھی ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ أَجْوَدَ النَّاسِ بِالْخَيْرِ، وَكَانَ أَجْوَدَ مَا يَكُونُ فِي رَمَضَانَ، حِينَ يَلْقَاهُ جِبْرِيلُ...... فَإِذَا لَقِيَهُ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ أَجْوَدَ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيحِ الْمُرْسَلَةِ»

”نبیٔ مکرم ﷺ سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور سب سے زیادہ سخی آپ ﷺ اس وقت ہوتے تھے جب رمضان المبارک میں آپ ﷺ سے جبریل علیہ السلام کی ملاقات ہوتی...... اس وقت رسول مکرم ﷺ تیز چلتی ہوئی ہوا سے بھی زیادہ سخی ہوتے تھے۔“ [2]

[1] صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب حج النساء، حديث: 1863. [2] صحيح البخاري، الصوم، باب أجود ماكان النبي ﷺ يكون في رمضان، حديث: 1902، وصحيح مسلم، الفضائل، باب جوده ﷺ، حديث: 2308.

لہٰذا ہمیں بھی رمضان المبارک میں کثرت سے صدقہ و خیرات کا اہتمام کرنا چاہیے۔

7 روزے افطار کروانا

اس مہینے میں روزے افطار کروانا بہت بڑی فضیلت اور اجر و ثواب کا کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ غَيْرَ أَنَّهُ لَا يَنْقُصُ مِنْ أَجْرِ الصَّائِمِ شَيْئًا»

''جس نے کسی روزے دار کا روزہ کھلوایا، تو اس کو بھی روزے دار کی مثل اجر ملے گا، بغیر اس کے کہ اللہ تعالیٰ روزے دار کے اجر میں کوئی کمی کرے۔'' [1]

8 اعتکاف اور رمضان

رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اعتکاف بھی سنت ہے۔ اعتکاف کے لغوی معنی ٹھہرنا اور کسی چیز پر جم کر بیٹھ جانا ہیں۔ اصطلاح میں دنیاوی مصروفیات چھوڑ کر عبادت کی غرض سے مسجد میں ٹھہرنا اعتکاف کہلاتا ہے۔ اعتکاف سال میں کسی بھی وقت ہو سکتا ہے لیکن افضل رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اعتکاف ہے، اس لیے کہ نبی ﷺ آخری عشرے کا اعتکاف پابندی سے کرتے رہے، حتی کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے جا ملے، یعنی آخری عشرے کا اعتکاف سنت مؤکدہ ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتّٰى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ تَعَالٰى، ثُمَّ اعْتَكَفَ أَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهِ»

[1] جامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء في فضل من فطر صائمًا، حديث: 807.

''نبی ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کیا کرتے تھے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فوت کر دیا، پھر آپ کے بعد آپ ﷺ کی بیویاں اعتکاف کرتی تھیں۔''[1]

مرد کی طرح عورت بھی اعتکاف کر سکتی ہے۔ مگر عورت بھی مسجد میں اعتکاف کرے گی۔ عورت کا گھر میں اعتکاف کرنا کسی طور پر جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ﴾ ''اور تم مسجدوں میں اعتکاف کرنے والے ہو۔''[2]

معتکف کے لیے مسلمان ہونا، حیض و نفاس اور جنابت سے پاک ہونا، اعتکاف کی نیت کرنا اور مسجد کا ہونا ضروری ہے۔ نیت صرف دل کے ارادے کا نام ہے۔ اس کے لیے کوئی مخصوص الفاظ احادیث میں نہیں ملتے۔

9 لیلۃ القدر کی تلاش

لیلۃ القدر جو رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک ہے۔ اس کی تلاش کے لیے ذکر و عبادت میں مصروف رہ کر راتیں گزارنا بھی بڑی فضیلت والا عمل ہے، حدیث میں ہے: ''جس نے شب قدر میں قیام کیا اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''[3]

10 صدقۂ فطر

رمضان کے روزوں کے اختتام پر صدقۂ فطر دینا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یہ روزوں

[1] صحيح البخاري، الاعتكاف، باب الاعتكاف في العشر الأواخر، حديث: 2026، وصحيح مسلم، الاعتكاف، باب اعتكاف العشر الأواخر من رمضان، حديث: 1172. [2] البقرة 2:187.

[3] صحيح البخاري، فضل ليلة القدر، باب: 1، حديث: 2014.

کے دوران میں ہونے والی کمی کوتاہی یا لغزش کے ازالے اور ناداروں اور حاجت مندوں کو سامان خور و نوش فراہم کرنے کے لیے فرض کیا گیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

«فَرَضَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ طُهْرَةً لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَطُعْمَةً لِّلْمَسَاكِينِ»

''رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر روزے دار کو لغو اور بے ہودہ باتوں سے پاک کرنے کے لیے اور مساکین کے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے فرض قرار دیا ہے۔''[1]

صدقۂ فطر ہر مسلمان پر واجب ہے، چاہے وہ بڑا ہے یا چھوٹا، مرد ہے یا عورت، آزاد ہے یا غلام۔ اس کی مقدار ایک صاع (تقریباً سوا دو کلو) ہے اور اس کی ادائیگی نماز عید کے لیے نکلنے سے پہلے ہونی چاہیے۔

امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«فَرَضَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ أَوْصَاعًا مِّنْ شَعِيرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ، وَالذَّكَرِ وَالْأُنْثٰى، وَالصَّغِيرِ وَالْكَبِيرِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ، وَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُؤَدّٰى قَبْلَ خُرُوجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلَاةِ»

''رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر فرض قرار دیا ہے جو ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو ہے یہ مسلمانوں میں سے غلام، آزاد، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے سب پر فرض ہے اور آپ ﷺ نے حکم دیا کہ لوگوں کے نماز عید کی طرف نکلنے

[1] سنن ابن ماجه، الزكاة، باب صدقة الفطر، حديث: 1827.

سے پہلے اسے ادا کیا جائے۔" [1]

نماز عید سے چند دن پہلے بھی صدقۂ فطر کی ادائیگی ہوسکتی ہے۔ عیدالفطر کے بعد والی ادائیگی صدقۂ فطر شمار نہیں ہوگی، عام صدقہ ہوگا۔ صحیح بخاری میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے:

«وَكَانُوا يُعْطُونَ قَبْلَ الْفِطْرِ بِيَوْمٍ أَوْيَوْمَيْنِ»

"صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نماز عید الفطر سے ایک دو یوم پہلے صدقۂ فطر دے دیتے تھے۔" [2]
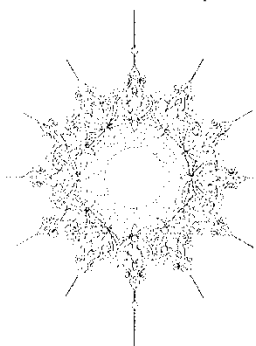
[1] صحيح البخاري، الزكاة، باب فرض صدقة الفطر، حديث: 1503، وصحيح مسلم، الزكاة، باب زكاة الفطر على المسلمين، حديث: 984. [2] صحيح البخاري، الزكاة، باب صدقة الفطر ......، حديث: 1511.

رمضان المبارک کے چند اُمورِ مُحدَثات

عبادات میں خلوت اور تنہائی پسندیدہ امر ہے، جیسے نماز ہے، دعا ہے، ذکر اذکار اور توبہ واستغفار ہے، وغیرہ۔ سوائے ان صورتوں کے جن میں اجتماعیت منصوص ہے، جیسے فرض نمازوں کو باجماعت پڑھنے کی تاکید، جمعے کی فرضیت، عیدین کی نماز، صلاۃِ استسقا وصلاۃِ کسوف وغیرہ ہے۔

لیکن قومی مزاج میں میلوں ٹھیلوں سے شغف، کھابوں کا شوق اور ہاؤہو کا جذبہ جس طرح رچ بس گیا ہے، اس نے ان عبادات کو بھی اجتماعیت کا رنگ دے دیا ہے جن میں انفرادیت اور خلوت محبوب ہے۔ ان میں سے رمضان المبارک میں فروغ پذیر چند عبادات کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے جن میں بدعات یا غلو کی آمیزش روز افزوں ہے۔

شبِ قدر میں مواعظ وتقاریر کا سلسلہ

شبِ قدر کی جو فضیلت ہے، اسے حاصل کرنے کے لیے اس رات بیدار رہ کر ''ذکر'' کرنے کا یہ سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے کہ تراویح کے بعد سے لے کر سحری کے وقت تک مختلف علمائے کرام کے مواعظ وخطبات ہوتے ہیں اور پھر سحری کا بھی وہیں انتظام ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن وحدیث کی محفلیں ''محفلِ ذکر'' ہیں۔ اس اعتبار سے اس طریقۂ ذکر کو ذکر سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قابلِ غور بات یہ

ہے کہ شبِ قدر میں ذکر کا یہ طریقہ مسنون ہے؟ اسلاف (صحابہ و تابعین) میں سے کسی نے یہ طریقہ اختیار کیا؟ جواب یقیناً نفی میں ہے کیونکہ شبِ قدر میں نبی ﷺ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے نہ صحابہ و تابعین میں سے کسی نے، اس لیے شبِ قدر میں یکسوئی سے عبادت اور ذکرِ الٰہی ہی کا طریقہ مستحسن اور پسندیدہ ہوگا جو عہدِ رسالت مآب ﷺ سمیت خیر القرون میں رہا۔ اور وہ طریقہ کیا ہے؟ انفرادی طور پر شب بیداری اور پھر ذکر و عبادت۔ جس میں قیام اللیل (نفلی نماز) دعا و مناجات، توبہ و استغفار اور تلاوتِ قرآن وغیرہ کا اہتمام ہو۔ اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ساری رات بیدار رہا جائے کیونکہ ایسا کرنا انسانی عادت کے خلاف ہے اور کسی انسان کے لیے سخت مشقت کے بغیر ایسا کرنا ممکن نہیں ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾

''اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے بڑھ کر بات کا مکلّف نہیں ٹھہراتا۔''[1]

بنا بریں ایک شخص جتنا وقت آسانی سے جاگ کر لیلۃ القدر میں اللہ کی عبادت کر سکتا ہے، اتنی عبادت کرنے سے امید ہے کہ اسے شبِ قدر کی فضیلت حاصل ہو جائے گی، اس لیے لوگوں کو ساری رات بیدار رکھنے کے لیے وعظ و تقریر کا یہ سلسلہ غیر مستحسن ہے۔ اس سے لوگوں میں نہ عبادت کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور نہ شب خیزی اور اللہ سے لَو لگانے کا جذبہ۔ جبکہ شبِ قدر کو مخفی رکھنے اور اس میں عبادت کی ترغیب دینے سے یہی مقصد معلوم ہوتا ہے۔

ختمِ قرآن پر شیرینی کی تقسیم، چراغاں اور لمبی لمبی دعاؤں کا اہتمام

ختمِ قرآن پر شیرینی وغیرہ کی تقسیم کا جواز، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک قول سے ماخوذ

[1] البقرۃ 2:286.

ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ سورۂ بقرہ کے اختتام پر خوشی اور شکرانے کے طور پر ایک اونٹنی ذبح کر کے تقسیم کی تھی۔ لیکن اس موقع پر جو شور شرابہ اور غل غپاڑہ بعض مسجدوں میں دیکھنے میں آتا ہے، وہ مسجد کے آداب کے خلاف ہے۔ شیرینی کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ مذکورہ خرابی پیدا نہ ہو۔ اسی طرح کسی مسجد میں شیرینی وغیرہ تقسیم نہ ہو تو اس پر ناک بھوں نہ چڑھایا جائے کیونکہ شیرینی کی تقسیم فرض و واجب نہیں حتی کہ سنت و مستحب بھی نہیں بلکہ صرف جواز ہے، اس لیے اسے فرض و واجب کا درجہ دے دینا غیر مستحسن امر ہے۔

اسی طرح ختم قرآن پر مسجدوں میں چراغاں اور آرائشی جھنڈیوں وغیرہ کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے، یہ بھی شرعاً ناپسندیدہ امر ہے، اس لیے کہ ضرورت سے زیادہ مسجد میں روشنی کا انتظام کرنے میں غیروں سے مشابہت کا شائبہ ہے۔

ختمِ قرآن پر خصوصی طور پر دعاؤں کا اہتمام بھی غور طلب معاملہ ہے۔ اس طرح کی اجتماعی دعا نبی ﷺ سے تو ثابت نہیں۔ علاوہ ازیں دعا میں اخفا (پوشیدگی) مستحسن ہے۔

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ﴾

"پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے۔" [1]

مروجہ اجتماعی دعا میں یہ اخفا (پوشیدگی) نہیں بلکہ اِجْهَار (بلند آوازی) ہے۔

حَرَمَیْن شریفَیْن (مسجد نبوی اور خانہ کعبہ) میں بھی ختمِ قرآن پر جس طرح لمبی لمبی اور مُسَجَّع قافیوں میں دعائیں کی جاتی ہیں، خود بعض سعودی علماء بھی اس پر نکیر کرتے ہیں، اس لیے ختمِ قرآن پر لمبی لمبی دعاؤں کا اہتمام بھی نظر ثانی کا محتاج ہے۔

[1] الأعراف 55:7.

دعائے قنوتِ وتر کے ساتھ قنوتِ نازلہ؟

رمضان المبارک میں ایک اور رواج عام ہوتا جا رہا ہے اور وہ یہ کہ بڑی مساجد میں دعائے قنوتِ وتر کے ساتھ دعائے قنوتِ نازلہ بھی روزانہ پڑھی جاتی ہے۔ حرمین شریفین (مسجد نبوی اور مسجدِ حرام) میں بھی بالعموم ایسا ہوتا ہے۔ غالبًا اس کی دیکھا دیکھی یہاں بھی بعض مساجد میں اس کا اہتمام ہونے لگا ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ رواج بھی سلف صالحین کے طریقے کے خلاف ہے۔ محض حَرَمَیْن میں اس کا ہونا اس کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتا، اس کے لیے شرعی دلیل کی ضرورت ہے۔ احادیث میں فرض نمازوں میں تو دعائے قنوتِ نازلہ کا ثبوت موجود ہے، نبی ﷺ نے ایک موقع پر مسلسل ایک مہینے پانچوں نمازوں میں دعائے قنوتِ نازلہ پڑھی ہے، اس لیے فرض نمازوں میں تو اس کا جواز مُسلّمہ ہے لیکن وتروں میں اس کا جواز محلِ نظر ہے۔ بنابریں ہمارے خیال میں اس رجحان کی بھی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے نہ کہ حوصلہ افزائی۔ بعض لوگ اس کے لیے صحیح ابن خزیمہ کی ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے جماعت تراویح کا اہتمام شروع ہوا تو (آخری) نصف رمضان میں وہ قنوت نازلہ پڑھتے تھے۔ (حدیث: 1100) یہ البتہ عہد صحابہ کی ایک نظیر ہے جس پر عمل کی گنجائش ہے۔ لیکن اس کے لیے مناسب طریقہ یہ لگتا ہے کہ اس میں قنوت نازلہ سے تجاوز نہ کیا جائے، یعنی اس کو کافروں کے لیے بددعا، مسلمانوں کی مغفرت اور ان کی فتح و نصرت کی دعا ہی تک محدود رکھا جائے، اس میں دیگر تمام دعاؤں کو شامل کر کے زیادہ سے زیادہ لمبا نہ کیا جائے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ اگر اس کی ضرورت سمجھی جائے تو عشاء یا فجر کے فرضوں میں اس کا اہتمام کیا جائے جو حدیث کے مطابق ہوگا اور زیادہ صحیح ہوگا۔

شبینہ کا اہتمام

رمضان المبارک کے آخری عشرے میں، بالخصوص اس کی طاق راتوں میں شبینے کا اہتمام بھی عام ہے۔ اس میں بعض جگہ تو ایک ہی حافظ صاحب ہوتے ہیں جو ایک ایک رات میں دس دس یا اس سے کم وبیش پارے پڑھتے ہیں، اس طرح زیادہ سے زیادہ تین راتوں میں قرآن مجید ختم کردیا جاتا ہے۔ ان صاحب کی رفتار بالعموم اتنی تیز اور الفاظ وحروف کی ادائیگی ایسی ہوتی ہے کہ یَعْلَمُونَ، تَعْلَمُونَ کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ظاہر بات ہے اس طرح قرآن کا پڑھنا سننا باعثِ اجر نہیں بلکہ موجبِ عتاب ہی ہوسکتا ہے۔

بعض جگہ مختلف حفاظ ہوتے ہیں جو ایک ایک یا دو دو پارے پڑھتے ہیں، ان کی قراءت میں قدرے ٹھہراؤ اور سکون ہوتا ہے، اس لیے ان کا اندازِ قراءت تو بالعموم قابل اعتراض نہیں ہوتا لیکن اس طرح اجتماعی طور پر شبینوں کا اہتمام ہمیں صحابہ وتابعین کے دور میں نہیں ملتا۔ گویا یہ بھی انفرادی عبادت ہے۔ ایک شخص قیام اللیل میں جتنی لمبی قراءت کرنا چاہے کرسکتا ہے، مستحسن اور مسنون امر ہے۔ یا ویسے ہی زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھتا ہے (بشرطیکہ تجوید اور حسنِ صوت کا خیال رکھتا ہے) تو یہ بھی مستحسن ہے۔ لیکن شبینے کی صورت میں قرآن خوانی کا طریقہ سلف سے ثابت نہیں، اس لیے اس سے بھی اجتناب کی ضرورت ہے۔

سہ روزہ یا پانچ روزہ تراویح

چند سالوں سے جلد سے جلد قرآن مجید ختم کرنے کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا ہے جو کراچی میں عام ہوتا جارہا ہے اور وہ یہ کہ تراویح میں پورے مہینے کی بجائے چند روز میں قرآن مجید ختم کرنا۔ اس میں لوگ چند روز (تین یا پانچ دن) میں پورا قرآن مجید

سن کر رمضان المبارک کے باقی ایام میں غالباً کاروبار کے لیے فارغ ہوجاتے ہیں۔ اس میں ایک ہی حافظ صاحب ہوتے ہیں اور وہ 20 رکعتوں میں 10 یا 8 پارے پڑھتے ہیں، اس لیے نہ قراءت صحیح ہوتی ہے نہ رکوع و سجود ہی۔ سب کچھ، تُو چل میں آیا، کے انداز میں ہوتا ہے۔ اس طرح قرآن کا بھی حلیہ بگاڑا جاتا ہے اور نماز کا بھی۔ اللہ تعالیٰ ایسے اماموں اور مقتدیوں کو ہدایت نصیب فرمائے۔

باجماعت نمازِ تسبیح کا اہتمام؟

رمضان المبارک میں باجماعت نمازِ تسبیح کا بھی بڑا رواج ہے حتیٰ کہ عورتوں میں بھی یہ سلسلہ عام ہے۔ نمازِ تسبیح نفلی نماز ہے اور نماز تہجد، جو نفلی نماز ہے، ایک دفعہ گھر میں موجود ایک شخص کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے جماعت کے ساتھ پڑھی ہے۔ اسی طرح ایک اور موقع پر ایک گھر میں بھی برائے حصولِ برکت گھر میں موجود افرادِ خانہ کے ساتھ باجماعت دو رکعت نفل آپ نے ادا فرمائے ہیں۔ یہ سب اتفاقی واقعات ہیں، ان سے خصوصی اہتمام کر کے نفلی نماز کی جماعت کا اثبات نہیں ہوسکتا جیسا کہ نمازِ تسبیح کو جماعت کے ساتھ پڑھنے کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ بنابریں ہمارے خیال میں یہ ایک نفلی نماز ہے، اس کو انفرادی طور پر ہی پڑھنا صحیح ہے۔ واللہ اُعلم۔

قضائے عمری کی نماز پڑھنا جائز نہیں

رمضان المبارک کے آخری جمعہ (جمعۃ الوداع) کے دن بعض غیر مشروع چیزیں عوام میں اکثر مروج ہیں ان میں سے ایک ''نماز قضائے عمریٰ'' بھی ہے جس کی فضیلت کے بارے میں بریلوی آرگن ''رضائے مصطفیٰ'' گوجرانوالہ کی ایک اشاعت میں لکھا گیا ہے:

(ا) ’’جس شخص کی فرض نمازیں قضا ہوگئی ہوں، اگر وہ اپنے اس فعل پر نادم وشرمندہ ہوکر توبہ کرے اور قضا شدہ نمازوں کو پڑھ لے اور پھر قضائے عمری کے نوافل پڑھے تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے قضائے عمری کی وجہ سے اس کی نمازیں قضا ہونے اور ان میں تاخیر ہونے کا جو گناہ ہوا تھا وہ گناہ معاف بلکہ نیکی میں تبدیل ہوجائے گا۔ نوافل قضائے عمری کی ترکیب یہ ہے کہ جمعہ (جمعۃ الوداع) کے دن ظہر وعصر کے درمیان بارہ رکعت نفل پڑھے اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ، آیت الکرسی، قل ھو اللہ احد اور سورۂ فلق وسورۂ ناس ایک ایک بار پڑھے۔

(ب) جس کی نمازیں قضا ہوگئی ہوں اسے چاہیے کہ پیر کی رات کو پچاس رکعت نفل پڑھے اور فارغ ہوکر رسول اللہ ﷺ پر ایک سو بار درود شریف پڑھے، اس سے خدا تعالیٰ ان سب نمازوں (کی قضا کے گناہ) کا کفارہ ادا کردے گا۔ اگرچہ سو برس کی کیوں نہ ہوں۔‘‘[1]

مذکورہ اقتباس کی وضاحت

اقتباس بالا میں قضائے عمری کی جو ’’فضیلت اور اجروثواب‘‘ بیان کیا گیا ہے وہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ اس سلسلے میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں خود حنفی علماء نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ موضوع (من گھڑت) ہیں اور من گھڑت احادیث سے نہ کوئی مسئلہ ثابت ہوتا ہے اور نہ کوئی اجروثواب، چنانچہ مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں:

«حَدِيثُ مَنْ قَضٰى صَلَوَاتٍ مِّنَ الْفَرَائِضِ فِي آخِرِ جُمُعَةٍ مِّنْ

[1] ماہنامہ ’رضائے مصطفیٰ‘ گوجرانوالہ، شمارہ رمضان وشوال 1401ھ، ص:9.

رَمَضَانَ كَانَ ذٰلِكَ جَابِرًا لِكُلِّ صَلٰوةٍ فَائِتَةٍ فِي عُمُرِهِ إِلٰى سَبْعِينَ سَنَةً، قَالَ عَلِيُّ الْقَارِي فِي مَوْضُوعَاتِهِ الصُّغْرٰى وَالْكُبْرٰى: بَاطِلٌ قَطْعًا لِأَنَّهُ مُنَاقِضٌ لِلْإِجْمَاعِ عَلٰى أَنَّ شَيْئًا مِّنَ الْعِبَادَاتِ لَا يَقُومُ مَقَامَ فَائِتَةِ سَنَوَاتٍ، ثُمَّ لَا عِبْرَةَ بِنَقْلِ صَاحِبِ النِّهَايَةِ وَلَا بَقِيَّةِ شُرَّاحِ الْهِدَايَةِ لِأَنَّهُمْ لَيْسُوا مِنَ الْمُحَدِّثِينَ وَلَا أَسْنَدُوا الْحَدِيثَ إِلٰى أَحَدٍ مِّنَ الْمُخَرِّجِينَ اِنْتَهٰى. وَذَكَرَهُ الشَّوْكَانِيُّ فِي الْفَوَائِدِ الْمَجْمُوعَةِ فِي الْأَحَادِيثِ الْمَوْضُوعَةِ بِلَفْظِ مَنْ صَلّٰى فِي آخِرِ جُمُعَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ الْخَمْسَ الصَّلَوَاتِ الْمَفْرُوضَةِ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ قَضَتْ عَنْهُ مَا أَخَلَّ بِهِ مِنْ صَلٰوةِ سَنَةٍ وَقَالَ: هٰذَا مَوْضُوعٌ بِلَاشَكٍّ وَلَمْ أَجِدْهُ فِي شَيْءٍ مِّنَ الْكُتُبِ الَّتِي جَمَعَ مُصَنِّفُوهَا فِيهَا الْأَحَادِيثَ الْمَوْضُوعَةَ وَلٰكِنِ اشْتَهَرَ عِنْدَ جَمَاعَةٍ مِّنَ الْمُتَفَقِّهَةِ بِمَدِينَةِ صَنْعَاءَ فِي عَصْرِنَا هٰذَا وَصَارَ كَثِيرٌ مِّنْهُمْ يَفْعَلُونَ ذٰلِكَ وَلَا أَدْرِي مَنْ وَّضَعَ لَهُمْ، فَقَبَّحَ اللّٰهُ الْكَذَّابِينَ. وَقَالَ الْعَلَّامَةُ الدِّهْلَوِيُّ فِي رِسَالَتِهِ الْعُجَالَةِ النَّافِعَةِ عِنْدَ ذِكْرِ قَرَائِنِ الْوَضْعِ: اَلْخَامِسُ أَنْ يَّكُونَ مُخَالِفًا لِمُقْتَضَى الْعَقْلِ وَتُكَذِّبُهُ الْقَوَاعِدُ الشَّرْعِيَّةُ مِثْلُ الْقَضَاءِ الْعُمُرِيِّ وَنَحْوِ ذٰلِكَ اِنْتَهٰى مُعَرَّبًا......»

خلاصۂ ترجمہ یہ ہے کہ ''قضائے عمری والی روایت بالکل باطل ہے اور اجماع کے بھی مخالف ہے کیونکہ کوئی عبادت بھی کئی سالوں کی فوت شدہ نمازوں کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔

جن فقہاء (صاحبِ نہایہ اور دیگر شارحینِ ہدایہ) نے یہ روایت نقل کی ہے، ان کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے کہ ایک تو وہ خود محدث نہیں، دوسرا انھوں نے کسی امام و محدث کا حوالہ نہیں دیا جس نے اپنی کسی کتاب میں اس حدیث کی تخریج کی ہو۔

ملاّ علی قاری حنفی، مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے بھی اس حدیث کو من گھڑت قرار دیا ہے۔''[1]

علاوہ ازیں مولانا عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ نے جمعۃ الوداع کی بدعات کے ردّ میں ایک خاص رسالہ ''ردع الإخوان عن محدثات آخر جمعة رمضان'' لکھا ہے جو مجموعہ الرسائل الخمس میں شامل ہے، اس میں بڑی تفصیل سے عقلی و نقلی دلائل کی روشنی میں نوافل قضائے عمری کا باطل ہونا ثابت کیا ہے، اس رسالے میں بحث کے آخر میں لکھتے ہیں:

«وَخُلَاصَةُ الْمَرَامِ فِي هٰذَا الْمَقَامِ أَنَّ الرِّوَايَاتِ فِي قَضَاءِ الْعُمُرِيِّ مَكْذُوبَةٌ وَ مَوْضُوعَةٌ وَالْاِهْتِمَامُ بِهٖ مَعَ اعْتِقَادِ تَكْفِيرِ مَامَضٰى بِدْعَةٌ بَاطِلَةٌ»

''خلاصۂ بحث یہ ہے کہ قضائے عمری سے متعلق روایات جھوٹی من گھڑت ہیں اور پچھلے گناہوں کے کفارے کی نیت سے اس کا اہتمام کرنا ایک بدعتِ باطلہ ہے۔''[2]

مولانا لکھنوی مرحوم نے ملاّ علی قاری حنفی کی جو عبارت نقل کی ہے وہ ان کی دونوں کتابوں (جن میں موضوع احادیث کو جمع کیا گیا ہے) میں موجود ہے۔ پہلی کتاب الأسرار المرفوعة في الأخبار الموضوعة ہے (جو موضوعات کبیر کے نام سے

[1] الآثار المرفوعة في الأخبار الموضوعة اور مجموعة إمام الكلام، ص: 315 طبع لكهنؤ.

[2] مجموعة الرسائل الخمس، ص: 61، طبع لكهنؤ 1337ھ۔

مشہور ہے) مذکورہ عبارت اس کے صفحہ 356 (طبع بیروت 1971ء) میں ہے اور دوسری کتاب المصنوع في معرفة الحديث الموضوع ہے (جو موضوعاتِ صغریٰ کے نام سے مشہور ہے) اس کے صفحہ 191 (طبع بیروت 1978ء) پر حدیث قضائے عمری کو باطل اور موضوع بتلایا گیا ہے، اسی طرح امام شوکانی رحمہ اللہ کی جس عبارت کا حوالہ مولانا لکھنوی کی عبارت میں آیا ہے وہ قاضی شوکانی کی کتاب "الفوائد المجموعة في الأحاديث الموضوعة" (طبع مصر 1960ء) کے صفحہ 54 پر موجود ہے۔

بہر حال خود حنفی علمائے کرام کی صراحت کے مطابق حدیث قضائے عمری بالکل بے اصل اور من گھڑت ہے۔ اس پر عمل بدعت کے دائرے میں آئے گا جو حسبِ فرمانِ رسول ﷺ: «مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ»[1] مردود اور موجب گناہ ہے۔

عید کارڈ ایک تاریخی وضاحت

عید کے موقع پر "عید کارڈ" ایک دوسرے کو بھیجنے کا بھی بڑا رواج ہے۔ یہ رسم بھی اصلاح طلب ہے، اس میں متعدد قباحتیں پائی جاتی ہیں۔

1. یہ سراسر فضول خرچی ہے جو قرآن کریم کی رُو سے شیطان کے بھائی بندوں کا کام ہے۔
2. اس میں غیروں کی مشابہت ہے۔ عید کارڈ انگریزوں کے کرسمس کارڈ کی نقل ہے۔
3. اس کو مسلمانوں میں پھیلانے میں بنیادی کردار بھی انگریزوں ہی کا ہے۔ اس کے لیے ذیل کا ایک تاریخی حوالہ پیش خدمت ہے۔

[1] صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح......، حديث: 2697 و صحيح مسلم، حديث: 1718.

انگریز نے یہ رسم کس طرح شروع کی؟ اس کے بنیادی کردار کا اعترافِ جرم ملاحظہ فرمائیں:

کراچی کے اخبار روزنامہ ''نئی روشنی'' کے مالک و مدیر جی اے چوہدری کے والد احمد بخش چوہدری کہتے ہیں:

''مجھے اعتراف ہے کہ ایک دور تھا جب میں کسی مجبوری کے تحت حکومت برطانیا کا آلۂ کار تھا، میں برصغیر میں انگریزوں کے مفادات کے لیے مختلف کام انجام دیتا تھا، جس کے عوض مجھے معاشی سہولتوں کے علاوہ دیگر مراعات بھی حاصل تھیں، جیسے ہی پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی مجھے محکمہ داخلہ کے انگریز سیکریٹری نے عید کارڈ دکھائے جو بطورِ خاص انگلینڈ سے چھپ کر آئے تھے، ان پر خانہ کعبہ، مسجد نبوی، کلمہ طیبہ اور براق وغیرہ کی خوب صورت رنگین تصویریں تھیں، مجھے کہا گیا کہ یہ تمام عید کارڈ ایک دھیلے میں فروخت کرنا ہوں گے، بعد ازاں حکومت برطانیا مجھے ہر فروخت شدہ کارڈ کے عوض ایک ٹکا (دو پیسے) دے گی، بشرطیکہ میں 5 ہزار عید کارڈ فروخت کروں۔ مجھے سختی سے تنبیہ کی گئی کہ میں کسی کو بھی کوئی عید کارڈ بلا قیمت نہ دوں، ورنہ میرے حق میں اچھا نہ ہوگا، حکومت کا خصوصی کارندہ ہونے کی بنا پر مجھے پورے برصغیر میں ٹرین پر مفت سفر کی سہولت تھی، میں نے مزید تین افراد کے لیے بھی مفت سفر کی سہولت حاصل کر لی، اب مجھے کارڈ فروخت کرنے پر ایک دھیلہ ملنا تھا، سفر مفت تھا، یعنی ''چپڑی اور وہ بھی دو دو۔''

رمضان المبارک کے دوران، میں اور میرے یہ تینوں ساتھی دہلی سے کلکتہ تک سفر کے لیے نکل گئے اور ہر بڑے اسٹیشن پر اتر کر کتابوں اور اسٹیشنری کی دکانوں پر جا کر عید کارڈ فروخت کیے اور ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں پانچ ہزار سے کچھ زاید عید کارڈ فروخت کر دیے، جس کا گوشوارہ محکمہ داخلہ کو دے کر واجبات وصول کر لیے گئے۔

بقر عید کی آمد سے ایک ماہ پہلے ہم پھر مہم پر نکلے، اس مرتبہ ہم نے کراچی سے راس کماری تک عید کارڈ فروخت کیے، اگلے برس محکمہ داخلہ نے بیس ہزار عید کارڈ دیے، اس دفعہ مذہبی تصاویر کے ساتھ ایسے کارڈ بھی دیے گئے جن پر خوب صورت بچوں، پھلوں اور پھولوں کی تصویریں تھیں، ان بچوں کو عربی لباس پہنائے گئے تھے، حالانکہ وہ شکل وصورت سے انگریز بچے ہی لگتے تھے، یہ بھی بہ آسانی فروخت ہوگئے۔

تیسرے برس جو کارڈ ملے ان میں بچوں اور بچیوں کے لباس مختصر اور جدید فیشن کے مطابق کردیے گئے، چوتھے برس ہم نے پچاس ہزار سے زائد کارڈ فروخت کیے۔

یوں ہم نے اچھی خاصی دولت کمائی۔ جب ہم حساب کرنے لگے تو سیکریٹری صاحب نے رقم ادا کرنے کے بعد کہا کہ آئندہ کوئی کارڈ نہیں ملے گا، اگر اس سلسلے کو جاری رکھنا چاہو تو تم خود چھپوالو، اگلے رمضان المبارک سے پہلے ہی پورے برصغیر کے کتب فروشوں کے خطوط اور آرڈر موصول ہونے لگے، اب ہم مالی لحاظ سے اس قابل ہوگئے کہ اس کاروبار کو خود جاری رکھ سکتے تھے، ہم نے مختلف چھاپہ خانوں سے عید کارڈ چھپوائے، اگرچہ ان عید کارڈوں کی چھپائی انگلینڈ کے معیار کی نہیں تھی، تاہم پھر بھی اچھی خاصی تعداد میں نکاسی ہوگئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور بے شمار چھاپہ خانوں نے عید کارڈ چھاپنے شروع کردیے، یوں یہ منافع بخش کاروبار، وبا کی طرح پورے ملک میں پھیل گیا۔“

چوہدری صاحب نے ایک سرد آہ بھر کر کہا:

”مجھے کافی عرصہ کے بعد احساس ہوا کہ سرکارِ برطانیا نے ایک بے حد مذموم مقصد کے لیے مجھے آلۂ کار بنایا ہے۔ میں نادم ہوں کہ میں نے ایک بری رسم کا آغاز کیا، جو سراسر اسرافِ بے جا ہے، آج عید کارڈوں کی وجہ سے کروڑوں

مسلمان کئی کروڑ روپے اس قبیح رسم پر ضائع کر دیتے ہیں، آج جب میں دیکھتا ہوں کہ عید کارڈوں پر نیم عریاں تصاویر شائع ہو رہی ہیں، تو میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں کہ اس فحاشی کا آغاز میرے ہاتھوں ہوا، میں نے سرکارِ برطانیا کے لیے بڑے بڑے کام کیے، لیکن عید کارڈ کی رسم بد سے بڑا اور قوم دشمن کام کوئی نہیں کیا، یہ گناہِ عظیم ہے، آپ سب میری بخشش کے لیے دعا کریں اور یہ بھی کوشش کریں کہ زندگی کے کسی بھی مرحلے پر میری طرح ملت فروشی کے فعل قبیح میں ملوث نہ ہوں۔''

یہ واقعہ چوہدری احمد بخش نے اپنے بیٹے کے روزنامہ ''نئی روشنی'' کے عملے کو 1962ء کے اواخر میں اس وقت سنایا، جب عملے نے ان کے اعزاز میں ایک چائے پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ اس واقعے کو حارث غازی، اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ ''نئی روشنی'' نے قلم بند کیا اور آخر میں لکھا کہ میں نے یہ واقعہ سننے کے بعد 1962ء کے بعد سے کسی کو کبھی کوئی عید کارڈ نہیں بھیجا۔ (بشکریہ ہفت روزہ الاعتصام، لاہور جلد 57، شمارہ 41، 21 اکتوبر 2005ء)

عید، یومِ مسرّت اور یومِ محاسبہ

عید آتی ہے تو لوگ تیاریوں میں مصروف یا اس کی مصروفیتوں میں محو ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک مذہبی تقریب ہے جس پر ہر مسلمان کا مسرور ہونا ایک امر طبعی ہے لیکن مسلمان کی غمی خوشی بھی، دوسری قوموں کے برعکس، آخرت کی کامیابی یا ناکامی کے ساتھ مربوط ہے۔ بہ فحوائے الدنیا مزرعة الآخرة جس مسلمان نے اس دنیا میں رہ کر اپنے اللہ کو راضی کر لیا یقیناً وہ کامیاب و بامراد ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ [1]

عید کے پُرمسرّت موقع پر ہمیں یہی سوچنا ہے کہ کیا رمضان المبارک کے تقاضے پورے کر کے ہم نے اپنے اللہ کو راضی کر لیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً ہم بہت خوش نصیب ہیں اور دائمی مسرت (جنت) کے حقدار۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو عید کی مسرتوں سے ہمارا کیا تعلق! ہمیں تو خوشی منانے کا حق ہی نہیں ہے۔ مسلمان کی خوشی نئے لباس اور انواع و اقسام کے کھانوں اور فواکہ ومشروبات میں نہیں، صرف رضائے الٰہی کے حصول میں منحصر ہے، یہی حاصل نہ ہوئی تو یہ لذائذ دنیا اور سامانِ راحت ونشاط ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ [2] کے مطابق دھوکے کی ٹٹی ہے...... یہی وہ پہلو ہے جس کی طرف نبی ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی ہے، فرمایا:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ فَعَرَفَ حُدُودَهُ وَ تَحَفَّظَ مِمَّا كَانَ يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَّتَحَفَّظَ فِيهِ كَفَّرَ مَا قَبْلَهُ»

''جس مسلمان نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے تقاضے پورے کیے اور ہر احتیاط کو ملحوظ رکھا تو اس کے گزشتہ سب گناہ معاف ہو گئے۔'' [3]

دوسری روایت میں ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَعِدَ الْمِنْبَرَ فَقَالَ: آمِين، آمِين، آمِين، قِيلَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّكَ صَعِدْتَّ الْمِنْبَرَ فَقُلْتَ: آمِين، آمِين، آمِين،

[1] آل عمرٰن 3:185. [2] آل عمرٰن 3:185. [3] مجمع الزوائد: 3/347، طبع جديد، 1994ء، والموسوعة الحديثية (مسند أحمد:) 18/84، حديث: 11524، و لطائف المعارف للحافظ ابن رجب رحمه الله، ص: 197.

فَقَالَ: إِنَّ جِبْرِيلَ أَتَانِي، فَقَالَ: مَنْ أَدْرَكَ شَهْرَ رَمَضَانَ فَلَمْ يُغْفَرْلَهُ فَدَخَلَ النَّارَ فَأَبْعَدَهُ اللّٰهُ، قُلْ: آمِين. فَقُلْتُ: آمِين»

''ایک دفعہ نبی ﷺ نے منبر پر چڑھتے ہوئے تین مرتبہ آمین، آمین، آمین کہا، آپ سے سوال ہوا کہ آپ نے منبر پر چڑھتے ہوئے آمین، آمین، آمین کہا (یہ کیوں؟) آپ نے فرمایا: میرے پاس جبریل آئے اور کہا: جو شخص رمضان پائے، پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہو جائے اور نتیجتاً آگ میں داخل ہو جائے، ایسے شخص کو اللہ ہلاک کرے، پھر جبریل نے مجھ سے کہا: آمین کہیے، تو میں نے آمین کہہ دی (اے اللہ! جبریل کی یہ بددعا قبول فرمالے)۔''[1]

اس سے معلوم ہوا کہ عید کی مسرتوں کے ساتھ ہر مسلمان کو اپنا محاسبہ بھی کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے حضور عجز و نیاز کر کے اپنی کوتاہیوں کی معافی بھی طلب کرنی چاہیے کہ یہ دن صرف یومِ مسرت، روزِ بشارت ہی نہیں، یومِ محاسبہ اور لمحۂ فکر یہ بھی ہے۔
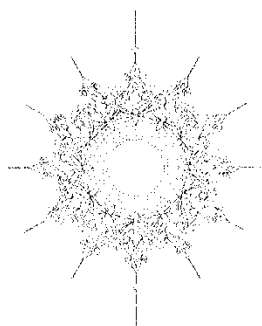
[1] صحیح ابن خزیمة و ابن حبان بحوالہ، صحیح الترغیب، حدیث: 1679.

۱۰
شوال
فضائل واعمال اور رسومات

شوال

وجہ تسمیہ

رمضان المبارک کے بعد، اسلامی سال کا دسواں مہینہ شوال ہے۔ یہ شَوَل سے ہے جس کے معنی بلند کرنے کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ عرب میں اس مہینے میں اونٹنی اپنی دُم بلند کرتی ہے، اس لیے اس مہینے کو شوال کہا جاتا ہے۔

«سُمِّيَ بِذٰلِكَ لِشَوْلَانِ النَّاقَةِ فِيهِ بِذَنَبِهَا»

فضائل

حج کے تین مہینوں میں ایک مہینہ شوال ہے۔

عیدالفطر

اسی مہینے کی یکم تاریخ کو عیدالفطر ہوتی ہے جو مسلمانوں کی دو عیدوں میں سے پہلی عید ہے۔ فِطر کے معنی ہوتے ہیں، روزہ چھوڑ دینا۔ چونکہ شوال کا چاند دیکھتے ہی رمضان المبارک کے روزے ختم ہوجاتے ہیں، اس لیے اسے عید الفطر کہا جاتا ہے، یعنی وہ عید جو رمضان کے روزوں کے خاتمے پر ہوتی ہے۔

اس عید کا مقصد اس امر پر خوشی کا اظہار اور بارگاہِ الٰہی میں تشکر کا اعتراف ہے کہ اللہ نے رمضان المبارک کے جو روزے ہم پر فرض کیے تھے، وہ اللہ کی توفیق سے ہم

نے پورے کر لیے ہیں۔ اس موقع پر مسلمان عید گاہ (کھلے میدان) میں جمع ہو کر دوگانہ بھی ادا کرتے ہیں اور اللہ کی عظمت و کبریائی کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ اسی لیے عید پر مسلمان بایں الفاظ اللہ کی تکبیرات بلند کرتے ہیں:

«اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ»

عید الفطر کی رات اور دن کے بارے میں موضوع اور ضعیف احادیث
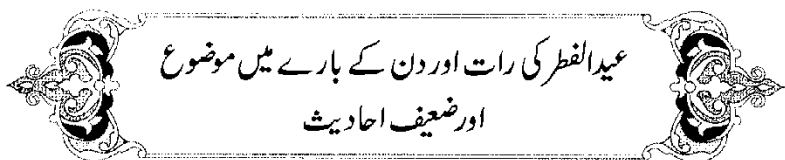
1 نبی ﷺ نے فرمایا: جس نے عید الفطر کی رات سو رکعت نفل نماز ادا کی، ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ ایک دفعہ اور سورۂ اخلاص دس مرتبہ پڑھی اور رکوع اور سجدے میں «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ» دس دس بار پڑھا اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد سو بار استغفار کیا، پھر سجدہ کیا اور اس میں کہا:

«يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ يَا ذَالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ، يَا رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَرَحِيمَهُمَا، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ يَا إِلٰهَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ، اغْفِرْلِي ذُنُوبِي وَتَقَبَّلْ صَوْمِي وَصَلَاتِي»

اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے! کہ وہ ابھی سجدے سے سر بھی نہیں اٹھاتا اس سے پہلے اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتا ہے اور رمضان کے مہینے کو قبول فرما لیتا ہے اور اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے اگرچہ اس نے ستر ایسے گناہ کیے ہوں کہ ہر گناہ ساری آگ سے بھی بڑا ہو۔ اور اس کے علاقے کے تمام لوگوں کی طرف

سے رمضان کے مہینے کو قبول کر لیتا ہے۔ نبی علیہ السلام فرماتے ہیں: ''میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: اے جبریل! اس کی طرف سے خصوصی طور پر اور اس کے علاقے کے لوگوں سے عمومی طور پر رمضان کا مہینہ قبول فرماتا ہے؟'' تو جبریل علیہ السلام نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے! جو بھی یہ نماز پڑھ لیتا ہے اللہ اس کے روزے اور نمازیں قبول فرما لیتا ہے کیونکہ اللہ عزوجل نے اپنی کتاب قرآن مجید میں فرمایا ہے: ﴿اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا۝﴾ مزید فرمایا: ﴿تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ اور فرمایا: ﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝﴾ اور مزید فرمایا: ﴿وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۝﴾ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ میری امت کے مردوں اور عورتوں کے لیے ہے۔ اور میری امت سے پہلے یہ کسی کو نصیب نہیں ہوا۔''[1]

2 حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے عید الفطر کے دن عید کی نماز پڑھنے کے بعد چار رکعات نفل نماز ادا کی اور اس کی پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ اعلیٰ پڑھی اور دوسری رکعت میں ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا۝﴾ (سورۂ شمس) پڑھی اور تیسری میں سورۂ ضحیٰ پڑھی اور چوتھی میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۝﴾ (سورۂ اخلاص) پڑھی تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر نازل ہونے والی تمام کتابیں پڑھ لیں اور گویا اس نے تمام یتیموں کو کھانا کھلایا اور ان کی صفائی ستھرائی کا اہتمام بھی کیا۔ اور اسے پوری کائنات کی چیزوں کی مانند اجر ملے گا اور پچاس سال کے گناہ بھی معاف کر دیے جائیں گے۔''[2]

[1] اس روایت کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں۔ دیکھیے: الموضوعات لابن الجوزي:2/53,52، واللآلي المصنوعة في الأحاديث الموضوعة:2/61,60. [2] یہ حدیث موضوع ہے، دیکھیے: الموضوعات لابن الجوزي:2/54,53.

3 عیدالفطر کی نماز کے بعد بارہ رکعات نفلی نماز پڑھنا سنت ہے اور عیدالاضحیٰ کی نماز کے بعد چھ رکعات نفلی نماز پڑھنا سنت ہے۔[1]

4 جو آدمی چار راتیں بیدار رہا (بیدار رہ کر عبادت کی) اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے: ترویہ کی رات، عرفہ کی رات، قربانی کی رات اور عیدالفطر کی رات۔[2]

5 جس نے عیدالفطر کے دن روزہ رکھا گویا کہ اس نے سارے زمانے کے روزے رکھے۔ امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔[3] ویسے بھی یہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت صحیح احادیث کے مخالف ہے جن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عیدالفطر اور عیدالأضحیٰ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔[4]

شش عیدی (شوال کے 6) روزے

اس مہینے کی بابت نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ»

''جس نے رمضان کے روزے رکھے، پھر اس کے پیچھے شوال کے چھ روزے رکھے تو وہ ایسے ہے جیسے اس نے ہمیشہ روزے رکھے۔''[5]

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چھ روزے اگرچہ نفلی ہیں لیکن ان کی اہمیت یہ ہے کہ

[1] امام شوکانی رحمہ اللہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے، دیکھیے: الفوائد المجموعة للشوكاني، ص: 52، حديث: 151. [2] امام ابن جوزی رحمہ اللہ اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے، دیکھیے: العلل المتناهية لابن الجوزي: 78/2، والسلسلة الضعيفة للألباني: 12/2، حديث: 522. [3] العلل المتناهية: 57/2. [4] اس مسئلہ کی تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: البدع الحولية، ص: 347.
[5] صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب صوم ستة أيام من شوال......، حديث: 1164.

ان کی وجہ سے ایک مسلمان اللہ کے ہاں ہمیشہ روزہ رکھنے والا شمار ہوگا۔اور وہ اس طرح کہ اللہ نے ہر نیکی کے لیے اپنے فضل وکرم کا حامل یہ ضابطہ بنایا ہے کہ وہ اس کا کم از کم اجر دس گنا ضرور دے گا (زیادتی کی حد سات سو گُنا بلکہ اس سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے)۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾

''جو ایک نیکی کرے گا، اسے دس نیکیوں کے برابر اجر ملے گا۔''[1]

اس حساب سے رمضان المبارک کے 30 روزے (10x30) تین سو دن کے روزوں کے برابر اور شوال کے چھ روزے (10x6) 60 (ساٹھ) دن کے روزوں کے برابر ہو گئے۔ اور قمری سال 360 دن کا ہوتا ہے۔گویا وہ ایسے ہے جیسے اس نے سارا سال روزوں کے ساتھ گزارا۔

شوال کے چھ روزوں کی اہمیت اور اس کے تقاضے

علاوہ ازیں رمضان المبارک کے روزوں اور اس کی راتوں کے قیام و شب خیزی کے بعد، شوال میں نفلی روزوں کا اہتمام اس بات کی علامت ہے کہ اس کے رمضان کے روزے اور اس کی عبادت اللہ کے ہاں شرفِ قبولیت سے نواز دی گئی ہے کیونکہ نیکی کے بعد نیکی کی توفیق مل جانا، عند اللہ پہلی نیکی کی قبولیت کی دلیل ہے، جیسے کسی نیکی کے بعد معصیت کا ارتکاب اس بات کی علامت ہے کہ اس کی نیکی کسی وجہ سے مردود ہوگئی ہے۔

اس معیار سے جب ہم اپنی رمضان المبارک کی عبادتوں اور روزوں کا جائزہ لیں تو

[1] الأنعام 160:6۔

نہایت المناک صورت حال سامنے آتی ہے کہ روزے داروں میں سے اکثر لوگ رمضان المبارک کے ختم ہوتے ہی نمازوں وغیرہ سے تعلق توڑ لیتے ہیں اور نہایت دیدہ دلیری سے معصیت آلود زندگی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان المبارک کے ختم ہوتے ہی مسجدوں کی وہ رونق بھی کم ہوجاتی ہے جو رمضان میں دیگر ایام کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہوجاتی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اکثریت کا یہ طرزِ عمل نہایت غلط اور رمضان المبارک کے سارے اچھے اثرات کو زائل کردینے والا ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ رمضان المبارک کے روزے اور اس مہینے کی عبادات سے ہمارے اخلاق و کردار کی اصلاح ہوتی ہے نہ ہمارے معمولاتِ زندگی میں کوئی تغیر واقع ہوتا ہے۔ جو جس ڈگر پر چل رہا ہوتا ہے وہ بدستور اسی پر قائم رہتا ہے اور اصلاح احوال اور تبدیلی کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔ اس کی بنیادی وجہ ہماری یہ سوچ اور طرزِ عمل ہی ہے کہ رمضان المبارک کے ختم ہوتے ہی ہم دوبارہ بلا تأمل اللہ کی نافرمانی کا راستہ اختیار کرلیتے ہیں اور بعض تو روزے کی حالت میں بھی روزے کے منافی تمام کام کرتے رہتے ہیں، یوں رمضان کے روزے ان کے اوپر سے ایسے گزر جاتے ہیں جیسے چکنے گھڑے کے اوپر سے پانی گزر جاتا ہے، اس پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ٹھہرتا۔

بنا بریں رمضان المبارک کے بعد نفلی روزوں کا اہتمام اس بات کی یاددہانی کراتا ہے کہ رمضان کے فرضی روزوں اور اس کی راتوں کے قیام کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ سے جو رابطہ و تعلق استوار ہوا ہے، اسے نہ صرف قائم رکھا جائے بلکہ اسے روز افزوں کیا جائے۔ اور جو شخص شعوری طور پر اس کی کوشش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ یقیناً اس کی مدد کرتا اور اسے ایمان و روحانیت کے اعلیٰ مدارج پر فائز فرما دیتا ہے۔

اس لیے ہر مسلمان کو رمضان المبارک کے بعد صرف یہ چھ روزے ہی نہیں رکھنے چاہئیں بلکہ اس روح اور جذبے کو بھی برقرار رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے جو اس میں کارفرما ہے تاکہ وہ ﴿ ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ﴾ کا عملی نمونہ بن سکے۔

مسنون اعمال

یکم شوال کو باہر کھلے میدان میں نماز عیدالفطر ادا کرنا، نماز عید کے لیے نکلنے سے پہلے فطرانہ ادا کرنا۔ عید کے لیے غسل کرنا، نیا یا دُھلا ہوا لباس پہننا، خوشبو کا اہتمام کرنا۔ امام کے مصلے پر آنے تک تکبیرات پڑھنا۔ عید کے موقع پر مسلمان بھائی کو ملتے ہوئے تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَمِنْكُمْ کہنا اور پورے مہینے میں چھ روزے رکھنا۔

رسوم ورواج

شب عید کو عظمت وفضیلت والی رات سمجھتے ہوئے اس میں خصوصی عبادت کرنا، نماز عید کے بعد فطرانہ ادا کرنا، بلا عذر مسجد میں نماز عید ادا کرنا، شوال کے کچھ روزے رکھ کر پھر عید منانا یا عید کے دوسرے دن (ٹرُوکو) ایک روزہ رکھنے کو بقیہ شوال کے نفلی روزے رکھنے کے لیے ضروری سمجھنا، شوال کو منحوس سمجھنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

عیدالفطر کی رات کی فضیلت میں جتنی بھی روایات ہیں سب ضعیف ہیں، اس لیے اس کی خصوصی فضیلت سمجھتے ہوئے اس میں عبادت کرنا نبیٔ اکرم ﷺ، صحابہ اور تابعین سے ثابت نہیں۔

فطرانے کا وقت نبیٔ کریم ﷺ نے نماز عید کے لیے نکلنے سے پہلے تک کا بتایا ہے، لہٰذا جو صدقہ بعد میں دیا جائے گا وہ حدیث کی رو سے صدقۂ فطر نہیں بلکہ عام صدقہ ہوگا۔

نمازِ عید کے بارے میں آپ ﷺ کا اسوہ تو یہی ہے کہ آپ نے بغیر مجبوری کے ہمیشہ نماز باہر کھلے میدان (عید گاہ) میں ادا کی ہے اور اس کی تاکید بھی فرمائی حتی کہ پردہ دار اور ایام مخصوصہ والی عورتوں کو بھی نکلنے اور عید گاہ میں حاضر ہو کر مسلمانوں کی دعاؤں میں شامل ہونے کا حکم دیا ہے۔ اب جو مسجد میں عید پڑھنے کو معمول بنالیتا ہے تو یہ سنت کے خلاف عمل ہے جو کہ بدعت کے زمرے میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں سنت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ شوال کے چھ روزے رکھنے کے بعد پھر عید منانا یہ بھی ہماری غلط سوچ ہے کیونکہ کسی بھی حدیث میں اس کا ذکر تک نہیں ملتا، لہٰذا جو عمل نبی اکرم ﷺ، صحابہ کرام اور تابعین سے ثابت ہی نہیں، وہ کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے؟ اللہ ہمیں کامل دین پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عربوں کے ہاں اس مہینے کو بھی منحوس سمجھا جاتا تھا

عربوں میں بداعتقادی کی جو بیماری عام تھی، اس کی وجہ سے وہ اس مہینے کو بھی منحوس سمجھتے اور اس مہینے میں شادی کو براشگون خیال کرتے تھے۔ اسی بداعتقادی کی تردید کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

«تَزَوَّجَنِي رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي شَوَّالٍ وَبَنٰى بِي فِي شَوَّالٍ، فَأَيُّ نِسَاءِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ كَانَ أَحْظٰى عِنْدَهُ مِنِّي؟ قَالَ: وَكَانَتْ عَائِشَةُ تَسْتَحِبُّ أَنْ تُدْخِلَ نِسَائَهَا فِي شَوَّالٍ»

”رسول اللہ ﷺ کا میرے ساتھ نکاح بھی شوال کے مہینے میں ہوا اور آپ کے ساتھ میری رخصتی بھی اسی مہینے میں ہوئی۔ پس رسول اللہ ﷺ کی بیویوں میں سے کون سی بیوی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے نزدیک مجھ سے زیادہ عزیز

ہو؟ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس بات کو مستحب سمجھتی تھیں کہ اپنے خاندان کی عورتوں کو شوال ہی کے مہینے میں رخصت کریں۔'' [1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقصد عربوں کی بد اعتقادی کی نفی کرنا ہے کہ اگر شوال کا مہینہ منحوس ہوتا تو میری شادی اور رخصتی کیوں اتنی بابرکت ہوتی جو اسی مہینے میں ہوئی؟ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی مہینہ یا دن بھی منحوس نہیں ہے سب مہینے اور سب دن یکساں ہیں۔ شوال کے مہینے کو منحوس سمجھنا بدشگونی ہے جس سے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، آپ نے فرمایا: «لَا عَدْوٰى وَلَا طِيَرَةَ» ''نہ کوئی بیماری ہی متعدی ہوتی ہے اور نہ بدشگونی ہی لینا جائز ہے۔'' [2]

اور بدشگونی لینا شرک ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلطِّيَرَةُ شِرْكٌ» ''بدشگونی لینا شرک ہے۔'' [3]

معلوم ہوا کہ شوال کے مہینے کو منحوس سمجھنا مشرکین کا کام ہے۔
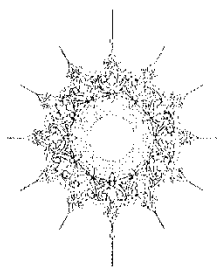
[1] صحیح مسلم، النکاح، باب استحباب التزوج والتزويج في شوال......، حدیث: 1423.

[2] صحیح البخاري، الطب، باب الجذام، حدیث: 5707، وصحیح مسلم، السلام، باب لاعدوی ولا طیرة......، حدیث: 2220. [3] مسند أحمد: 389/1.

۱۱, ۱۲
ذوالقعدہ
ذوالحجہ
فضائل واعمال اور رسومات

ذوالقعدہ اور ذوالحجہ

انھیں ذوالقعدہ یا ذی قعدہ اور ذوالحجہ یا ذی حجہ بھی لکھ اور بول لیتے ہیں۔ عربی میں ذو کے معنی، صاحب یا والا، کے ہوتے ہیں، جیسے ذوالمال (مال والا یا صاحب المال) ہے۔

ذوالقعدہ

وجہ تسمیہ

ذوالقعدہ اسلامی سال کا گیارہواں مہینہ ہے۔ قعدہ، قُعود سے ہے جس کے معنی بیٹھنے کے ہیں۔ عرب اس مہینے میں لڑائی نہیں لڑتے تھے، گویا گھروں میں بیٹھے رہتے تھے، اس لیے اس کا نام ذوالقعدہ پڑ گیا (بیٹھنے والا مہینہ)۔

فضائل

اس مہینے کی بابت احادیث میں کوئی فضیلت وارد نہیں ہے، البتہ اسے ایک فضیلت یہ حاصل ہے کہ یہ چار حرمت والے مہینوں میں سے اور حج کے مہینوں میں سے ایک ہے۔

رسوم و بدعات

اس مہینے میں ہمارے ہاں کوئی بدعت رائج نہیں ہے۔

ذوالحجہ

وجہ تسمیہ

ذوالحجہ اسلامی سال کا بارھواں مہینہ ہے۔ ذوالحجہ کے معنی ہیں: حج والا مہینہ، اس مہینے کی 8 تاریخ سے 13 ذوالحجہ تک حج کے ارکان و مناسک ادا کیے جاتے ہیں، اس لیے اسے ذوالحجہ کہا جاتا ہے۔

فضائل

ماہِ ذوالحجہ میں حج ادا کیا جاتا ہے جو اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ حج کے ارکان و مناسک کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، دارالسلام کی مطبوعہ کتاب ''مسنون حج وعمرہ''۔

عید الاضحیٰ

اسی ذوالحجہ کی 10 تاریخ کو عید الاضحیٰ ہوتی ہے جو مسلمانوں کا دوسرا مذہبی تہوار ہے جس میں مسلمان کھلے میدان (عیدگاہ) میں دوگانہ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے حکم سے قربانیاں کرتے ہیں۔

عشرۂ ذوالحجہ کی فضیلت اور اس کے مسائل

افسوس ہے کہ ہم مسلمانوں میں وہ تصورات اور اعمال تو بہت جلد رائج اور مشہور ہوجاتے ہیں جو ایجاد بندہ قسم کے ہوتے ہیں اور جنھیں اصطلاح شریعت میں بدعات سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن جن تصورات و اعمال کی نشاندہی قرآن وحدیث میں کی

گئی ہے، ان کا مسلمانوں کو سرے سے علم ہی نہیں ہوتا، عمل تو بہت بعد کی بات ہے۔

جس طرح عشرۂ محرم کے سلسلے میں بدعی تصورات عوام کے ذہنوں میں راسخ ہیں، حالانکہ شریعت میں ان کی کوئی اصل نہیں۔ ایک برخود غلط مذہب کے پیروکاروں نے ان تصورات کو رائج کیا اور اپنے مخصوص عقائد و افکار کی اشاعت کے لیے ان ایام کو خاص کر کے کچھ اعمال و رسوم کو ان دنوں میں باعث ثواب گردانا۔ بدقسمتی سے اہل سنت کے جاہل عوام میں بھی یہ شیعی تصورات و اثرات نفوذ کر گئے اور ان میں ایک طبقہ عشرۂ محرم کے سلسلے میں شیعی و بدعی تصورات کا قائل اور عامل ہے، حالانکہ شریعت میں عشرۂ محرم کے سلسلے میں کچھ بیان نہیں کیا گیا، البتہ محرم کی دسویں تاریخ کا روزہ رکھنا حدیث سے ثابت ہے۔ علاوہ ازیں اس کے ساتھ 9 یا 11 محرم کا روزہ ملانا بھی مستحب ہے کیونکہ نبی ﷺ نے اس کی خواہش کی تھی۔ اسی طرح ماہ محرم میں نفلی روزوں کی بھی تاکید ہے۔

ذوالحجہ کے مہینے کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں اسلام کا ایک اہم رکن حج ادا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی ملی تقریب......عید قربان......بھی اسی مہینے کی 10 تاریخ کو منائی جاتی ہے۔ غالبًا اسی وجہ سے اس مہینے کے پہلے دس دنوں کی بہت فضیلت احادیث میں بیان کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے جن راتوں کی قسم سورۂ فجر میں کھائی ہے:

﴿ وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ ﴾

’’قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی۔‘‘[1]

جمہور مفسرین نے ان سے بھی ذوالحجہ کی دس راتیں مراد لی ہیں۔ جس سے ذوالحجہ کے پہلے دس دنوں کی فضیلت ہی کا اثبات ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کہ عوام ان ایام

[1] الفجر 89:1، 2.

فضیلت و شب ہائے سعادت سے بالعموم بے خبر ہیں۔

بہر حال احادیث نبوی میں عشرۂ ذوالحجہ کی جو فضیلت بیان کی گئی ہے، وہ حسب ذیل ہے، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق سے نوازے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

«مَا مِنْ أَيَّامٍ اَلْعَمَلُ الصَّالِحُ فِيهِنَّ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْأَيَّامِ الْعَشْرِ، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! وَلَا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: وَلَا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ إِلَّا رَجُلٌ خَرَجَ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فَلَمْ يَرْجِعْ مِنْ ذٰلِكَ بِشَيْءٍ»

”جتنا کوئی نیک عمل اللہ تعالیٰ کو ان دس دنوں (ذوالحجہ کے پہلے دس دنوں) میں پسند ہے، اتنا کسی دن میں پسند نہیں۔“ آپ سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں؟ آپ نے جواب دیا: ”ہاں، جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں، مگر کوئی شخص اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال کے ساتھ شہید ہی ہو جائے۔“ [1]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مِنْ أَيَّامٍ أَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَلَا أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنَ الْعَمَلِ فِيهِنَّ مِنْ هٰذِهِ الْأَيَّامِ الْعَشْرِ فَأَكْثِرُوا فِيهِنَّ مِنَ التَّهْلِيلِ وَالتَّكْبِيرِ وَالتَّحْمِيدِ»

”اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی عمل اتنا باعظمت اور محبوب نہیں، جتنا وہ عمل ہے جو ان دس دنوں میں کیا جائے۔ پس تم ان دنوں میں کثرت سے تہلیل، تکبیر اور تحمید کرو۔“ [2]

[1] سنن أبي داود، الصيام، باب في صوم العشر، حديث:2438، وجامع الترمذي، الصوم، باب ما جاء في العمل في أيام العشر، حديث: 757، واللفظ له. [2] مسند أحمد، بتحقيق أحمد شاكر مصري مرحوم:224/7، حديث:5446.

یعنی «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ» کا ورد کرو۔

عشرۂ ذوالحجہ میں کیے گئے عملوں کی فضیلت کی وجہ کیا ہے؟ اس کی بابت علماء نے مختلف توجیہات بیان کی ہیں، مثلاً: یہ کہ عشرۂ ذوالحجہ میں یوم نحر، یوم عرفہ اور یوم ترویہ آتا ہے، اس لیے یہ عشرہ سال کے تمام ایّام سے افضل ہے حتی کہ رمضان کے آخری عشرے سے بھی افضل ہے، تاہم رمضان کے آخری عشرے کی دس راتیں سال کی تمام راتوں میں افضل ہیں کیونکہ ان دس راتوں میں پانچ وہ طاق راتیں آتی ہیں جن میں سے کوئی ایک رات قدر والی ہوتی ہے جو ہزار مہینے کی راتوں سے زیادہ بہتر ہے، اس لیے رمضان کے عشرۂ اخیر کی راتیں افضل ترین اور عشرۂ ذوالحجہ کے دن تمام دنوں میں افضل ترین ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (تحفة الأحوذي، الصوم، باب ماجاء في العمل في أيام العشر: 58/2، طبع قديم، و زاد المعاد: 57/1، بتحقيق شعيب أرنؤوط، و فتح الباري، باب فضل العمل في أيام التشريق: 593/2، طبع دارالسلام) تاہم اس فضیلت کی اصل حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔ ہمیں تو اس فضیلت پر یقین رکھ کر ان دس دنوں میں زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کرنے چاہئیں کیونکہ یہ فضیلت صحیح احادیث میں بیان ہوئی ہے۔

یوم النحر کی فضیلت

دس ذوالحجہ کو یوم النحر (نَحْر 'قربانی' کا دن) کہا جاتا ہے۔ اس کی بھی خصوصی فضیلت احادیث میں بیان ہوئی ہے، مثلاً:

«إِنَّ أَعْظَمَ الْأَيَّامِ عِنْدَاللّٰهِ يَوْمُ النَّحْرِ ثُمَّ يَوْمُ الْقَرِّ»

"اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عظمت والا دن یوم النحر ہے، پھر یوم القرّ ہے۔"[1]

[1] سنن أبي داود، المناسك، باب: 19، حديث: 1765.

یوم القرّ سے مراد یوم النحر کے بعد والا دن (11 ذوالحجہ) ہے اس دن حجاج کرام منیٰ میں قرار پکڑتے ہیں، اس لیے اسے یوم القر کہا گیا ہے۔

ذوالحجہ کے ابتدائی نو دنوں کے روزے

نبی ﷺ ذوالحجہ کے پہلے نو دنوں کے روزے بھی رکھا کرتے تھے۔

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَصُومُ تِسْعَ ذِي الْحِجَّةِ، وَيَوْمَ عَاشُورَاءَ، وَثَلَاثَةَ أَيَّامٍ مِّنْ كُلِّ شَهْرٍ أَوَّلَ اثْنَيْنِ مِنَ الشَّهْرِ وَالْخَمِيسِ» [1]

یومِ عرفہ کی اور اس کے روزے کی فضیلت

ذوالحجہ کی 9 تاریخ کو یوم عرفہ کہا جاتا ہے۔اس دن حجاج کرام عرفات میں وقوف کرتے ہیں، یعنی صبح سے لے کر سورج غروب ہونے تک وہاں ٹھہرتے ہیں اوراللہ سے خوب دعائیں کرتے ہیں۔ یہ دن اہلِ عرفہ کے لیے بہت فضیلت والا اور اس کا وقوف حج کا سب سے بڑا رکن ہے، جس حاجی سے یہ وقوف عرفات رہ جائے تو اس کا حج ہی نامکمل ہے، اسے دوبارہ حج کرنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ عرفات میں موجود حاجیوں پر فرشتوں کے سامنے فخر فرماتا ہے اور فرشتوں سے کہتا ہے: دیکھو میرے یہ بندے دور دراز کا سفر کر کے پراگندہ بال، گردوغبار میں اٹے ہوئے آئے ہیں۔ [2]
علاوہ ازیں اس دن اللہ تعالیٰ جتنے زیادہ لوگوں کو جہنم کی آگ سے آزاد فرماتا ہے اتنا کسی اور دن نہیں فرماتا اور بندوں کے قریب ہوکر فرشتوں پر فخر فرماتا ہے اور کہتا ہے: یہ لوگ کس لیے آئے ہیں؟ [3]

[1] سنن أبي داود، الصيام، باب في صوم العشر، حديث: 2437. [2] مجمع الزوائد: 451/3، طبع قديم. [3] صحيح مسلم، الحج، باب فضل يوم عرفة، حديث: 1348.

اس دن وہاں حاجیوں کے لیے روزہ رکھنا غیر مستحب ہے کیونکہ نبی ﷺ سے ثابت نہیں۔ لیکن غیر حاجیوں کے لیے اس دن روزہ رکھنا نہ صرف جائز ہے بلکہ نہایت فضیلت والا عمل ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«صِيَامُ يَوْمِ عَرَفَةَ، أَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِي قَبْلَهٗ وَالسَّنَةَ الَّتِي بَعْدَهٗ»

''عرفہ کے دن روزہ رکھنے سے، مجھے اللہ سے امید ہے کہ وہ گزشتہ اور آئندہ (دوسالوں) کے گناہ معاف فرما دے گا۔'' [1]

نبی ﷺ کا یہ فرمان غیر حاجیوں کے لیے ہے کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں:

میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج کیا، آپ نے عرفہ کے دن روزہ نہیں رکھا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا، انھوں نے روزہ نہیں رکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا، انھوں نے روزہ نہیں رکھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا، انھوں نے بھی روزہ نہیں رکھا۔ اور میں بھی اس دن (عرفے میں) روزہ نہیں رکھتا اور نہ اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ اس سے روکتا ہوں۔ [2]

یوم عرفہ سے کون سا دن مراد ہے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یوم عرفہ سے مراد وہ دن ہے جب سعودی عرب میں 9 ذوالحجہ ہو۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ جب ہم عید الفطر، عید الاضحیٰ، رمضان کا آغاز سب

[1] صحيح مسلم، الصيام، باب استحباب ثلاثة أيام من كل شهر......، حديث: 1162. [2] جامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء في فضل الصوم يوم عرفة، حديث: 751.

اپنی رؤیت کی بنیاد پر کرتے ہیں تو پھر عرفہ سے مراد بھی ذوالحجہ کی وہی 9 تاریخ ہوگی جو ہماری رؤیت کی بنیاد پر ہوگی، قطع نظر اس کے کہ اس روز سعودی عرب میں یومِ عرفہ ہوگا یا نہیں ہوگا؟

عشرۂ ذوالحجہ میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل

مذکورہ احادیث پر عمل کرتے ہوئے صحابۂ کرام عشرۂ ذوالحجہ میں خوب ذوق وشوق سے اعمال صالحہ اور عبادات ونوافل کا اہتمام فرماتے تھے:

«كَانَ ابْنُ عُمَرَ وَأَبُوهُرَيْرَةَ يَخْرُجَانِ إِلَى السُّوقِ فِي الْأَيَّامِ الْعَشْرِ يُكَبِّرَانِ وَيُكَبِّرُ النَّاسُ بِتَكْبِيرِهِمَا»

''چنانچہ حضرت ابن عمر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کا یہ عمل تھا کہ وہ ان دس ایام میں بازار جاتے اور بلند آواز سے تکبیریں پڑھتے، انھیں دیکھ کر دوسرے لوگ بھی تکبیریں پڑھنا شروع کردیتے۔''[1]

«فَكَانَ سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ إِذَا دَخَلَ أَيَّامُ الْعَشْرِ اجْتَهَدَ اجْتِهَادًا شَدِيدًا حَتّٰى مَا يَكَادُ يُقْدَرُ عَلَيْهِ»

''حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے متعلق آتا ہے کہ وہ عشرۂ ذوالحجہ میں بسلسلۂ اعمال صالحہ خوب سعی وکوشش کرتے یہاں تک کہ قریب نہ ہوتا کہ اس پر قادر ہوا جائے۔''[2]

تکبیرات کا مسئلہ

صحیح بخاری کے مذکورہ اثر سے واضح ہے کہ عشرۂ ذوالحجہ میں جہاں نیکی کے دوسرے

[1] صحيح البخاري، العيدين، باب فضل العمل في أيام التشريق، قبل الحديث:969. [2] سنن الدارمي:1/357، تحت حديث:1781.

اعمال زیادہ ذوق وشوق اور زیادہ اہتمام سے کیے جائیں، وہاں تکبیرات کا بھی خوب اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں یہ معمول ہے کہ نو (9) ذوالحجہ کی نماز فجر سے تکبیرات کا آغاز کیا جاتا ہے اور پھر ہر فرض نماز کے بعد پڑھی جاتی ہیں اور یہ سلسلہ 13 ذوالحجہ کی نماز عصر تک چلتا ہے۔ اور یہ تکبیرات بایں الفاظ پڑھی جاتی ہیں:

«اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ»

یہ معمول اور الفاظ تکبیرات ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت ہیں۔ [1]

اسی طرح حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے ایک صحیح اثر سے بھی ثابت ہے کہ عرفے کی صبح سے ایام تشریق کے آخر تک تکبیرات پڑھی جائیں (فتح الباری) جبکہ ابن عمر اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کے عمل کے مطابق تکبیرات بھی ذوالحجہ کی پہلی تاریخ سے 13 ذوالحجہ کی عصر کے وقت تک پڑھی جائیں اور صرف نمازوں کے بعد ہی نہیں بلکہ دیگر اوقات میں بھی ان کا اہتمام کیا جائے۔

اسی طرح تکبیرات کے مذکورہ الفاظ بھی اگرچہ صحیح مرفوع حدیث سے ثابت نہیں لیکن حضرت عمر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے منقول اثر سے یہ ثابت ہیں، اس لیے یہ بھی پڑھے جاسکتے ہیں، البتہ حافظ ابن حجر نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے منقول الفاظ: «اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا» کو صحیح ترین قرار دیا ہے۔ [2]

مسنون اعمال

ذوالحجہ کے پہلے عشرے میں نیک اعمال نماز، صدقہ وخیرات، ذکر اذکار، روزوں

[1] دیکھیے: الإرواء: 125/3، حدیث: 654. [2] فتح الباري، العیدین، باب التکبیر أیام منی: 595/2، طبع دارالسلام، الریاض.

اور تلاوتِ قرآن کا خصوصی اہتمام کرنا۔ صاحب استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرنا۔ ذوالحجہ کی پہلی تاریخ سے 13 ذوالحجہ کی شام تک تکبیریں پڑھنا۔ یوم عرفہ، یعنی 9 ذوالحجہ کا نفلی روزہ رکھنا۔ 10 ذوالحجہ کو عیدالاضحیٰ کی نماز باہر کھلے میدان میں ادا کرنا اور پھر قربانی کرنا۔ عید کے دن غسل کر کے نئے یا دھلے ہوئے کپڑے پہننا اور خوشبو استعمال کرنا، نماز عید کے لیے گھر سے کچھ کھائے پیے بغیر تکبیریں پڑھتے ہوئے عید گاہ کی طرف جانا۔ عورتوں کو بھی عید گاہ میں لے جانا، نماز عیدالاضحیٰ طلوع شمس کے بعد جلدی ادا کرنا، مسلمان بھائی کو تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنْكُمْ کہہ کر مبارکباد دینا، عید گاہ سے واپسی پر راستہ تبدیل کرنا، قربانی کا گوشت خود بھی کھانا، رشتے داروں، دوستوں اور فقراء و مساکین کو بھی دینا۔ ایامِ تشریق (13,12,11 ذوالحجہ) میں کھانا پینا اور روزہ نہ رکھنا۔

قربانی کی نیت رکھنے والے کا عشرۂ ذوالحجہ میں حجامت وغیرہ نہ کروانا

نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا رَأَيْتُمْ هِلَالَ ذِي الْحِجَّةِ، وَأَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يُّضَحِّيَ فَلْيُمْسِكْ عَنْ شَعْرِهِ وَأَظْفَارِهِ»

”جب تم ذوالحجہ کا چاند دیکھ لو اور تم میں سے کوئی شخص قربانی کا ارادہ رکھے تو وہ اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔“[1]

اس حدیث سے اس بات کی تاکید معلوم ہوتی ہے کہ قربانی کی نیت رکھنے والے شخص کو ذوالحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد حجامت کروانے اور ناخن تراشنے سے اجتناب کرنا

[1] صحيح مسلم، الأضاحي، باب نهي من دخل عليه عشر ذي الحجة، وهو يريد التضحية أن يأخذ من شعره......، حديث: 1977.

چاہیے۔ دوسری روایت میں ہے: «حَتّٰى يُضَحِّيَ» ’’یہاں تک کہ وہ قربانی کرلے۔‘‘ [1]
یعنی قربانی کرنے کے بعد حجامت وغیرہ کروائے، اس سے پہلے نہیں۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے قربانی کی عدم استطاعت کا ذکر کیا تو آپ نے اس سے فرمایا: ’’تم دس (10) ذوالحجہ کو اپنے بال بنوا لینا، ناخن تراش لینا، مونچھیں کٹوا لینا اور زیر ناف کے بال صاف کرلینا، یہی عند اللہ تمھاری قربانی ہے۔‘‘ [2]

اس حدیث کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ عدم استطاعت والا شخص اگر عشرۂ ذوالحجہ میں حجامت وغیرہ نہ کروائے اور دس ذوالحجہ کو (عیدالاضحیٰ کے دن) حجامت وغیرہ کرلے تو اسے بھی قربانی کا ثواب مل جائے گا، اس حدیث کو اگرچہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے ضعیف ابوداود میں درج کیا ہے۔ لیکن دوسرے بعض محققین نے اس کو صحیح یا حسن قرار دیا ہے۔ [3]

ملحوظہ: قربانی کے احکام و مسائل کے لیے ملاحظہ ہو، ہمارا رسالہ ’’احکام ومسائل عیدالاضحیٰ۔‘‘

رسوم و بدعات

شب عید کو فضیلت والی سمجھ کر اس میں خصوصی عبادت کرنا۔ بلا عذر مسجد میں عید کی نماز ادا کرنا۔ نماز عید کے بعد معانقہ کرنے کو ضروری سمجھنا۔ اکٹھے مل کر تکبیرات پڑھنا۔ نماز عید سے پہلے قربانی کرنا اور رات کے وقت قربانی کرنے کو مکروہ سمجھنا۔ عیدالاضحیٰ اور ایام تشریق میں سے کسی دن کا روزہ رکھنا۔

[1] صحيح مسلم، الأضاحي، باب نهي من دخل عليه عشر ذي الحجة، وهو يريد التضحية أن يأخذ من شعره......، حديث: 1977. [2] سنن أبي داود، الضحايا، باب ماجاء في إيجاب الأضاحي، حديث: 2789. [3] الموسوعة الحديثية: 11/139-141، وسنن أبي داود مترجم: 3/258، مطبوعہ دارالسلام لاہور۔

عید "غدیر خم"

معز الدولہ احمد بن بویہ نے 18 ذوالحجہ 352ھ میں بغداد میں عید منانے کا حکم دیا خوب ڈھول بجائے گئے اور خوشیاں منائی گئیں۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی کتاب "البدایة والنهایة" میں 352ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں: 18 ذوالحجہ 352 ہجری کو معز الدولہ نے بغداد شہر کو مزین کرنے کا حکم دیا کہ رات کو بازار کھلے رکھے جائیں، شادیانے اور ڈھول وغیرہ بجائے جائیں اور امراء کے دروازوں پر چراغ روشن رکھے جائیں۔ یہ سارا کچھ ایک بہت ہی قبیح اور بری بدعت "عید غدیر خم" کی خوشی میں کیا گیا۔[1]

امام مقریزی فرماتے ہیں: عید غدیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے ثابت نہیں ہے، پہلی دفعہ عراق میں معز الدولہ علی بن بویہ کے دور حکومت میں 352 ہجری میں اسے شروع کیا گیا۔ تب سے شیعہ حضرات نے اسے عید کے طور پر منانا شروع کر دیا۔[2]

عید غدیر خم کا شمار ان بدعات میں ہوتا ہے جنھیں عبیدی امراء نے شروع کیا تھا۔ جو کہ بدعت پرور اور بدعت نواز تھے اور یہ عید انھوں نے آل بیت سے محبت کے دعوے کے تحت شروع کی کیونکہ وہ اپنے آپ کو اہل بیت میں سے ثابت کرتے تھے۔

عید غدیر کی اس بدعت کے لیے پہلے پہل خصوصی طور پر مجالس وغیرہ کا اہتمام مصر میں 18 ذوالحجہ 362 ہجری میں کیا گیا۔[3]

[1] البدایة والنهایة: 272/11. [2] الخطط والآثار للمقریزي: 388/1. [3] الخطط والآثار: 389/1.

عید ''غدیر خم'' کا حکم

18 ذوالحجہ کے دن کو عید منانا، محفلیں لگانا، اس دن کے آنے کی خوشیاں منانا اور اس میں ثواب سمجھ کر غلاموں کو آزاد کرنا اور جانور ذبح کرنا بلا ریب بدعت اور باطل ہے اور جس چیز پر اس کی بنیاد ہے وہ بھی بلاشک باطل ہے۔ اس کی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ نبی ﷺ نے دس ہجری میں حجۃ الوداع سے واپسی کے موقع پر 18 ذوالحجہ کو ''غدیر خم'' کے مقام پر خطبہ دیا تھا جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی وصیت کی تھی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس عید کی بدعت شروع کرنے والے اور اس دن کا اکرام واحترام کرنے والے شیعہ حضرات ہی تھے، وہ اس عید کو عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ سے زیادہ مقام دیتے ہیں اور اسے ''عید اکبر'' (دونوں عیدوں سے بڑی عید) کہتے ہیں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اوقات کے لحاظ سے بدعات پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: دوسری قسم ان میں سے ان بدعات کی ہے جو کسی واقعہ کے ساتھ خاص ہیں بایں طور پر کہ اس میں کوئی واقعہ پیش آیا ہو جس طرح باقی اوقات میں بھی واقعات پیش آتے ہیں لیکن انھیں یادگار کے طور پر جشن کا موقع بنانا جائز نہیں ہوتا اور نہ سلف ہی ایسے موقعوں پر پیش آنے والے ایسے واقعات کو جشن کے طور پر مناتے تھے، جیسے 18 ذوالحجہ ہے کہ اس میں نبی ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپسی پر ''غدیر خم'' کے مقام پر خطبہ دیا جس میں آپ ﷺ نے کتاب اللہ پر عمل کی وصیت کی اور اہل بیت کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی جیسا کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح مسلم (حدیث: 2408) میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ لیکن بعض خواہش پرستوں نے اس اصل

نص میں اپنی طرف سے اضافے کر لیے اور انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس میں نبی ﷺ نے واضح نص کے ذریعے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا عہد دیا تھا۔ اس طرح کہ آپ نے ان کے لیے سپیشل مسند بچھائی اور انھیں اعلیٰ قسم کی مسند پر بٹھایا، اضافہ کرنے والوں نے اس میں ایسی باتیں اور اعمال ذکر کیے ہیں کہ جن کا ہونا قطعاً ثابت نہیں ہے۔ اور انھوں نے یہ بھی گمان کر لیا کہ صحابہ اس نص کو چھپانے پر متفق ہو گئے اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے وصی کا حق غصب کر لیا۔ اس طرح چند صحابہ کے علاوہ انھوں نے سب صحابہ کو کافر و فاسق قرار دے دیا۔ حالانکہ بنی آدم کی فطرت کے لحاظ سے اور پھر صحابۂ کرام کی دیانت و امانت کے لحاظ سے اور شریعت نے جس حق بیانی کو ان پر واجب کیا تھا، اس سے یقینی طور پر یہ پتا چلتا ہے کہ اس طرح کی نصوص کو چھپانا (جو کھلے عام بیان ہوئے ہوں) ناممکن ہے۔ لیکن یہاں مسئلہ امامت کے اثبات یا نفی کا نہیں، یہاں مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ اس دن کو عید بنا لینا بالکل بدعت ہے جس کی کوئی اصل دین میں موجود نہیں ہے اور پھر اس میں کیے جانے والے اعمال بھی بدعات ہیں۔ جبکہ عیدیں تو شرعی احکام میں سے ہیں جن میں بدعات کی بجائے اتباع سنت واجب اور ضروری ہے۔

نبیٔ اکرم ﷺ کے تو مختلف دنوں میں کئی خطاب، عہد و پیمان اور واقعات موجود ہیں، جیسے بدر، حنین، خندق، فتح مکہ، ہجرت اور مدینہ میں داخلے کے وقت کے خطبات ہیں جن میں دین کے بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں لیکن ان دنوں میں عید منانا جائز نہیں ہے اور ایسے کام تو یہود و نصاریٰ کرتے ہیں جو حوادث و واقعات پر خوشی یا غمی منایا کرتے ہیں مسلمانوں کا تو یہ شیوہ ہی نہیں۔ [1]

[1] البدع الحولية، ص:377-380.

ذوالحجہ کے بعض اعمال کی فضیلت کے بارے میں موضوع احادیث

1 حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ذوالحجہ کے دس دنوں کے روزے رکھے اُسے ہر دن کے بدلے ایک مہینے کے روزوں کا ثواب ملے گا اور ترویہ (8 ذوالحجہ) کے دن کے روزے کے بدلے میں ایک سال کے روزوں کا ثواب ملے گا اور یوم عرفہ کے روزے کے بدلے میں دو سال کے روزوں کا ثواب ملے گا۔''[1]

2 حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ذوالحجہ کے مہینے کے آخری دن اور محرم کے پہلے دن کا روزہ رکھا تو اس نے گزشتہ سال کو روزے کی حالت میں ختم کیا اور آئندہ سال کو روزے کی حالت میں شروع کیا، لہٰذا اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس عمل کو پچاس سال کے لیے کفارہ بنا دے گا۔''[2]

3 حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے عرفہ کے دن ظہر اور عصر کے درمیان چار رکعات نماز ادا کی، ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور پچاس دفعہ سورۂ اخلاص پڑھی، اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک لاکھ نیکیاں لکھ دیتا ہے اور جنت میں ہر حرف کے بدلے اس کا درجہ بلند کر دیا جاتا ہے ......۔''[3]

4 حضرت عبداللہ بن مسعود اور علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے عرفہ کے دن دو رکعات نفلی نماز ادا کی، ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ

[1] یہ حدیث ضعیف اور موضوع ہے، دیکھیے: الموضوعات لابن الجوزي: 112/2. [2] یہ حدیث موضوع ہے، دیکھیے: الموضوعات لابن الجوزي: 112/2، واللآلي المصنوعة للسيوطي: 108/2. [3] یہ موضوع روایت ہے، دیکھیے: الموضوعات لابن الجوزي: 54/2، واللآلي المصنوعة للسيوطي: 61/2.

تین مرتبہ بسم اللہ سے شروع کر کے پڑھی ...... اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں تمھیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسے بخش دیا ہے۔''[1]

5 حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قربانی کی رات دو رکعتیں نفلی نماز پڑھی، ہر رکعت میں پچاس مرتبہ سورۂ فاتحہ، پندرہ مرتبہ سورۂ اخلاص، پندرہ مرتبہ سورۂ فلق اور پندرہ مرتبہ سورۂ ناس پڑھی اور سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ آیۃ الکرسی پڑھی اور پندرہ مرتبہ استغفار کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کا نام جنتیوں میں لکھ دیتا ہے اور اس کے ظاہری و باطنی گناہ معاف فرما دیتا ہے اور ہر آیت کے بدلے ایک حج اور عمرے کا ثواب لکھا جاتا ہے اور گویا اس نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ساٹھ غلام آزاد کر دیے اور اگر وہ آئندہ جمعے تک فوت ہو گیا تو شہداء کی موت مرا۔''[2]

6 حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: آپ نے فرمایا: ''عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ حاجیوں کو معاف فرما دیتا ہے اور مزدلفہ کے دن تاجروں کو معاف فرما دیتا ہے ......۔''[3]

ان کے علاوہ اور بھی کئی موضوع احادیث ہیں جنھیں ذوالحجہ کی فضیلت کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔

[1] یہ حدیث موضوع ہے، دیکھیے: الموضوعات لابن الجوزي: 55/2. [2] یہ حدیث موضوع اور من گھڑت ہے، دیکھیے: الموضوعات لابن الجوزي: 55/2، واللآلي المصنوعة: 63,62/2. [3] یہ حدیث موضوع اور من گھڑت ہے، دیکھیے: الموضوعات لابن الجوزي: 126/2، واللآلي المصنوعة للسيوطي: 121/2-124.

مسئلہ رؤیتِ ہلال اور 12 اسلامی مہینے

ہمارے پروردگار نے اپنی قدرتِ کاملہ سے عالم موجودات تخلیق کیا اور زمان و مکان پیدا فرمائے۔ اُس بے نیازِ مطلق کو تو تقسیمِ زمانی کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ علاّم الغیوب ہے۔ اس کے لیے نہ کوئی ماضی ہے، نہ حال، نہ مستقبل۔ اُس کے لیے وقت کی کوئی تحدید نہیں۔ وہ ازل ہی سے زمانے اور زندگی کے ایک ایک گریز پا لمحے پر نگرانی کی نگاہ رکھتا ہے۔ کسی عہد کی کوئی چیز اس سے اوجھل نہیں، البتہ ماہ و سال کی گردشیں انقلاب لاتی ہیں اور انسانوں پر اثر انداز ہوتی ہیں، اس لیے انسانوں کے لیے تقسیمِ زمانی ضروری تھی۔ ہمارے پروردگار نے بڑا کرم کیا ہماری آسانی اور راحت رسانی کے لیے زمانے کو بارہ مہینوں میں تقسیم فرما دیا اور ان میں سے چار مہینوں محرم، رجب، ذوالقعد اور ذوالحج کو حرمت کے مہینے قرار دیا۔ محسن انسانیت حضرت محمد ﷺ نے بعض مخصوص مہینوں کے لیے کچھ اعمال اور ان کے عظیم فضائل و برکات بیان فرمائے۔

یہ کتاب انھی اعمالِ عظیمہ کی تشریح ہے علاوہ ازیں اس میں اُن رسوم و بدعات کی مدلل تردید کی گئی ہے جو مختلف مہینوں اور مخصوص دنوں میں بڑی دھوم دھام سے انجام دی جاتی ہیں۔ اسے پڑھیے اور بدعت کی ظلمتوں میں تعلیماتِ نبوی پر عمل کے چراغ روشن کیجیے۔

ISBN 969574208-4
9789695742082